نوائے ادب

ششماہی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲۔ دادابھائی نوروجی روڈ

بمبئی ۱

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے ملحق)

اغراض و مقاصد

۱ ایم اے کی تعلیم کا انتظام کرنا
۲ پی ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کی ترتیب دینا
٦ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی وتحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ اردو کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

نوائے ادب بمبئی

خصوصیات

۱ اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر تبصرے

●

ترسیل مضامین و خط و کتابت کا پتہ

ڈاکٹر این ایس گوریکر

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲. دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۰۰۱ ۴۰۰

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر
نظام الدین ایس گوریکر

معاون
فرید شیخ

جلد۲۹ ٭ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۷۹ء

مندرجات

انجمن اسلام کی مجلس عاملہ

صدر -

جناب معین الدین حارث

●

نائب صدر
جناب مصطفیٰ فقیہ

نائب صدر
محترمہ ہمائے پیر بھائی

نائب صدر
جناب عزیز احمد بھائی

جنرل سکریٹری
جناب عبدالمجید پالکا

خازن اعزازی
جناب عبداللہ فقیہ

●

اراکین

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا
(چیرمن: سیکنڈری بوائز بورڈ)

ڈاکٹر عبدالکریم نائیک
(چیرمن: سوشیل ویلفر بورڈ)

جناب مامون لقمانی
(چیرمن: ہائر ایجوکیشن بورڈ)

محترمہ زلیخا مرچنٹ
(چیرمن: سیکنڈری گرلز بورڈ)

جناب فیض جسدن والا
(چیرمن: ٹیکنکل ایجوکیشن بورڈ)

جناب عبدالستار عمر
(چیرمن: پرائمری و ریھو بورڈ)

جناب عبدالقادر حافظکا

محترمہ زرینہ کریم بھائی

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
(چیرمن: کلچرل و جنرل بورڈ)

● ● ●

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسٹاف

ڈائرکٹر: این ایس گوریکر ایم. اے، پی. ایچ. ڈی، ڈی لٹ

ریسرچ افسر: فرید شیخ ایم اے، پی. ایچ. ڈی

لائبریرین: ندیم نعمانی ایم. اے، بی. ایڈ، سی لب سائنس

○ ڈاکٹر عابد پیشاوری

نسخۂ خوش خط و بسیار غلط

(۲)

تحقیق کی زبان کے متعلق مختلف علماء کی مختلف رائیں ہیں۔ کچھ انتہائی خشک اور فارمولوں کی اشاری زبان کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک ہر قسم کی عبارت آرائی اور خوش بیانی ممنوع ہے۔ لیکن کچھ اس فن خشک کی خشکی کو بیان کی شگفتگی سے گوارا بنا دینے کے حق میں ہیں۔ بعض لوگ محض عبارت آرائی اور رنگینیٔ بیان کے قائل ہیں خواہ اس سے تحقیقی مقاصد پس پشت ہی کیوں نہ جا پڑیں۔ اصولاً تحقیق میں ہر قسم کی انتہا پسندی سے بچنا چاہیے۔ اس کی زبان نہ اس قدر علمی ہو کہ عبارت چیستان ہوجائے اور نہ اس قدر رنگین و مرصع کہ تحقیق رنگینی میں تحلیل ہوجائے۔ تحقیق صرف علم ہی نہیں ادب بھی ہے اور ادب کی ہر صنف کی طرح اس کے بھی ادبی تقاضے ہیں۔ تحقیق کی زبان کا سلیس اور رواں دواں ہونا ضروری ہے تاکہ جو لوگ محقق نہیں ہیں وہ بھی اسے دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ قارئین اردو میں تحقیق بیزاری کا سبب زبان و بیان کی ناہمواری اور ادبیت دشمنی بھی ہے۔ حقائق کا بیان بےکم و کاست ہونا چاہیے ان میں بےضرورت آراستگی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو راہ دے سکتی ہے۔ لیکن بیانیہ نثر میں ادبیت کی چاشنی، متناسب رنگینی اور شگفتگی نہ صرف تحقیقی تصنیف کو حسن بخشتی ہے بلکہ اس کا حلقۂ قارئین وسیع کرنے میں بھی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ چناں چہ تحقیقی مضامین میں مناسب، موزوں اور منتخب الفاظ کا استعمال بہت ضروری ہے۔ یوں بھی الفاظ کا بےمحل صرف عبارت کو مہمل بنا دیتا ہے۔ تحقیق میں شاہ خرچی یا مسرفی کی گنجایش نہیں الفاظ کے اصراف میں کفایت شعاری بنیادی شرط ہے لیکن کفایت شعاری کا مطلب بخل ہرگز نہیں۔ اگر ضرورت سے کم الفاظ استعمال کیے جائیں تو بھی عبارت میں ابہام بلکہ

○ ڈاکٹر عابد پیشاوری، ریڈر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)

ابہام پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے صرف اسی قدر الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جن سے بات بغیر کسی اشکال یا الجھاو کے سمجھ میں آجائے۔ اس سے زیادہ فضول خرچی ہے اور یہ کوئی اچھی عادات نہیں۔ اس تمہید کے بعد اب زیر گفتگو تصنیف کے مقدمے کی زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

آئیے بات کو حرف آغاز سے شروع کریں (مرتب نے حرف آغاز میں صفحات کے نمبر شمار کا التزام نہیں کیا نمبر میرے دیے ہوئے ہیں۔)

« یہ بہ ظاہر انتخاب ہے لیکن کلام کا ایک مناسب حصہ شامل ہے۔ »
یہ بخل کی مثال ہے «لیکن» کے بعد «اس میں» کے بغیر جملہ بے ربط رہتا ہے۔ اس کے علاوہ «مناسب» کا لفظ مناسب نہیں یہ معتدبہ یا خاصا کا مقام تھا

> «... ۱۱۴۲ھ تک کے کلام کا انتخاب خواہ اس مخطوطہ (مخطوطے) میں موجود ہو یا دیوان زادہ میں اسے بھی شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا تاکہ قدیم دیوان کا انتخاب مستند و معیاری ہوسکے۔» (ص ۲)

اس جملے میں کئی قباحتیں ہیں۔ مرتب نے ۱۱۴۲ھ تک کا کلام دیوان میں شامل کرنا چاہا ہے بلکہ کیا ہے کیوں کہ حاتم نے پہلا دیوان اس سنہ میں مرتب کیا تھا اس لیے «۱۱۴۲ھ تک کے کلام» کا مطلب مرتب کے مدعا کے برعکس ہے۔ یہاں «۱۱۴۲ھ کے بعد» کہنا تھا۔ «شامل کرنا» سے پہلے اس دیوان یا کتاب یا مجموعے کی ضرورت تھی۔ «مستند» کو کسی حد تک گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن «معیاری» نہ صرف بے ضرورت ہے بلکہ غلط بھی ہے۔ اس کے علاوہ «اس مخطوطے میں ہو یا دیوان زادہ میں»۔ «موجود» کا لفظ بے ضرورت ہے۔

> «تقریباً پچاس ایسی غزلیں بھی اس بنیادی متن میں شامل ہیں جن کی تاریخ تخلیق پر قطعیت سے گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ زبان و بیان اور مخطوطہ (مخطوطے) کی قدامت وغیرہ دیکھ کر انہیں متن میں شامل کیا گیا ہے۔ اس پر اختلاف و اقرار کی گنجایش ہوسکتی ہے۔» (ص ۲-۳)

مرتب کی مراد کسی مخطوطے کی قدامت سے ہے؟ کیا یہ پچاس غزلیں کسی دوسرے مخطوطے میں ہیں؟ «قدامت» تو ٹھیک لیکن «وغیرہ» کیا ہے؟ «اختلاف کی گنجائش» درست لیکن «اقرار» کی کیا ضرورت ہے؟

« ... یہ حصہ کلام ۱۱۵۹ھ میں ترتیب نو سے آراستہ ہوا ۔
حاتم نے متن میں تبدیلی و تحریف کی ۔» (ص ۳)

خود مصنف صرف تبدیلی کرتا ہے ، تحریف نہیں۔

« تاکہ قارئین کے سامنے ۱۱۴۲ھ کا کلام پیش نظر رہے » (ص ۳)

سامنے رہے یا پیش نظر ؟

« متن کی املائی اور صوتی صورتوں کو برقرار رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے »(ص ۳)

« املائی صورتیں » تو خیر ہوئیں ، یہ « صوتی صورتیں » کیا ہوتی ہیں ؟ اس کے علاوہ انھیں برقرار رکھنے کا عام اہتمام بھی نہیں کیا گیا پھر اسے « خاص » کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

« اس سے زیادہ اہم دستاویز ابھی تک حاصل نہیں ہوسکا ہے ۔» (ص ۳)

ہمارے دور میں دستاویز کو مونث بولا جاتا ہے ۔ « زیادہ » بےضرورت ہے صرف « اہم » کافی تھا « ہے » کی بھی ضرورت نہیں ۔

« اردو زبان کی ارتقائی تاریخ اور بدلتے ہوئے ادبی شعور کی ترجمانی انھیں ناگزیر انفرادیت حاصل ہے ۔» (ص ۴)

« تاریخ کے ارتقا » یا « ارتقائی تاریخ ؟ » « ناگزیر انفرادیت » انفرادیت کی کونسی قسم ہے ؟ پھر یہ انفرادیت کے بجائے « اہمیت » کا مقام تھا ۔

« دیوان زادہ کا مقدمہ اردو زبان کی لسانی تاریخ کا سب سے اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اسے شاہ حاتم کے لسانی نقطہ ہائے (ہائے بدون ہمزہ) نظر کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے ۔ » (ص ۴)

اگر دستاویز کو مذکر فرض کرلیا جائے تو « تاریخ کے » ورنہ « کی » چاہیے ۔ « لسانی نقطہ ہائے نظر » مہمل کسی شخص کا زبان کے بارے میں نظریہ ہوسکتا ہے اس لیے یہاں « نظریہ زبان » یا « لسانی نقطۂ نظر » کافی تھا ۔ ویسے یہاں لسانی کی بجائے ادبی کا لفظ مناسب تھا ۔

« اس تاریخی اہمیت کے پیش نظر حاتم کے اس انتخاب و اشاعت پر پچھلے تین سالوں سے غور و خوض کرتا رہا ہوں ۔» (ص ۴)

« پیش نظر » کے بعد ضمیر متکلم « میں » کی ضرورت ہے ۔ « انتخاب » پر غور کرنا سمجھ میں آتا ہے ۔ « اشاعت » پر نہیں ۔ اگر اس امر پر غور کرتے رہے ہیں کہ اس انتخاب کو شائع کیا جائے یا نہیں تو « انتخاب کی اشاعت » لکھنا تھا ۔

«میرے لیے بے بضاعتی میں ان بکھرے ہوئے مواد تک رسائی ممکن نہ تھی» (ص۴)
«بے بضاعتی کے سبب» کے لیے «بے بضاعتی میں» کہنا مشکوک ہے «ان» کی جگہ «اس» چاہیے. مواد واحد ہے خواہ کتنا ہی بکھرا ہوا ہو.

دیوان کے صفحہ ۹ سے مرتب کا مقدمہ شروع ہوتا ہے. (آیندہ طوالت سے بچنے کے لیے صفحے کا نمبر شروع ہی میں درج کردیا جائے گا. جب ایک صفحے کا جائزہ ختم ہوجائے گا تو اگلے صفحے کا نمبر دے کر اس کے تحت پورے صفحے کے اندراجات کو پرکھا جائے گا) مقدمے کا پہلا ہی جملہ ہے.

ص ۹ «تاریخ ادب میں ناگزیر حیثیت رکھنے کے باوجود ننگ و ناموس سے محروم فن‌کاروں کی فہرست بنائی جائے تو غالباً شاہ حاتم اس میں سب سے زیادہ گم نام نظر آئیں گے»

مرتب کو «ناگزیر» سے خاص محبت معلوم ہوتی ہے. چناں‌چہ «ناگزیر اہمیت» «ناگزیر انفرادیت» «ناگزیر حیثیت» قسم کی تراکیب پورے مقدمے میں بار بار آئی ہیں. «ناگزیر حیثیت» کے معنی فی بطن المرتب ہوں تو ہوں، قاری اسے سمجھنے سے قاصر ہے. «ننگ و ناموس» کے معنی نام یا شہرت کے نہیں. «اس میں» کی کوئی ضرورت نہیں.

«ابھی تک ان کے تخلیقی اکتسابات پر خاطرخواہ توجہ نہیں کی گئی.»
«تخلیقی اکتسابات» سے کیا مراد ہے؟

«ان کی شاعری کو نظرانداز کرکے تاریخ ادب کی کوئی کوشش مستحسن قرار نہیں دی جاسکتی» «تاریخ ادب کی کوشش» سے مطلب؟

«وہ ادبی میراث کا ایک اہم جز اور سلسلۂ تاریخ میں دور ساز شخصیت» کے امین ہیں»
«دور ساز شخصیت» ہیں یا «امین» ؟

«انھوں نے دامن ادب کو رنگا رنگ بیش بہا ذخیروں سے گراں بار کردیا.» ذخیرہ خود ہی لاتعداد چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے. یہاں «ذخیروں» کا لفظ مناسب نہیں. پھر «رنگا رنگ» اور «بیش بہا» دو دو صفتوں کی کیا ضرورت تھی؟ «رنگا رنگ ذخیرہ» یوں بھی مہمل ہے. اس کے علاوہ «گراں بار» اور گراں مایہ یا گراں بہا میں بہت فرق ہے.

«انھوں نے اردو شاعری میں اپنا نام و نسب منوا لیا»
نام منوا لیا یا نسب؟ کسی مصنف کے لیے زبانہ کے ساتھ ساتھ بیان پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے، جو مرتب نے نہیں کیا. چناں‌چہ اس کی طرف بھی اشارہ

کرنا ضروری ہے۔ شروع میں حاتم کو « ننگ و ناموس » سے محروم کہا ہے۔ اب ان کے « نام و نسب » منوا لینے کے مدعی ہیں، دونوں میں کونسا بیان درست ہے ؟

« سودا جیسے ہونہار شاگرد کی تربیت کر کے ادب کو اوجِ ثریا تک پہنچانے میں مدد کی۔ »

ادب کو « اوج ثریا » تک کیسے پہنچایا جاتا ہے ؟

« سودا کی عظمت کے سامنے کتنے فن کار نگوں سار ہیں۔ »

فن کار و نگوں سار کے ہم قافیہ ہونے کے علاوہ اس جملے میں حقیقت کتنی ہے ؟ دو چار نگوں ساروں کا نام بھی لینا تھا۔ « کتنے » کے بعد « ہی » کی ضرورت ہے۔

« انہوں نے اردو شاعری کے صحیح مزاج کی پرورش میں بڑے ناز اٹھائے۔ »

کس کے ناز اٹھائے ؟ جملے کے ابہام سے قطع نظر دعوا بےدلیل ہے۔

« وہ نہ صرف ادب کے مزاج شناس ہی نہیں بلکہ ادب کو آگہی و بصیرت بھی دی ہے »

جملہ بےربط ہے۔ « بلکہ » کے بعد « انہوں نے » کی ضرورت تھی۔ ادب کو آگہی و بصیرت کس طرح دی ہے ؟ اس کی وضاحت ضروری تھی۔

ص ۹ - ۱۰ « فرد اور سماج کی فکری و تہذیبی تاریخ کا جو انتہائی عبرت ناک اور دل دوز ذکر شاہ حاتم کے ہاں ملتا ہے وہ معاصرین کے ہاں نظر نہیں آتا۔ »

فرد سماج ہی کا جُز ہوتا ہے۔ سماج کی تاریخ کا مطلب سماج ہی کی تاریخ ہوتا ہے اکیلے فرد کی داستان ہوسکتی ہے تاریخ نہیں۔ « عبرت ناک » اور « دل دوز » ذکر کی دو چار مثالیں بھی دینا تھیں۔ معاصرین کے ہاں « دل دوزی » کو مفقود کہتے وقت مرتب کے ذہن سے غالباً میر کے اشعار محو ہوگئے تھے۔

ص ۱۰ « شاہ حاتم سماجی شعور کا بہت گہرا احساس رکھتے تھے »

« شعور » رکھتے تھے یا « احساس » ؟ غالباً کچھ نہیں۔

ان کی دل نواز شخصیت بہت سادہ، پرخلوص اور پہلو دار تھی اور گفتگو و عمل کی ہم آہنگی نے اسلوب زندگی میں بڑی دل کشی پیدا کردی ہے »

اگر شخصیت سادہ ہے تو پہلودار نہیں ہوسکتی۔ دوسرا جملہ بے ربط ہے۔ ہم آہنگی نے کس کے اسلوبِ زندگی میں دل کشی پیدا کردی تھی ؟ علاوہ ازیں زندگی میں دل کشی پیدا کی یا اسلوب میں ؟

«کردار و گفتار کے اعتبار سے شمالی ہند میں صوفیانہ شاعری کی روایت انہیں سے شروع ہوتی ہے۔»
«کردار و گفتار کے اعتبار سے» بےضرورت ہے

«وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ قادر الکلام شاعر ہیں۔»
گزشتہ صفحات میں ضمناً شاہ حاتم کے کلام کی خامیوں کی طرف بھی اشارے ہوتے ہیں قارئین انہیں پیش نظر رکھیں اور مرتب کا یہ دعوا بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مرتب نے بہ یک جنبش قلم مظہر، آبرو، سودا، میر، سب کی قادرالکلامی پر پانی پھیر دیا ہے۔

«یہ بات کہ دیوان ولی کی آمد سے شمالی ہندوستان میں شاعری کا آغاز ہوا اتنی بار دہرائی جاتی رہی ہے کہ یہ مفروضہ ایک بڑی حقیقت بن گیا ہے۔ شاہ حاتم کا دیوان اس مفروضہ (مفروضے) کو غلط ثابت کرتا ہے۔ گویا دیوان ولی کی آمد سے پہلے شمالی ہند میں باقاعدہ شاعری شروع ہوچکی تھی»

اتنی بار دہرائی گئی ہے نہ کہ «دہرائی جاتی رہی ہے۔» صرف «حقیقت» ہی کافی تھا «بڑی» کی کوئی ضرورت نہیں تھی شاہ حاتم کا کلام اس مفروضے کو کیسے غلط ثابت کرتا ہے اس کا کوئی ثبوت نہ اس پورے دیوان میں کہیں ملتا ہے اور نہ مرتب نے بہم پہنچایا ہے ہوسکتا ہے کہ ولی کے دیوان کی آمد سے پہلے شمالی ہند میں باقاعدہ شاعری شروع ہوگئی ہو لیکن ولی کی آمد سے پہلے نہیں جب ولی خود شمالی ہند میں آکر لوگوں کو اپنا کلام سنا گئے تھے اس وقت کو مرتب کیوں نظرانداز کرتا ہے؟

«ہر غــزل کی تخلیق کے سنہ و سال قلم بند کیے ہیں جس سے ستر سال کی ادبی تاریخ کے مختلف موڑ اور رجحان کی نشاندہی کی جاسکتی ہے»

«سنہ» یا «سال» ورنہ لوگ اسے «سن و سال» سمجھیں گے۔ «موڑوں» کا حال تو مرتب کو بہتر معلوم ہوگا لیکن جملہ «رجحان» کی بجائے «رجحانات» کا متقاضی ہے۔

«معاصرین کی تقریباً ستاسی غزلوں کی زمین میں طرحی غزلیں کہیں ہیں۔»
کسی کی زمین میں غزل کہنے اور طرحی غزل میں فرق ہوتا ہے جب قطعی تعداد

لکھنا ممکن ہو تو «تقریباً» کہنا مناسب نہیں۔

جن سے ان شعرا کی تخلیقات کے ماہ و سال کا تعین کیا جاسکتا ہے۔»

حاتم نے صرف سنہ درج کیے ہیں اس لیے «ماہ» کا تعین ممکن نہیں۔

«ان اولیات اور گوناگوں اہمیت کے باوجود نظرانداز کیے جانے کے دو سبب دکھائی دیتے ہیں۔»

جملہ ادھورا بھی ہے اور غلط بھی۔

«ان کی ادبی قدروقیمت کا صحیح معیار و میزان قایم نہ کیا جاسکا۔»

«قدرو قیمت متعین نہ کی جاسکی» کو «قدر و قیمت کا صحیح معیار و میزان قایم نہ کیا جاسکا» کہنا کہاں تک درست ہے؟

«انھوں نے اپنے انفرادی اسلوب و آہنگ پر توجہ نہ دی اور معاصرین کی زمینوں میں غزل کہتے رہے۔
اسی طرح مصحفی اور امیر مینائی بھی بھٹکتے رہے۔»

معاصرین کی زمینوں میں «غزلیں» کہتے رہے نہ کہ «غزل» معاصرین کی زمینوں میں طبع آزمائی سے اپنا «اسلوب و آہنگ» گم نہیں ہوجاتا۔ کیا ولی سے لے کر غالب تک شعرا دوسروں کی زمینوں میں شعر نہیں کہتے رہے؟ مصحفی اور امیر مینائی کے متعلق مرتب کا بیان انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ مصحفی اور امیر دوسروں کی زمینوں میں نہیں رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے مصحفی ہر تیز رو کے ساتھ چلتے رہے لیکن امیر نے صرف داغ کی پیروی کرنا چاہی۔ اس کے باوجود داغ سے الگ بھی ان کا ایک انداز ہے۔

ص ۱۱ «اپنی انفرادیت کی اثر آفرینی قایم نہ رکھ سکے۔ حاتم نے بھی خطرہ مول لیا۔»

انفرادیت «قایم نہ رکھ سکے» یا اس کی «اثر آفرینی» کیسا خطرہ؟

«لیکن ایسا نہیں کہ ان طرحی زمینوں میں حاتم کا انفرادی رنگ و آہنگ دوسرے فن کاروں کی سایہ نشینی سے معدوم ہوگیا ہو۔»

مہمل جملہ ہے پہلے کہہ چکے ہیں کہ «انفرادی اسلوب پر توجہ نہ دی» «انفرادیت قایم نہ رکھ سکے» اور اب اس کے برعکس بیان دے رہے ہیں دونوں میں کونسا بیان صحیح ہے؟

«وہ خلوص نیت کے ساتھ طرحی زمینوں میں غزلیں کہتے رہے۔

رنگ اڑانے کی خاطر نہیں بلکہ خراج تحسین پیش کرنے اور دامن
ادب اور اظہار کے سانچوں کو وسیع تر ماننے کے لیے۔"

"طرحی زمینوں" میں شعر کہہ کر "خراج تحسین" پیش کرنا تو مانا جا سکتا ہے
لیکن اس سے اظہار کے "سانچے" کیوں کہ "وسیع تر بنتے" ہیں؟

"لگتا ہے کہ لوگوں نے ادب کو سنجیدگی سے نہیں برتا ہاں طبیعت
کی موزونی اور جذبہ و احساس کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھتے
رہے گویا دل گداز طبیعت کے اظہار کے لیے اور عمر عزیز کے
خوشگوار اوقات کو گذارنے (گزارنے) کے لیے شاعری کرتے رہے۔"

عجیب غیر ذمہ دارانہ بیان ہے اگر حاتم نے ادب کو سنجیدگی سے نہیں برتا تو
"سماجی شعور کا گہرا احساس" رکھنے کے کیا معنی ہیں سماج کی "فکری و تہذیبی
تاریخ کے عبرتناک اور دل دوز ذکر" کا کیا مطلب ہے؟ اس کے علاوہ۔ اول
تو "طبیعت کی دل گدازی" کیا، پھر اس "دل گدازی کے اظہار" کے کیا
معنی ہیں؟ "عمر عزیز کے خوشگوار اوقات کو گزارنے کے لیے" شاعری کرتے
رہے؟ یا تلخ اوقات کو خوشگوار بنانے کے لیے؟

"مختصراً حاتم کا کلام اپنے عہد کا وہ شفاف آئینہ ہے جس میں
ادب و معاشرہ کے افسانہ و افسوں کی بھرپور تصویر نظر آتی ہے"

جب تک زنگ آلود نہ کہا جائے آئینہ شفاف ہی ہوتا ہے (اصل میں آئینہ شفاف
نہیں صاف ہوتا ہے ورنہ آرپار دکھائی دے گا، صورت نظر نہیں آئے گی) اس
آئینے میں ادب کی تصویر نظر آتی ہے یا معاشرے کی؟ "افسانہ و افسوں کی تصویر"
مہمل ہے۔ "بھرپور" تصویر کوئی نہیں ہوتی "مکمل" البتہ کہہ سکتے ہیں ورنہ
صرف تصویر کے لفظ سے کام چل سکتا ہے۔

"شاہ حاتم کی آپ بیتی کے بارے میں ہماری معلومات کے دائرے محدود اور
مختصر ہیں۔"

"آپ بیتی" یا زندگی؟ معلومات محدود ہیں یا "معلومات کے دائرے"، "مختصر"
بے ضرورت ہے۔

"حاتم اس اور سماج کا اتنا گہرا شعور رکھنے کے باوجود اپنی
زندگی کے کوائف اور ان کے ذکر سے خاموش ہیں۔"

زندگی کے کوائف کا ذکر نہیں کرتے۔ "زندگی اور ان کے کوائف کے ذکر سے

خاموش ہیں۔» کہاں کی زبان ہے؟ زندگی واحد ہے پھر «ان کے کوائف» کس کے لیے ہے؟ اس سے اگلا ہی جملہ ہے:

«تخلیق کے ماہ و سال کا التزام رکھا لیکن زندگی کے نشیب و فراز کی سبق آموز کہانی قلم بند نہ کر سکے۔ اسلاف اپنے اجداد کی حکایت خوں چکاں تو لکھتے رہے، مگر اپنی کہانی قلم بند کرنے سے گریز کرتے رہے۔۔۔۔ معاصرین نے بھی عام رجحان کے مطابق زیادہ التفات نہیں کیا۔»

اول تو یہ جملے ماسبق عبارت سے مربوط نہیں، دوسرے حاتم نے تخلیق کا سال لکھنے کا التزام کیا ہے «ماہ کا نہیں۔» (التزام رکھنا غلط ہے۔) یہ کیا ضرور ہے کہ زندگی کی کہانی سبق آموز ہی ہو؟ «نشیب و فراز» کا مرتب کے پاس کیا ثبوت ہے؟

«حکایت خوں چکاں» محل نظر ہے۔ «معاصرین» نے «زیادہ» نہیں تو کیا کم التفات کیا ہے؟ پھر التفات کس سے یا کس پر؟

ص ۱۱ - ۱۲ «حد تو یہ ہے کہ شاہ حاتم کے شاگرد سعادت یار خاں نے مجالس رنگیں میں حیات حاتم کے نمایاں خد و خال کا ذکر نہیں کیا جس سے ان کی شخصیت کے نقوش ابھر سکتے۔»

کیا رنگین نے مجالس رنگیں میں حاتم کے سوانح لکھے ہیں؟ اگر رنگین نے حیات حاتم کے نمایاں حد و خال کا ذکر نہیں کیا تو کیا کسی اور کے «خد و خال» کا ذکر کیا ہے؟ «تصویر کے نقوش» ابھر سکتے یا «شخصیت» کے؟ پھر رنگین پر یہ اتہام بھی غلط ہے کیوں کہ خود اسی ایک واقعے سے شاہ حاتم کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ جسے مرتب نے رنگین کے حوالے سے اپنے مقدمے کے صفحہ ۲۷ پر ادھورا نقل کیا ہے۔

ص ۱۲ «بیشتر تذکرہ نگاروں نے نام بھی غلط لکھے ہیں۔»

لکھا ہے کہ «لکھے ہیں۔» کیا شاہ حاتم کے کئی نام تھے؟

«معاصر و مستند حوالوں کے باوجود محمد حاتم لکھا جانا حیرت انگیز ہے۔»

صرف ایک ہی حوالہ ہے، مصحفی کا اس لیے «حوالوں» غلط ہے۔ صرف «معاصر حوالہ» ہی کافی تھا۔ «مستند» فضول خرچی ہے۔ مصحفی و میر دونوں معاصر ہیں۔ مصحفی کو مستند اور میر کو غیر مستند قرار دینے کا کوئی جواز نہیں۔ پھر مصحفی کا تذکرہ میر سے کم از کم ۲۵ برس بعد لکھا گیا۔

« اس ضمن میں مصحفی کا سب سے زیادہ معتبر بیان ہے »

بہ صورت موجودہ جملہ ناقص ہے۔ « مصحفی کا بیان سب سے زیادہ معتبر ہے » چاہیے۔

ص ۱۳ « عبدالغفور نساخ وغیرہ نے ظہور الدین لکھا ہے اور یہی صحیح بھی ہے »

« نساخ وغیرہ » نے نہیں بلکہ صرف نساخ نے لکھا ہے اور یہ صحیح بھی نہیں ہے۔ صحیح شیخ ظہور الدین ہے جیسا کہ عیار الشعراء، عقد ثریا اور تذکرۂ ہندی میں ہے۔

« وہ ۱۱۱۱ ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۷ ھ میں سرزمین شاہ جہاں آباد میں سپرد خاک بھی ہوئے »

« سرزمین » اور « بھی » دونوں زائد ہیں اگر زور دینا ہی مقصود تھا تو شاہ جہاں آباد کے بعد « ہی » کا اضافہ کرنا تھا۔ بلکہ « دہلی ہی میں » کہنا تھا موجودہ صورت میں تو دہلی اور شاہ جہاں آباد دو الگ الگ شہر معلوم ہوتے ہیں۔

« حاتم نے اپنی حیات و سرگذشت (گزشت) سے متعلق کلام میں جابجا اظہار خیال کیا ہے۔

« سرگزشت » بےضرورت ہے۔ صرف « حیات » کافی تھا۔ « اظہارِ خیال » کرنے کے معنی « ذکر کرنے » کے نہیں ہوتے اس کے علاوہ مرتب کو یہ یاد نہیں رہا کہ وہ حاتم پر اپنے حالاتِ زندگی کا ذکر نہ کرنے کا الزام لگا چکے ہیں۔

« حاتم سپاہی پیشہ تھے۔ ممکن ہے اُن کے والد بھی اسی معزز پیشہ سے متعلق رہے ہوں »

معزز کی صفت بےضرورت ہے۔

« سپہ گری کے آبائی پیشہ کو حاتم نے بھی کمال زندگی کا سبب قرار دیا ہے »

جب آبائی پیشہ طے ہی نہیں ہے تو آبائی پیشے کا کیا ذکر؟ « حاتم نے » نہ کہ « حاتم نے بھی »۔ کمال زندگی کا سبب قرار دینا غلط۔ مثال میں جو شعر پیش کیا گیا ملاحظہ ہو:

اے قدرداں کمال حاتم دیکھ عاشق و شاعر و سپاہی ہے

اس میں نہ آبائی پیشے کا ذکر ہے اور نہ کمالِ زندگی کے سبب کا۔

« . . . سیف قلم کی مہارت کو عزت و وقار کا معیار و منہاج تصور کیا جاتا تھا۔ »

« معیار » گوارا ہے، « منہاج » مسرفی ہے۔

« ریختہ میں شاعری اور رمزی تخلص کرتے تھے »

شاعری اور رمزی نہیں بلکہ رمزی تخلص کرتے تھے اور ریختہ میں شاعری... حالانکہ یہ بھی غلطی ہے۔ خود مرتب اُن کے فارسی دیوان کا ذکر کر چکا ہے۔

« لیکن ابھی تک اس تخلص کی کوئی اردو غزل دستیاب نہیں ہوسکی۔ »

تو کیا فارسی غزل دستیاب ہوتی ہے ؟

« زور مرحوم نے رمز لکھا ہے جو غلط ہے۔ »

مگر کیوں؟ جب اس تخلص کی کوئی غزل ہی دستیاب نہیں ہوتی تو یہ فیصلہ کیونکر ہو کہ وہ رمزی تخلص کرتے تھے یا رمز؟ رمزی کے مقابلے میں رمز بہتر معلوم ہوتا ہے تاہم بغیر ثبوت کے زور مرحوم کے قول کو ردکرنے کا کوئی جواز نہیں۔

« انھوں نے ۱۲۲۸ھ میں شاعری شروع کی »

۱۲۲۸ھ نہیں ۱۴۲۸ھ، لغزش قلم معلوم ہوتی ہے۔

ص ۱۵ « ۱۱۸۹ھ میں ایک تیسرا مقطع نظر سے گزرتا ہے »

۱۱۸۹ھ میں تب تک کوئی مقطع نظر سے نہیں گزرسکتا جب تک راوی خود ۱۱۸۹ھ میں موجود نہ ہو۔

« دیوان زادہ کی نثری عبارت دو ٹوک اور صراحت سے بھرپور ہے۔ »

جب « دو ٹوک » کہہ دیا تھا تو « صراحت سے بھرپور » کی کیا ضرورت تھی؟

« بساط شعر پر ایک نو تخلیقی تحریک پیدا ہوئی جس سے دہلی کے در و دیوار شعر و سخن کی آواز بازگشت سے گونج اٹھے »

« تخلیقی تحریک » کیا؟ اور غیر تخلیقی تحریک کیا؟ « آواز بازگشت » سے کیوں صرف آواز سے کیوں نہیں؟ بلکہ صرف گونج اٹھے کیوں نہیں؟

ص ۱۶ « اُن کا (ڈاکٹر زور کا) خیال ہے کہ ولی کے گہرے اثرات کا ہی نتیجہ ہے کہ سب سے زیادہ ولی کی زمین میں غزلیں ملتی ہیں۔ انھوں نے ان غزلوں کی تعداد تیرہ بتائی ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ دیوان زادہ کے معلوم نسخوں کی روشنی میں ان کی تعداد گیارہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے سودا کی زمین میں زیادہ غزلیں ہیں جن کی تعداد بارہ ہے۔ »

« دیوان زادہ کے معلوم نسخوں میں » بہت بڑا دعوا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرتب نے خود اپنے مرتب کردہ دیوان کا مطالعہ بھی بغور نہیں کیا، ورنہ سودا کی طرحوں سے دگنی غزلیں اسی نسخے میں ولی کی طرحوں میں موجود ہیں۔

بانہر کنکن کو آرسی کیا ۔ گیارہ غزلیں خود مرتب نے تسلیم کی ہیں مزید ۱۲ غزلیں جو ولی کی زمینوں میں ہیں اور جن سے مرتب ناواقف ہے دیوان مذکور کے صفحات نمبر ۹۰ ، ۱۱۸ ، ۱۲۲ ، ۱۲۵ ، ۱۳۹ ، ۱۴۵ ، ۱۴۹ ، ۱۵۹ ، ۱۶۰ ، ۱۶۷ ، ۱۷۳ اور ۱۷۷ پر دیکھی جاسکتی ہیں ۔ ہم نے ان منظومات کو شمار نہیں کیا جو ولی کی تقلید میں ہیں ۔

ص ۱۷ « یہ بات طے شدہ ہے کہ ولی ۱۱۱۹ ھ میں رحلت کرچکے تھے ۔ اور ۱۱۱۹ ھ کے بعد ولی کے زندہ رہنے کا کوئی خارجی اور داخلی ثبوت نہیں ملتا ۔ »

نہ یہ بات طے شدہ ہے کہ ولی ۱۱۱۹ ھ میں انتقال کرچکے تھے اور نہ یہ درست ہے کہ اس تاریخ کے بعد « ان کے زندہ رہنے کا کوئی خارجی اور داخلی ثبوت نہیں ملتا » اس ضمن میں جمیل جالبی صاحب کا مضمون « تحریر » دہلی میں دیکھا جاسکتا ہے ۔ اُسے بھی چھوڑیے ، جمیل جالبی کی مصنفہ تاریخ ادب اردو ، ج ۱ ، کا جو ایڈیشن ہندوستان میں چھپا ہے اس کا برائے نام مقدمہ خود مرتب دیوان حاتم نے لکھا ہے ۔ اگر انھوں نے اس کے صفحات سرسری طور پر بھی الٹ پلٹ کر دیکھے ہوتے تو ان کو اس ضمن میں کئی داخلی اور خارجی شواہد مل جاتے ۔

ص ۱۸ « صرف حاتم پر ہی موقوف نہیں ، ولی کے اثر و نفوذ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔ »

جملہ مبہم ہے صرف « اثر » سے بات مکمل تھی ۔ « نفوذ » بے ضرورت ہے ۔ مرتب کو مرکبات و صفات استعمال کرنے کا حد سے زیادہ شوق ہے یہ جملہ دیکھیے : « انسانی فکر و فن کے تخلیقی اسلوب و ارتقا کا یہ کائناتی کلیہ ہے کہ ماضی کا سہارا لے کر چراغ سے چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں »

« انسانی فکر و فن » کے علاوہ کوئی « حیوانی فکر و فن » بھی ہوتا ہوگا ورنہ « انسانی » لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ؟ یہ تخلیقی « اسلوب و ارتقا » کیا چیز ہے ؟ اور « کائناتی کلیہ » کسے کہتے ہیں ؟ چراغ سے چراغ روشن کرنے کے لیے ماضی ہی کے سہارے کی ضرورت کیوں ؟ کیا حالیہ تجربات سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ؟ کہا جاسکتا ہے کہ وجود پذیر ہونے کے بعد ہر تجربہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے ، تو اُس صورت میں لفظ ماضی لکھنا کیا ضرور تھا ؟

« صرف طرحی زمینوں میں غزلوں کی موجودگی سے نتائج پر اکتفا کرلینا زیادہ موزوں طریق کار نہ ہوگا »

کن نتائج پر ؟ اگر زیادہ موزوں نہیں تو کم موزوں ہی سہی ، ہوگا تو ضرور .

ص ۱۹ « دیوان زادہ میں (گنتی کے دو چار کیے) عــلاوہ تقریباً تمام غزلیں زمین طرح میں ہیں .»

« دو چار » یا « گنتی کی »، دوہری تخصیص کی ضرورت نہیں. « گنتی کی » نہ کہ « گنتی کیے » کہ یہ الفاظ غزلوں کے لیے آئے ہیں . دو چار کی تعــداد درست نہیں . اس کے علاوہ « گنتی کے دوچار کیے » کو قوسین مــیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی ؟

« انھوں (ڈاکٹر زور) نے سعدی اور حزیں کی زمینوں کا بھی ذکر کیا ہے جب کہ ان کی طرحی زمینیں دستیاب نہیں ہوتیں » (ص ۱۸-۱۹)

جملہ غلط ہے . سعدی اور حزیں کی زمین میں کہی گئی غزلوں کا ایک ایک مصرع زور مرحوم نے سرگزشتِ حاتم میں درج کردیا ہے مرتب نے تلاش سے کام ہی نہیں لیا ورنہ یہ کچھ ایسی مشکل بات نہ تھی .

« اس کے برخلاف دوسرے شعرا . . کی غزلیں موجود ہیں جن سے ان زمینوں کی شہرت اور مقبولیت کے ساتھ ساتھ ان طرحی مشاعروں کے انعقاد کی تائید ہوتی ہے جو شہر میں ماہانہ اور پندرہ روزہ وقفے کے ساتھ بالاہتمام منعقد کی جاتیں »

مشاعرے منعقد « کی نہیں جاتیں » بلکہ « کیے جاتے ہیں » « بالاہتمام » کی صفت غیر ضروری ہے . کچھ زمینوں کی مقبولیت اپنی جگہ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ان سے طرحی مشاعروں کے انعقاد کی تصدیق بھی ہوتی ہو . کیا قدما کی وہ سب غزلیں جو فارسی شعرا کی زمینوں میں لکھی گئی ہیں وہ سب مشاعروں میں طرح ہوتی تھیں ؟

ص ۲۰ « حاتم نے . . اپنے پیشروؤں کا ذکر کیا ہے جن کے وہ معتقد رہے اور اکتسابِ فیض کرتے رہے .»

« حاتم کا کلام اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی اور اس کے پیچ و خم کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے »

اس بیــان کو ان بیــانات کے مقــابل رکھ کر دیکھیے جن میں مرتب نے حاتم پر اپنی زنـدگی کی سبق آموز کہانی بیان نہ کرنے یا اس کے « نشیب و فراز سے گریز کرتے رہنے » کا حرف رکھا ہے . « اظہار خیال کیا ہے » غلط ہے . « ذکر » یا « بیان » کا مقام تھا .

« جوانی کے دن سپاہی پیشہ میں گزرے . »
سپاہی پیشگی میں گزرے »

« قیاس یہ کہتا ہے کہ اس پیشے نے آزادی و طرحداری دی تھی جس کی
وجہ سے بانکپن بھی پیدا ہوا . »

« آزادی و طرح داری دی تھی » ، کس کو ؟ بانکپن بھی پیدا ہوا » ، کس میں ؟ ضمائر
کا ایسا حذف تو نظم میں بھی روا نہیں رکھا جاتا .

ص ۲۱ « علائق دنیا اور متعلقین کی کفالت سے بےفکر تھے »
جب متعلقین تھے ہی نہیں تو « کفالت سے بےفکری » کے کوئی معنی نہیں .

مزاج میں ایک جولانی دکھائی دیتی ہے جس میں استقامت و استقلال
کا جز بہت کم نظر آتا ہے »

جولانی میں استقامت و استقلال کا جز بہت کم دکھائی دیتا ہے یا مزاج میں؟ مرتب
کو ان معلومات کا ماخذ بھی بتانا تھا .

« شاعری اور نغمہ سنجی نے امرائے وقت (امراے وقت ،
بدون ہمزہ) کے حلقۂ مصاحبین میں قدر و منزلت سے سرفراز کیا .»

« نغمہ سنجی » سے کیا مراد ہے ؟ کیا حاتم موسیقار بھی تھے ؟ درباروں میں
قدرو منزلت ملی یا « حلقۂ مصاحبین » میں ؟

« وہ خوش پوش و خوش حال نظر آتے ہیں »

مرتب نے ان کی خوش پوشی خود نہیں دیکھی زبان کا یہ انداز افسانے کے لیے
موزوں ہوسکتا ہے تحقیق کے لیے نہیں تذکروں میں حاتم کی فقیر منشی کا ذکر ہے ،
مرتب کو اپنی معلومات کا ماخذ بھی بتانا تھا

ص ۲۲ « ظاہر ہے کہ ایسے ہنرمند اور باذوق سرپرست کی دل جوئی
نے حاتم کو خوش فکر بنا دیا ہوگا . خوب چند ذکا نے اس ماحول
سے ایک غلط نتیجہ اخذ کیا ہے :
در ایام نوکری نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر شراب و بنگ وغیرہ
بکثرت می نوشیدہ »

سرپرست کی « صحبت » نہ کہ « دل جوئی » ذکا نے کیوں کر غلط نتیجہ اخذ کیا ہے
مرتب کو اس کا ثبوت بہم پہنچانا تھا قاسم نے بھی لکھا ہے :
« ارتکاب منہیات بدرجۂ اعلیٰ نمود . »

مرتب کو اعتراف ہے کہ یہ باتیں قاسم نے اپنے استاد ہدایت اللہ خاں ہدایت سے سنی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہدایت حاتم کے معاصر ہیں۔ اس پر بھی انہیں اصرار ہے کہ:

« حاتم کی زندگی میں ارتکاب منہیات اور وہ بھی بدرجہ اعلیٰ کا پتہ نہیں ملتا۔ »

اگر معاصر شہادتوں کے باوجود پتہ نہیں « ملتا » تو کیا مرتب کو اس ضمن میں حاتم کے تحریری اور حلفی بیان کی توقع ہے؟ جب آپ کے پاس « معلومات کے ذرائع محدود اور مختصر » ہیں تو ذکا، قاسم، ہدایت، کریم الدین وغیرہ کے بیانات کو غلط ٹھہرانے کا جواز؟

ص ۲۳ « ... نواب امیر خان کو دہلی چھوڑنا پڑا »

چھوڑنا پڑی یا چھوڑنی پڑی نہ کہ « چھوڑنا پڑا »۔

« فاخر خاں کی ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ »

ملازم ہوگئے یا سرکار سے وابستہ ہوگئے یہ « ملازمت سے وابستہ ہوگئے » کیا ہوا؟

« حاتم کے مزاج کی افتادگی، آزادی اور قلندرانہ درویشی اس ذمہ داری کی مزید متحمل نہ ہو سکی۔ »

« افتادگی » یا افتاد؟ « قلندرانہ درویشی »؟ یا قلندری، درویشی

ص ۲۴ « وہ فقر و فاقہ کو مزاج میں شامل کرچکے تھے »

گویا یہ چیزیں اُن کے مزاج کا جز نہیں تھیں؟

« مطبخ کے کانِ نعمت کو زندانِ نعمت سمجھ رہے تھے۔ »

« کان » بھی مونث اور « نعمت » بھی۔ پھر « کے » کیوں « کی » کیوں نہیں؟

« نسخۂ لکھنؤ میں غالباً ۱۱۴۵ھ ہی درج ہے۔ »

جب آپ نے نسخۂ لکھنؤ دیکھا ہی نہیں تو اس کے اندراجات کو فرض کرلینا نامناسب ہے۔

ص ۲۵ « اس زمانے کی تخلیقات کا ایک وقیع حصہ نواب امیر خاں ہی سے متعلق ہے۔ »

کیا اُن تخلیقات میں نواب امیر خاں کی تعریف یا اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے؟ مثال میں جو نظمیں پیش کی گئی ہیں اُن سے اس امر کا ثبوت نہیں ملتا۔

« انشیٰ عرض داشت کی روشنی میں یہ بات غلط ثابت ہوجاتی ہے۔ »

عرض داشت پیش کرنے اور قبول ہونے میں فرق ہے ۔ مرتب کے پاس اس کے مسطور ہوجانے کا کوئی ثبوت نہیں ورنہ وہ ضرور پیش فرماتے ۔

ص ۲۶ « یہ شعر ۱۱۴۳ھ کا ہے ۔ اُن کے پاس جاتے اور رشد و ہدایت سے معمور ہوتے ۔ »

کون کس کے پاس جاتے ؟ رشد و ہدایت سے « معمور ہونا » بھی خوب ہے ۔

« یہ تعلق احترام و عقیدت کی بےپایانی میں تبدیل ہوکر ایک عرصہ (عرصے) تک باقی رہتا ہے »

« بے پایانی » کے بغیر بھی بات بن سکتی تھی ۔

« حسینِ نیاز اُن کے آستانے پر جھک گیا »

« جھک گئی » نہ کہ « جھک گیا » ۔

ص ۲۷ « انھیں بزرگوں کی ہم نشینی اور لطفِ صحبت نے حاتم کی شخصیت کو اس دور کا اہم ترین مرکزی نقطہ قرار دیا تھا ۔ »

الفاظ کا بےدریغ استعمال اس سے زیادہ کیا ہوگا ۔ بزرگوں نے نہیں اُن کی « ہم نشینی » نے « مرکزی نقطہ قرار دیا تھا » ؟ یا بنادیا تھا حاتم کو نہیں بلکہ اُن کی « شخصیت کو مرکزی نقطہ قرار دیا تھا » جب مرکزی نقطہ ہی کہہ دیا تو « اہم ترین » کی صفت کی کیا ضرورت تھی ۔ کیا « عہد اہم ترین مرکزی نقطہ » بھی ہوتا ہے ؟

« یہ فیضان اور تربیت دوسرے معاصرین کے یہاں نظر نہیں آتی »

مرتب کا مفہوم واضح نہیں ہے ۔

« انھوں نے اپنے اکتسابات سے اس عہد کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ صحیح سمت میں رہنمائی کی اور تربیت بھی کی »

جملہ بےربط ہے

« حاتم بارھویں صدی کی ادبی اور تہذیبی بساطِ زندگی پر ایک باوقار شخصیت رکھتے ہیں ۔ »

« تہذیبی بساط پر » ؟ یا « بساطِ زندگی پر » ؟

« اس شخصیت میں تہ داری و تنوع کے ساتھ بڑی دل کشی ہے ۔ یہ دل کشی اسلوبِ زندگی کے خوش گوار پہلوؤں کی وجہ سے زیادہ پرکشش دکھائی دیتی ہے ۔ یہ خوبیاں اُن کے خمیر میں شامل ہوکر انھیں اچھے انسان کے پُرشکوہ مقام پر ممتاز کرتی ہیں »

«دل کشی» کا «پر کشش» دکھائی دینا عجیب بات ہے۔ الفاظ کی بھیڑ میں معنی گم ہیں۔ آخر مرتب کہنا کیا چاہتا ہے۔

ص ۲۸-۲۹ «تذکرہ نگاروں نے حاتم کی تعریف و تحسین میں جس طرح اعتراف کا ثبوت دیا ہے وہ شاید کسی دوسرے فن کار کے ترجمے میں نظر نہیں آتا۔»

«اعتراف کا ثبوت» کیا ہوتا ہے۔ جب آپ نے سب تذکرے بالاستیعاب تو کیا سرسری طور سے بھی ملاحظہ نہیں فرمائے تو یہ دعوائے مشکوک کس لیے؟

ص ۴۹ «کہا جاتا ہے کہ «نکات الشعراء» کی تالیف کے بعد جب حاتم کو میر کے نخوت کا علم ہوا تو انھوں نے ۱۱۶۶ھ کی غزل کے اس شعر میں میر کو اس طرح مخاطب کیا:

تمہارے بھی ہو پاس ابھی جاتا رہا اوروں کے پاس آشنائی ہے وہ لڑکا گنجفہ کا پتہ ہے»

یہ کہنے والے کون ہیں؟ میر حاتم کے شاگرد تھے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ شعر میں پہلے اپنے پھر دوسروں کے پاس جانے کا ذکر ہے۔ میر کی تربیت خان آرزو نے کی تھی۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ میر حاتم کے شاگرد تھے تو حاتم کو چھوڑ کر وہ کس کے پاس گئے؟ مرتب کو یہ بھی بتانا تھا۔ تیس پینتیس برس کے آدمی کو لڑکا کہنا بھی عجیب ہے۔

«جب کہ معاصرین کا یہ شعار بن چکا تھا اور تہذیبی و سیاسی انحطاط کی وجہ سے امراء بھی دلچسپی لے رہے تھے۔»

کیا شعار بن چکا تھا اور امراء کس چیز میں دلچسپی لے رہے تھے؟

«اس کے برعکس حاتم نے ہجو نگاری سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔»

کس کو تلقین کی ہے؟ حاتم کا شاگرد رشید سب سے بڑا ہجو نگار مانا جاتا ہے اور حاتم کو اس کا احساس تھا ورنہ اسے «پہلوانِ سخن» کیوں کہتے۔

«لوگ ناجی کو باجی تخلص سے یاد کرنے لگے تھے۔»

لوگ ناجی کو باجی کے لقب، نام یا خطاب سے یاد کرنے لگے تھے نہ کہ تخلص سے۔ تخلص شاعر خود اختیار کرتا ہے۔

«حاتم کے کلام میں تنقید و تنبیہ کا سبق آموز اظہار ملتا ہے۔»

« سبق آموز » کی کوئی ضرورت نہیں ۔

ص ۲۹ ـ ۳۰ « وہ خاموش اور تماش بین نہیں رہنا چاہتے تھے ۔»

خاموش تماشائی کو « خاموش اور تماش بین » کہنا عبرت ناک ہے ۔

ص ۳۰ « بلکہ ترغیب و ترہیب کا فریضہ انجام دینے میں بڑے سے بڑا ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں »

ترہیب کے لیے بڑے سے بڑا تو کیا چھوٹے سے چھوٹا ایثار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اسے کسی طرح فریضہ قرار دیا جاسکتا ہے ۔ مرتب کے پاس بہ قول خود حاتم کے سوانح تک پہنچنے کے ذرائع نہیں ہیں اس کے باوجود ایسے دعوے کیا ضرور ہیں جیسے وہ چشم دید گواہ اور حاتم کے حاشیہ نشین ہوں ۔

ص ۳۱ « نواب سید ہدایت علی ضمیر کی زمین اور فرمایش پر بھی غزلیں لکھتے رہے ۔ میر محمد اسلم اور کوکہ خاں کی زمینوں میں بھی متعدد غزلیں ملتی ہیں »

ضمیر کی زمین میں پانچ ، اسلم کی دو اور کوکہ خان کی زمین میں ایک بھی غزل موجود نہیں ۔ پھر متعدد کا جواز ؟

« اس کے علاوہ مصحفی کے دوسرے تذکرے عقد ثریا . . . الخ »

« عقد ثریا » مصحفی کا دوسرا نہیں پہلا تذکرہ ہے ۔ دوسرا تذکرۂ ہندی اور تیسرا ریاض الفصحاء ۔

ص ۳۲ « حاتم کے سن شعور کے وقت اردو کو کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا بلکہ اسے منہ لگانا معیوب سمجھتے تھے ۔»

کون معیوب سمجھتے تھے ؟ « منہ لگانا » کے بعد « بھی » کی ضرورت ہے ۔

« یہ زبان علم و عرفان یا فکر و فن کے اظہار کے لیے درجۂ استناد کو نہیں پہنچی تھی ۔ »

علمی اور فکری مضامین یا خیالات کے اظہار کے قابل نہیں ہوئی تھی کو کس پیچیدہ اور مہمل انداز میں بیان کیا ہے ۔

« اس کا حلقہ روز افزوں وسیع تر ہورہا تھا »

« روز افزوں » کا مطلب روز بروز بڑھنا ہوتا ہے ۔ شاید مرتب « افزوں » کو « روز » کی کوئی صفت سمجھتا ہے ۔

ص ۳۳ « کوچہ و بازار کی پسندیدگی سے ایوان شاہی میں بھی اس کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔»

«کوچہ و بازار کی پسندیدگی» کیا؟ مرتب «بازگشت» کے معنی سے بھی ناواقف معلوم ہوتا۔

«سماج میں اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی مائل ہونے لگے تھے۔»

کس کی طرف؟

«ولی کے کلام کی آمد سے فکر و تخلیق میں انقلاب آفریں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔»

فکر میں تبدیلیاں ہوئیں یا تخلیق میں؟ «تبدیلیاں» اور «انقلاب آفریں» شاید کریلا اور نیم چڑھا قسم کی کوئی ترکیب ہے۔

«اس گری پڑی زبان کو اوج و عروج کا سب سے اچھا موقع ملا۔»

ترقی کا موقع ملا نہ کہ «اوج و عروج» کا۔ «سب سے اچھا» لغو۔

«حاتم اور اُن کے معاصرین نے اظہار خیال کے سانچوں اور پیرایۂ بیان کو ایک جہان ممکنات سے ہم کنار کیا اور اظہار و ابلاغ کو ایسی توسیع دی کہ چند سالوں میں دامن اردو جہان معنی سے گراں بار ہوگیا۔»

اظہار کی توسیع تو چلو مانا لیکن «ابلاغ» کی توسیع کیونکر ہوتی۔ گراں بار کے وہ معنی نہیں ہے جو مرتب نے لیے ہیں۔

ص ۳۳-۳۴ «بارہ سال کی مختصر مدت میں چار ہزار اشعار کی موجودگی شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے لیے مجبور کرتی ہے۔ وہیں وافر و وقیع کلام کی موجودگی زبان کے تنوع و توسیع پر بھی بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔»

پرگوئی یا قادر الکلامی کو «تخلیقی صلاحیتیں» کہنا درست نہیں۔ بارہ سال کو «مختصر مدت» کہنا بھی مناسب نہیں۔ چار ہزار شعر کہہ لینے کو «موجودگی» کہنا بھی ستم ہے۔ «وافر» وقیع کی طرح کوئی صفت نہیں۔ «تنوع و توسیع» کی ترکیب بھی بے ضرورت ہے۔ اگر اس سے مرتب کا منشا «وسعت» ہے تو یہی لفظ استعمال کرنا تھا۔

ص ۲۲ ، «اس مختصر وقفے میں پراسرار تخلیقی عمل اور اس کے مکمل
اظہار پر قادر ہونا ایک لسانی معجزہ ہی تو ہے۔»
«وقفہ» کو مدت اور عرصے کے معنی میں استعمال کرنا غلط ہے ۔ بارہ سال کو
«مختصر وقفہ» کہنا بھی نامناسب ہے ۔ «پراسرار تخلیقی عمل» بھی عجیب ہے
«تخلیقی عمل کا اظہار» کیا ہوتا ہے؟ اور «لسانی معجزے» کے کیا معنی ہیں؟

«ہمارے محترم بزرگوں کی جدوجہد سے اس دور کا بہت کچھ
ادبی سرمایہ گم شدہ و گم نام ذخیروں سے نکل کر ہماری رسائی
میں آگیا ہے۔»

«گم شدہ و گم نام ذخیروں سے نکل کر» آنے سے قطع نظر کیجیے ، «رسائی
میں آنے» پر غور فرمائیے ۔ یہ رسائی غالباً اکنائی قسم کی کوئی چیز ہے ۔ یا پھر
ڈاکٹر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹری کی ڈگری ہاتھ آجانے سے محاورہ سازی
کی سند مل جاتی ہے۔

«اس دولت بیدار کی بازیافت سے ادبی تاریخ کی غیر مربوط کڑیوں
اور خلاؤں کو پر کرنے میں بڑی پیش رفت ہوئی۔»

«خلاؤں» نہیں بلکہ خلا کو پر کیا جاتا ہے ، کڑیاں جوڑی جاتی ہیں ۔ تاریخ ادب
اور چیز ہے اور «ادبی تاریخ» اور ۔ دعوا محض دعوا ہے ، «پیش رفت» کا نہ
کوئی ثبوت ہے اور نہ مرتب نے اس «پیش رفت» کی وضاحت کی ہے۔

«پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے دیوان فائز کی تحقیق و اشاعت
سے ایک نئے ادبی سفر کا آغاز کیا۔»

دیوان فائز کی دریافت یا «تحقیق»؟ ۔ نئے ادبی سفر کے آغاز سے مرتب کی کیا
مراد ہے؟

«پروفیسر محمد حسن نے دیوان آبرو کی بازیافت سے ادبی تاریخ
کو نئے سمت و رفتار کی بشارت دی۔»

«سمت» بھی مونث اور «رفتار» بھی ۔ پھر «نئے» کیسے؟ ایک دیوان کی
«بازیافت» سے تاریخ ادب کی سمت و رفتار میں کیا فرق واقع ہوا یہ جناب
مرتب ہی کو معلوم ہوگا ۔ ویسے یہ دعوا بھی لغو ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن نے
دیوان آبرو دریافت کیا ۔ ڈاکٹر محمد حسن نے صرف دیوان آبرو شائع کیا وہ بھی
محض ایک نسخے ، «نسخۂ پٹیالہ» کی بنیاد پر جو فاضل مرتب کی تحقیق کے

مطابق نہایت "غلط سلط" ہے حالانکہ ڈاکٹر محمد حسن اسے صحیح ترین بتاتے ہیں۔ دیوان آبرو کے چھ نسخے دریافت ہو چکے ہیں جس کا اعتراف خود ڈاکٹر محمد حسن نے دیوان آبرو کے مقدمے میں کیا ہے۔ مرتب نے شاید "حق شاگردی" ادا کرنے کے لیے تحقیق کا سہرا ڈاکٹر محمد حسن کے سر باندھنا چاہا ہے (جس کا دعوا خود ڈاکٹر محمد حسن نے بھی نہیں کیا) ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن نے اشاعت سے پہلے ملک میں دستیاب نسخوں کا موازنہ و مقابلہ کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور نہ ہی اس اشاعت سے ڈاکٹر محمد حسن کے علمی وقار میں کوئی اضافہ ہی ہوا ہے۔

> "مسعود حسن رضوی مرحوم نے دیوان فائز کو کمال احتیاط سے مرتب کیا اور تحقیق کا حق ادا کیا جو ان کے شایان شان بھی تھا۔ انھوں نے دیوان فائز کو شمالی ہند کا پہلا اردو دیوان تسلیم کیا۔"

قرار دیا اور "تسلیم کیا" میں بہت فرق ہے۔ علاوہ ازیں مندرجہ بالا عبارت سے مرتب کا مقصد ادیب مرحوم کو خراج تحسین پیش کرنا نہیں بلکہ "کمال احتیاط" "تحقیق کا حق ادا کیا" اور "شایان شان" جیسے تعریفی کلمات محض "طلائی ورق" ہیں جن میں طنز کی "زہریلی گولی" کو لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مندرجہ عبارت کے فوراً بعد ہی مرتب نے رضوی صاحب کی تحقیق اور ان کے نظریے کی خامیاں گنوانا شروع کردی ہیں کسی پر برحق اعتراض کرنے کے لیے بغلیں جھانکنے کی ضرورت نہیں۔ محقق میں حق گوئی کا حوصلا ہونا چاہیے۔

ص ۳۶-۳۷ "پروفیسر مسعود حسن رضوی نے دیوان زادہ کے مقدمہ (مقدمے) اور مصحفی کے بیان میں ایک مطابقت پیدا کرکے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حاتم نے ۱۱۲۸ھ سے فارسی اور ۱۱۳۲ھ سے اردو میں شاعری شروع کی۔ یہ خیال تحقیقی طور پر غلط ہے کیوں کہ دیوان زادہ میں دو غزلیں ۱۱۳۱ھ کی موجود ہیں اور اگر نسخۂ رام پور کی روایت صحیح تسلیم کی جائے تو ۱۱۳۰ھ کی ایک غزل مرزا مظہر کی زمین میں ہے۔۔ نسخۂ لندن و لاہور میں اس غزل کی تاریخ ۱۱۴۰ھ درج ہے لیکن اتنا تو درست ہے کہ حاتم کی اردو شاعری ۱۱۲۸ھ میں شروع ہو چکی تھی۔"

"مطابقت" سے پہلے "ایک" کی ضرورت نہیں مرتب نے ۱۱۲۸ھ کے لیے

ماتم کے بیان کو بنیاد بنایا ہے اس سنہ کی کوئی غزل دریافت نہیں کی۔ اگر
۱۱۹ ھ کی دو غزلوں کی بنیاد پر یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ حاتم کی شاعری
ں سنہ سے پہلے شروع ہوچکی تھی (حالانکہ اس کا بھی امکان ہے کہ ۱۱۴۰ھ
لی غزل کی طرح یہ سنہ بھی غلط ثابت ہوجائے) تو ان متعدد غزلوں کی موجودگی
ے جو ۱۱۵۸ھ کے بعد کہی گئی ہیں یہ کیوں ثابت نہیں ہوتا کی مرتب کا ذاتی
مخطوطہ ۱۱۵۸ھ کے بعد لکھا گیا؟

ص ۳۷ « . رضوی مرحوم کا یہ خیال تحقیقی طور پر غلط بھی ہے۔ »
بھی ، کی کوئی ضرورت نہیں۔

« ایک اور استدلال بھی محل نظر ہے۔ »
جملہ خلا میں لٹکتا محسوس ہوتا ہے۔

ص ۳۹۔ ۴ « آبرو ، مضمون ، یکرنگ کی طرح فائز نے بھی نئی تحریک
حاصل کی ہو اور ۱۱۳۲ھ کے آس پاس شعر کہنا شروع کیا ہو »

جملہ نادر ہوا ہے۔ « نئی تحریک » مہمل ہے۔ جب فائز نے شعر کہنا ہی ۱۱۳۲ھ
میں شروع کیا جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا ، تو تحریک « حاصل کی » ہوگی نہ کہ
« نئی تحریک » ۔

ص ۴۰ « ان شکوک و شواہد کی روشنی میں دیوان فائز کو شمالی ہند کا سب
سے قدیم دیوان تسلیم نہیں کیا جاسکتا »

« شواہد » کا حال قارئین نے ملاحظہ فرما لیا۔ « شکوک » پر تحقیق کی بنیاد رکھنا
اصولاً غلط ہے۔ ویسے مصحفی کے اس بیان کو مرتب نے ضرورت سے زیادہ
اہمیت دینے کی کوشش کی ہے کہ ولی کا کلام محمد شاہ کے جلوس کے دوسرے
سال دہلی پہنچا اور ان کے اشعار لوگوں کی زبان پر جاری ہوگئے لیکن اس
حقیقت سے عمداً چشم پوشی کی ہے کہ اس سے کئی برس پہلے ولی خود اپنے
کلام کے ساتھ دہلی وارد ہوئے تھے لوگوں نے اس وقت بھی ان کا کلام سنا تھا
اور متاثر ہوکر اردو میں شعرگوئی شروع کردی تھی اگر مرتب کے استدلال
کو درست مان لیا جائے تو حاتم کی ۱۱۳۱ھ کی ان غزلوں کی کیا توجیہہ ہوگی
جو ولی کے دیوان کی آمد سے ایک سال قبل ولی کی زمین میں کہی گئی ہیں۔

« حاتم و آبرو کے کلام کی ضخامت اور جامعیت کئی گنا زیادہ ہے۔ »
« ضخامت » کی بات تسلیم لیکن « جامعیت » ؟ یہ جملہ لکھتے ہوئے غالباً مرتب

اپنا وہ بیان بھول گیا ہے جس میں اس نے تذکرہ نگاروں پر یہ الزام لگایا ہے کہ ان کی تحریروں سے یہ اندازا ہی نہیں ہوتا کہ کسی نے آبرو کا دیوان دیکھا ہے یا اس میں اشعار کی تعداد کتنی ہے۔

«پروفیسر محمد حسن نے اقرار کیا ہے اگر حاتم کا قدیم دیوان دستیاب ہوجائے تو انہیں کو اولیت کا شرف حاصل ہوگا۔»

«اقرار» نہیں اعتراف کیا ہے، قبول کیا ہے یا مانا ہے۔ شرف اولیت دیوان حاتم کو ہوگا یا حاتم کو؟

ص ۴۱ «یہ طے شدہ ہے کہ حاتم نے ۱۱۴۲ع (۱۱۴۲؟ھ) میں اپنا قدیم دیوان مرتب کیا تھا۔»

اس کے فوراً بعد یہ لغو بیان ملتا ہے:

ص ۴۲ «حاتم نے ۱۱۲۸ھ میں شاعری شروع کی... ۱۱۴۱ھ تک وہ کئی دیوان کہہ چکے تھے۔ یہ اعتراف ۱۱۴۲ھ کی غزل کے مقطعے میں موجود ہے:

کئی دیوان کہہ چکا حاتم اب تلک پر زباں نہیں ہے درست

جب یہ «طے شدہ ہے» کہ حاتم نے دیوان قدیم یا پہلا دیوان ۱۱۴۲ھ میں مرتب کیا تو اس سے ایک سال پہلے یعنی ۱۱۴۱ھ تک کئی دیوان کہہ چکنے کا دعوا کون تسلیم کرے گا؟ جسے مرتب ۱۱۴۱ھ کی غزل کہہ رہا ہے اس کے لیے نسخۂ رام پور میں ۱۱۴۷ھ کی تاریخ موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کسی دوسرے نسخے میں اس سے بھی بعد کی تاریخ ملے کیوں کہ ۱۱۲۸ھ۔ ۱۱۴۲ھ تک ۱۵ سال کی مدت میں جو ایک شخص ایک دیوان مرتب کرسکے وہ ۵-۶ سال کی مدت میں کئی دیوان کیوں کر کہہ سکتا ہے یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک مبتدی کی شعرگوئی کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے لیکن جوں جوں فن کا شعور اور پختگی پیدا ہوتی ہے شعرگوئی کی رفتار میں بتدریج کمی آتی جاتی ہے۔

«اردو زبان ہر روز تبدیلی و تحریف سے دو چار ہوکر بہتر سے بہتر صورت پذیری کی طرف مائل تھی۔ ایسی صورت میں حاتم کی زبان کیسے درست ہوسکتی تھی۔»

ہماری زبان میں «تحریف» کے جو معنی مستعمل ہیں شاید مرتب ان سے ناواقف ہے ورنہ بار بار اس غلط استعمال کا کیا مطلب ہے؟ یہ استدلال بھی عجیب ہے، زبان روز بروز بہتر «صورت پذیری کی» طرف مائل تھی نہ کہ غلط سے درست کی

طرف گام زن تھی۔ اس لحاظ سے حاتم کی زبان آن گزہ تو ہوسکتی تھی نادرست نہیں

"اس قدیم دیوان کی ترتیب کے بعد بھی شاعری کرتے رہے اور اچھا خاصا کلام جمع ہوگیا تھا زبان میں نت نئی تبدیلیاں بھی واقع ہورہی تھیں "

یہ جملے اس سے پہلے اقتباس سے فوراً بعد آئے لیکن کیا ان میں کوئی ربط ہے؟ جب زبان میں پررور "تبدیلی و تحریف" کی بات ماقبل جملے میں کہی جاچکی تھی تو "نت نئی تبدیلیاں بھی واقع ہورہی تھیں" کہنا کیا ضرور تھا؟ اس قسم کی تکرار بےجا سے پورا مقدمہ بھرا پڑا ہے اگر سب مکرر جملے نکال دیے جائیں تو یہ مقدمہ صرف ایک چوتھائی رہ جائے گا۔

"... جان جاناں کی اصلاح زبان کی تحریک لسانی اور علاقائی تحریک کی صورت میں زبان و بیان میں انقلاب انگیز تبدیلی لانے کی متقاضی تھی۔"

خط کشیدہ الفاظ و تراکیب غور طلب ہیں۔

"حاتم نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا اور ۱۱۶۸ھ میں کلام بشمول دیوان قدیم پر نظر ثانی کی "

کیا دیوان قدیم سے پہلے بھی کوئی دیوان تھا؟ صرف "کلام پر" سے مطلب ادا ہوسکتا تھا۔

"پرانی زبان کو نئے دور اور اس کے رواج کے مطابق ڈھالا .. اس کا اندازا اس مخطوطے سے بھی ہوتا ہے۔"

خط کشیدہ الفاظ بےضرورت ہیں۔ اس مخطوطے کے متن سے ایسا کوئی اندازا نہیں ہوتا جس کا دعوا مرتب نے کیا ہے۔ خود اگلا ہی جملہ مرتب کے اس دعوے کی تردید کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

"قدامت کے ساتھ قدیم متن اور اس کی املائی صورتوں کی موجودگی اس مخطوطہ (مخطوطے) کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتی ہے۔"

"قدامت کے ساتھ قدیم متن کی موجودگی" کیا ہوا؟

"قدیم و جدید کے امتیازات اور ان میں تبدیلی و انحراف کا سب سے فکر انگیز مطالعہ ہمیں حاتم کے ہاں ملتا ہے۔"

«تبدیلی» کسی چیز «میں» اور «انحراف» کسی «سے» ہوتا ہے۔ «پکو انگیز مطالعہ ملتا ہے» عجیب زبان ہے۔

ص ۴۳ «حاتم نے دیوان کی ترتیب نو کے وقت اسی ضرورت کے پیش نظر
پورے کلام کا انتخاب اور اس میں اضافہ و اصلاح کیا۔»

«دیوان کی ترتیب نو» یا «دیوان زادہ» کی؟ صرف «ترتیب» کا لفظ کافی تھا۔ جس ضرورت کے پیش نظر کلام کا انتخاب کیا گیا اس کا ذکر دور دور تک نہیں ہے۔ «اضافہ و اصلاح کی» ہوتا ہے اور «اصلاح و اضافہ» کیا۔

انھوں نے مقدمہ (مقدمے) میں لکھا:

بندہ در دیوان قدیم خود تقید دارد دریں ولا از دہ دوازدہ سال
اکثر الفاظ از نظر انداختہ»

حاتم کے اس قول کے معاً بعد یہ جملے ملتے ہیں:

«انہیں تقاضوں سے مجبور ہوکر انہوں نے ۱۱۶۸ھ میں نیا انتخاب
اور نئی تدوین کی اور نئے اضافے بھی کیے۔»

حاتم کے محولا بالا قول میں کسی تقاضے کا ذکر نہیں پھر «انہیں تقاضوں» سے مطلب؟ «نیا انتخاب» مہمل ہے۔ کیا کوئی پرانا انتخاب بھی تھا؟ کیا پرانے اضافے بھی تھے؟ کہ حاتم نے «نئے اضافے» بھی کیے؟

«الفاظ و معنی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایہام گوئی سے دست برداری،
غزلوں میں بحروں کی تخصیص، سنہ تخلیق اور طرحی زمینوں کا
اندراج بھی شامل کیا۔»

الفاظ کی تبدیلی سے معانی کی تبدیلی لازم نہیں آتی۔ اس انتخاب میں جتنی تبدیلیاں کی گئی ہیں ان سے اشعار کے معنی میں کہیں بھی فرق نہیں آیا۔ ویسے معنوی تبدیلی لفظی رد و بدل کے بغیر ناممکن ہے اس لیے یہاں صرف اصلاح کا لفظ کافی تھا۔ «الفاظ و معانی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ» کہنا غلط ہے۔ «ایہام سے دست برداری» کو کیسے «شامل کیا»؟ «غزلوں میں بحروں کی تخصیص» سے کیا مراد ہے؟ یہاں «تصریح» کی ضرورت تھی یا «بحروں کی نشاندہی کی» کی۔ «سنہ تخلیق اور طرحی زمینوں کا اندراج بھی شامل کیا» بھی مہمل ہے۔ «اندراج کیا» کافی تھا۔ اس بیان سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ حاتم نے تیس برس بعد محض حافظے کی مدد سے غزلوں پر سنہ تخلیق درج کیا اس لیے ان

کے صحیح ہونے یا قطعیت پر اصرار کرنا اور اُن سے کچھ خاص نتائج نکالنا مناسب نہیں۔

«اس طرح کلام حاتم کا انتخاب نوئی صورت اور نئے رجحان کے ساتھ ۱۱۶۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔»

جملے کی لغویت ظاہر ہے۔

مندرجہ بالا جملے سے پہلے بھی مرتب نے کئی خیال ظاہر کیے ہیں جن سے تعرض نہیں کیا گیا۔ یہاں سے ڈاکٹر صاحب نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ تحقیق نا آشنا قاری ان کی تحقیقی عظمت کا قائل ہوجائے۔ ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

«اِن حقائق کی روشنی میں حاتم نے قدیم دیوان کی تدوین ۱۱۴۳ھ (؟ پہلے کتنی بار ۱۱۴۲ھ کہہ چکے ہیں) قرار پاتی ہے۔ گویا آبرو کے انتقال سے چار سال پہلے (آبرو کا انتقال ۱۱۴۶ھ میں ہوا اس لحاظ سے تین سال ہوئے۔) حاتم کا دیوان مرتب ہوچکا تھا جب کہ دیوان آبرو کی تاریخ ترتیب معلوم نہیں ہوسکی ہے (معلوم نہ ہوسکنے کا مطلب یہ نہیں کہ دیوان مرتب ہی نہیں ہوا) آبرو اور معاصرین کی تحریر میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے فاضل مرتب نے جسے یقین کے ساتھ کیا ہے (یہ یکایک فاضل مرتب کا بیچ میں کود پڑنا عجیب ہے۔ کہاں کا سلسلا کہاں ملایا ہے۔ یہاں فاضل مرتب سے مراد دیوان آبرو کے مرتب ڈاکٹر محمد حسن ہیں) وہ بہت مشکوک بھی ہوسکتا ہے یعنی ان کا یہ کہنا کہ یقیناً آبرو کا دیوان ان کی وفات ۱۱۴۶ھ سے پہلے مرتب ہوچکا تھا۔ یہ ایک سچائی بھی ہوسکتی ہے اور قابل قبول قیاس بھی مگر ابھی تک کوئی ایسی دلیل (؟ ثبوت) نہیں ہے جس کی بنیاد پر قطعیت کے ساتھ کہا جاسکے۔» (کیا کہا جاسکے؟)

«بہت مشکوک بھی ہوسکتا ہے» کے کوئی معنی نہیں «بہت مشکوک» کیوں؟ اگر صرف مشکوک ہو توکام نہیں چلے گا؟ اس کے علاوہ یا اسے مشکوک قرار دیجئے یا مان لیجئے۔ اگر قیاس «قابل قبول» ہے تو اس میں شک کیسا؟ اب ایک عجیب الخلقت بیان اور ملاحظہ فرمائیے:

ص ۴۲-۴۳۔ «عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ شاعر کا دیوان اس کی زندگی میں
مرتب ہوجاتا ہے لیکن ایسی بھی مثالیں ہیں کہ بعد مرگ کلام
مرتب ہوا ہے، شاگردوں اور عزیزوں نے یہ کام انجام دیے ہیں۔
یہ مثال بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ عقیدت مند کسی شاعر کے کلام
کو اس کی زندگی میں مرتب کرلیتے ہیں اور خود شاعر اس ترتیب
کو کالعدم (؟ کالمعدم) قرار دے دیتا ہے۔ بیسویں صدی میں اقبال
کے ساتھ یہ ہوچکا ہے۔»

متقدمین میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کلام بعد از مرگ مرتب ہوا ہو، اشاعت کی بات اور ہے۔ مرتب کے دیکھنے میں جو مثالیں آئی ہیں ان میں سے ایک آدھ کا ذکر ضرور کرنا تھا۔ (انیسویں صدی میں شاید ذوق کے بارے میں کہا جاسکے لیکن ان کا شمار متاخرین میں ہونا چاہیے) «اقبال کے ساتھ یہ ہوچکا ہے» صریحاً غلط بیانی ہے۔ اقبال نے خود اپنے کلام کے مجموعے مرتب ہی نہیں کیے بلکہ طبع اور شائع بھی کروائے۔ کالعدم قرار دینے کی بھی ایک ہی رہی۔ اقبال نے اپنے انگریزی لکچروں کے مجموعے کا اردو ترجمہ شائع کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، اسے کالعدم تو قرار نہیں دیا تھا! حالاں کہ یہی مجموعہ انگریزی میں شائع کروانے میں اقبال کو عذر نہیں تھا۔ حیرت ہے اقبال پر تحقیق کرنے والا ایسا غیر ذمہ دارانہ بیان دیتا ہے۔

ص ۴۳۔ «ملفوظات و مکاتیب کے بیشتر ذخیروں کو شاگردوں اور عقیدت مندوں
نے مرتب کیے ہیں۔»

«ذخیروں کو . . . عقیدت مندوں نے مرتب کیے ہیں» سے قطع نظر، فاضل مرتب یا قارئین کرام میں سے کوئی صاحب یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں، ملفوظات کو خود کسی بزرگ نے مرتب کیا ہے؟ یہ کام عقیدت مند اور شاگرد ہی کرتے ہیں۔ اب رہی مکاتیب کی بات، غالباً اس کی بھی کوئی مثال سلف میں ایسی نہیں ملے گی کہ کسی ادیب یا شاعر کو خود اپنے مکاتیب مرتب کرنے کی بات سوجھی ہو۔ اگر مکاتیب دوسروں کو لکھے گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ مصنف کے پاس ان کی نقلیں ہونا ممکن نہیں جب تک کہ وہ اشاعت کی نیت سے نہ لکھے گئے ہوں، موجودہ زمانے میں ٹائپ کی ایجاد سے خطوں کی نقلیں رکھنا ممکن ہوا ہے۔

ص ۴۴۔ «جب تک دیوان آبرو کا کوئی نسخہ ان کی عین حیات کا نہیں ملتا
یا عصری و معتبر شہادت نہیں ملتی شبہے کی گنجایش رہے گی۔»

«عین حیات» ہوتا یا صرف «حیات» لکھتے۔ «ٹھیک» کے معنی میں «عین» اردو میں اضافت لگانا درست نہیں۔ اس کے علاوہ اس فقرے میں جو دعوا کیا گیا ہے اسے پرکھنے کے لیے ایک دوسرے بیان کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے آبرو کا دیوان شائع کیا ہے۔ جس نسخے سے یہ مرتب ہوا ہے وہ بہ قول مرتب کے «۱۱۴۶ھ میں لکھا گیا تھا۔» یہ مخطوطہ بہایت «غلط سلط» لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ مصنف کا اپنا مرتب کردہ نہیں ہوسکتا ڈاکٹر محمد حسن کے بیان پر مرتب کا تبصرہ یہ ہے:

> «غلط سلط کی موجودگی سے یہ قیاس تو کیا جاسکتا ہے کہ اس کے سامنے (کس کے سامنے؟) شاعر کا مرتب کردہ دیوان بھی رہا ہوگا لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ خود شاعر نے اپنے قلم سے مرتب ہی نہ کیا ہو بلکہ کسی کم سواد نے اپنے طور پر...... (یہ سات نقطے خود مرتب نے لگائے ہیں) اسے قلم بند کیا ہو۔ یا اس کے ایک دو سال پہلے ترتیب دیا گیا ہو (کس نے ایک دو سال پہلے؟) ایک دو تذکروں کے علاوہ فائز کی شاعری اور کلام کا ذکر نہیں ملتا (یہاں فائز کا ذکر کہاں سے در آیا) اس کے برخلاف آبرو کا ذکر ہر جگہ ملتا ہے مگر ان کے دیوان کا تذکرہ اس صراحت سے نہیں ملتا کہ اسے دیکھا گیا ہو اور اس میں اتنے اشعار موجود ہیں، جیسا کہ حاتم کے قدیم دیوان کے بارے میں تذکرہ ہوا ہے۔»

ص ۴۵-۴۶ آخری جملے کی بے ربطی کو فی الحال نظر انداز کیجیے اور صرف مرتب کے اخذ کردہ نتائج یا دعوے پر نظر رکھیے۔

۱: ۱۱۴۶ھ میں لکھے ہوئے دیوان کے معنی یہ بھی تو ہیں کہ وہ مصنف کی حیات ہی میں مرتب ہوا ہو۔ خواہ مصنف کی نظر سے نہ گزرا ہو کیونکہ آبرو کا انتقال ۱۱۴۶ھ ہی میں ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ جس نسخے سے انھوں نے آبرو کا دیوان مرتب کیا ہے وہ آبرو کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔ گویا مرتب کو یہ تسلیم ہے کہ ۱۱۴۶ھ کا دیوان آبرو موجود ہے۔ اس کے علاوہ مرتب کے ذاتی نسخے میں انتخاب آبرو کے بعد جو ترقیمہ ہے اور جو ۱۱۵۸ھ میں لکھا گیا ہے یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ۱۱۵۸ھ میں آبرو کا کوئی دیوان موجود تھا جس سے یہ انتخاب کیا گیا۔ مرتب نے اس انتخاب کو

" غلط سلط تو بھی بتایا ہے ۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ اس نسخہ سے مختلف ہوگا جس کی بنیاد پر ڈاکٹر محمد حسین نے دیوان آبرو شائع کیا۔ "

۲ : فاضل مرتب یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ کاتب کے پیش نظر شاعر کا مرتبہ کوئی دیوان ہوسکتا ہے لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ " ہوسکتا ہے اسے کسی کم سواد نے اپنے طور پر قلم بند کیا ہو۔ " اپنے طور پر قلم بند کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہوسکتا ہے کہ کاتب آبرو کے ساتھ رہا ہو اور اس نے مشاعروں میں سن سن کر کلام قلم بند کرلیا ہو۔ بہ صورت دیگر اپنے طور پر قلم بند کرنا ممکن نہیں جب تک اس کے پیش نظر کوئی مرتبہ نسخہ نہ ہو۔ لہٰذا غلط سلط ہونے سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زیر گفتگو دیوان آبرو نقل درنقل ہو۔ اور نقل درنقل ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیوان آبرو اس سے بہت پہلے مرتب ہوچکا ہو۔ اس میں ایک دو سال کی قید درست نہیں۔

۳ : یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ " دیوان آبرو کا تذکرہ اس صراحت سے نہیں ملتا کہ اسے دیکھا گیا ہو۔ " اپنے تساہل کو دوسروں کی کوتاہی پر محمول کرنا کسی محقق کو زیب نہیں دیتا حقیقت یہ ہے کہ ایسے تمام کھوکھلے دعوے مرتب کو جیسے جیسے سوجھتے رہے وہ انہیں قلم بند کرتا گیا۔ اس نے زیر گفتگو دیوان کی ترتیب کے وقت ایک بھی تذکرہ نہیں دیکھا ورنہ ایسی صریح عبارت اس کی نظر سے کیسے مخفی رہ سکتی ہے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ مصحفی کا تذکرۂ ہندی سامنے کا تذکرہ ہے۔ خود مرتب نے فہرست مصادر میں اسے شامل کیا ہے۔ اس ضمن میں مصحفی کا بیان ہے :

" فقیر چندشعرش بطور خود از دیوانش انتخاب زدہ۔ "[1]

۴ : تعداد اشعار اور مقدار کلام کی تصریح کے لیے ملاحظہ ہوں تذکروں کے یہ بیانات :

" صاحب دیوان ریختہ ہے۔ "[2]

" کلیاتش یک ہزار و پانصد بیت دیدہ شد۔ "[3]

" مردم در کار ریختہ صائب وقت می خواندند۔ دیوانے ضخیم و خوب و

۱۔ تذکرۂ ہندی، ص ۷

۲۔ طبقات الشعرا از کریم الدین ۱۸۴۷ ع، ص ۹۲

۳۔ گلشن سخن از مردان علی خاں مبتلا ۱۱۹۴ ھ، ص ۵۱

۰۰ پمبئی

زہ ازیں عالم جمع کردہ۔ فقیر ایں فقرۂ نثر در تعریف اوگفتہ بہ
ویش خواندہ بودم ریختۂ آبرو، آبرو شعر ریختہ۔ بر فقیر بسیار
ہربانی میفرمود اکثر بویرانہ قدم رنجہ می نمود و شبہا می ماند۔
در شعر پارسی ہم زبان درست داشت۔ بیست و چہارم رجب سال
ہزار و صد و چہل و ششم برحمت حق پیوست۔ نزدیک مزار سید
حسن رسول نما واقع شاہجہاں آباد مدفون گشت۔ ایں سہ بیت بخط خود
بہ مشاعرہ در سفینۂ فقیر نوشتہ بود۔۔۔۔[1]

باسات سے غالباً مرتب کے شکوک رفع ہوگئے ہوں گے۔ ان میں ایسے
بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آبرو کا دیوان دیکھا گیا اور ایسا بیان
ہے جس میں کلیات ضخیم کا ذکر موجود ہے۔ ایک بیان میں اشعار کی تعداد
بہ صراحت موجود ہے۔ خوش گو کا بیان سب سے اہم ہے اس لیے کہ وہ
ہی نہیں آبرو کا مقرب بھی رہا ہے۔ آبرو اس کے ہاں قیام بھی کرتے رہے
اس کے « سفینے » میں اپنے قلم سے اشعار بھی درج کرچکے ہیں۔ بقول
ا کاکوی یہ تذکرہ قید تاریخ لکھا گیا ہے۔ یہ دفتر (ثالث) ۱۱۴۸ھ پر ختم
اما ہے اس کا مطلب ہے ۱۱۴۸ھ میں آبرو کا نہایت ضخیم کلیات موجود تھا۔
ایک ضخیم کلیات دو چار دن بلکہ دو چار سال میں بھی وجود میں نہیں آجاتا۔
ے صریح بیاں کی موجودگی میں بےضرورت قیاس آرائی فضول ہے۔ ایک مختصر
ں پندرہ سو اشعار پر مشتمل مجموعے کا ذکر بھی موجود ہے۔ فی الوقت یہ کہنا
مکل ہے کہ آبرو نے اس ضخیم کلیات میں سے منتخب کیا تھا یا یہ کہ پندرہ
اشعار پر مشتمل کلیات پہلے وجود میں آیا اور ضخیم کلیات بعد میں۔ اگر ایسا ہو
اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۱۱۴۶ھ سے کہیں پہلے صاحب دیوان ہوچکے تھے۔
قول مرتب ۱۱۴۶ھ کا مکتوبہ دیوان ڈاکٹر محمد حسن نے شائع کر دیا ہے[2]
برحال ایک بار پھر زبان و بیان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

---

۱ سفینۂ خوشگو (دفتر ثالث) از بندرابن داس خوش گو ۱۱۴۸ھ، ص ۱۹۵ - ۱۹۶
۲ یہ اطلاع بھی غلط ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے جو متن شائع کیا ہے وہ ۱۱۴۹ھ
کے مکتوبہ نسخۂ پٹیالہ پر مبنی ہے۔ اس امر کا انکشاف مجھ پر ابھی ابھی ہوا ہے۔ ایک
اور انکشاف ایسا بھی ہے جس سے نہ صرف مرتب دیوان حاتم کے تمام شکوک و شبہات
دور ہوجائیں گے بلکہ مرتب دیوان آبرو کی ایک غلط فہمی بھی رفع ہوجائے گی اور
اگر وہ چاہیں تو مکمل کلیات مرتب کرتے وقت (بہ شرطے کہ اس کی نوبت آئے) اُس

ص ۴۶ ۔ « انسانی اسلوب فکر کا یہ دل نشیں مطالعہ ہے کہ ماضی کی دریافت غلط ہوتی رہتی ہے ۔ »

(گزشتہ سے پیوستہ)

سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں ڈاکٹر عبدالحق کی یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۱۴۶ھ کے جس غلط سلط نسخے کو بنیاد بنا کر انہوں نے بے تکے نتائج اخذ کیے ہیں ، اصل میں وہ نسخہ نہیں وہ جو ڈاکٹر محمد حسن نے شائع کیا ہے اور نہ ہی وہ ۱۱۴۶ھ کا لکھا ہوا ہے ۔ ڈاکٹر محمد حسن نے جو نسخہ شائع کیا ہے وہ نسخۂ پٹیالہ ہے جس کے متعلق ان کا بیان ہے :

« نسخۂ پٹیالہ نہایت صاف اور صحیح لکھا ہوا ہے ۔ » (دیوان آبرو ، ص ۵۷)

قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ فاضل مرتب نے دیوان آبرو کا مقدمہ بھی پوری طرح نہیں پڑھا۔ وہ صفحہ ۲۵ سے آگے نہیں بڑھے اگر انہیں یہ اصرار ہے کہ انہوں نے دیوان آبرو پر ڈاکٹر محمد حسن کا مقدمہ پورا پڑھا ہے تو اس سے یہ افسوس ناک نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو وہ پڑھنا نہیں جانتے یا پھر اردو زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی ۔ ڈاکٹر محمد حسن نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ جو متن پیش کر رہے ہیں وہ اس « غلط سلط » نسخے پر مبنی ہے جسے انہوں نسخۂ کلکتہ کا نام دیا ہے ۔ ڈاکٹر محمد حسن نے نہایت واضح اور اور غیر مبہم الفاظ میں لکھا ہے کہ ان کا مقصد نسخۂ پٹیالہ کا صحیح متن پیش کرنا ہے اور نسخۂ پٹیالہ کا جو ترقیمہ انہوں نے نقل کیا ہے اس کے مطابق یہ نسخہ « ۱۹ محمد شاہی مطابق ۱۱۴۹ھ کا مکتوبہ ہے » نہ کہ ۱۱۴۶ھ کا میں ہر دو مرتب حضرات سے ان کی ایک غلط فہمی دور کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جسے وہ ۱۱۴۶ھ کا مکتوبہ نسخہ سمجھ رہے ہیں وہ دراصل سنہ مذکور کا مکتوبہ نہیں ہے ، ملاحظہ ہو ۔

« مخطوطے کے اندر ایک اور ترقیمہ ہے جس میں تاریخ کتابت ۱۵ھ دی گئی ہے جو غالباً جلوس محمد شاہی کے سنہ کی ہے ۔ ترقیمہ یہ ہے :

« دیوان آبرو بتاریخ بیست و دویم ذی الحجہ ۱۵ سپہری تحریر یافت ۔ »

میں اصل مخطوطہ دیکھے بغیر یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ یہ سنہ جلوس محمد شاہ سے متعلق ہے یا نہیں لیکن اگر یہ ترقیمہ اور ڈاکٹر محمد حسن کا خیال درست ہے تو دیوان آبرو کے دستیاب شدہ چھ نسخوں میں یہ سب سے قدیم ہے اور اہم بھی ۔ اہم اس لیے کہ یہ آبرو کی حیات میں لکھا گیا گو یہ ان کی نظر سے نہ گزرا ہو ۱۵ محمد شاہی ۱۱۴۶ھ نہیں بلکہ ۱۱۴۵ھ کے مطابق ہوتا ہے ۔ اسے انگلیوں پر گن کر حساب لگایا جا سکتا ہے اگر ۱۱۳۱ھ محمد شاہ کے جلوس کا پہلا سال ہو تو ۱۵ واں سال ۱۱۴۵ھ ہوگا نہ کہ ۱۱۴۶ھ اس ثبوت کے بعد

«انسانی اسلوب فکر کا دل نشیں مطالعہ» عور طلب ہے۔ یہاں مطالعہ غالباً پہلو کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ «ماضی کی دریافت» کی جگہ «دریافتیں» کا مقام ہے۔ لیکن اگر فاضل مرتب یہ انکشاف نہ بھی کرتا تو بھی کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔

«فکر انسانی کی ارتقا کا یہ دلچسپ پہلو ہے کہ ماضی کی یافت و یادگار کا سہارا لے کر وہ آگے رواں دواں ہوتی رہتی ہے۔ ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتی»

«کی ارتقا» «یافت و یادگار» «رواں دواں» سب غور طلب ہیں اس مہمل آرایش کے بغیر بھی یہ جملہ لکھا جاسکتا تھا اس کے علاوہ اس «پہلو» میں دلچسپی کا کوئی عنصر نہیں

ص ۴۸ «... میں بے احتیاط و اندیشہ کی وجہ سے متن میں داخل نہ کر کے حاشیے (حاشیے) اور ضمیمے میں شامل کیا ہے۔»

«احتیاط» ٹھیک «اندیشہ» غلط

«۱۱۶۸ء میں تبدیلی و تحریف کے علاوہ اصلاح و اضافہ بھی کیا گیا۔»

«اصلاح و اضافہ» میں تبدیلی شامل ہے تحریف غلط ہے۔

«تحقیق میں تدوین متن کا کام سب سے زیادہ دشوار گزار اور صبر آزما ہوتا ہے۔»

«صبر آزما» کافی تھا «دشوار» سے بھی کام چل سکتا تھا «دشوار گزار» غلط ہے۔

«طرح طرح کے اندیشہ ہائے دور دراز سے سامنا پڑتا ہے۔»

«طرح طرح کے اندیشے» کہیے یا «اندیشہ ہائے دور دراز»۔ «سامنا» ہوتا ہے، «سابقہ» یا «واسطہ» «پڑتا ہے»۔

«یہ نسخہ دراصل ایک مجموعۂ انتخاب کی حیثیت رکھتا ہے»

یہ ہے ہی مجموعۂ انتخاب۔ پھر «حیثیت رکھتا ہے» کیوں؟

«اس مطبوعہ دیوان آبرو میں اشعار کی تعداد دو سو ہے»

دیوان آبرو کا یہ انتخاب ایک قلمی نسخے میں ملتا ہے جسے مرتب اپنا ذاتی نسخہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

کسی قیاس آرائی کی گنجایش نہیں رہ جاتی۔ (ویسے مجھے ڈاکٹر محمد حسن کا خیال مشکوک معلوم ہوتا ہے کہ «۱۵ جلوس محمد شاہی کے سنہ سے متعلق ہے» اگر کبھی موقع ملا تو اس پر قلم اٹھاؤں گا۔)

کہتا ہے ۔ پھر یہ مطبوعہ دیوان کہاں سے آ گیا؟

« دیوانِ آبرو کے خاتمہ (خاتمے) پر حسب ذیل ترقیمہ (ترقیمے) کی عبارت ملتی ہے ۔ (ترقیمے کی حسب ذیل عبارت ، یا ترقیمہ)
تحت، تمام شد نسخہ دیوان آبرو . . . ۲۸ جلوسی مطابق ۱۱۵۸ ہجری . . . الخ
دوسرا ترقیمہ حسب ذیل ہے :
تحت تمام شد ۱۱۶۱ ہجری سنہ احد احمد شاہی
. . . ان ترقیموں سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دیوانِ حاتم جو ترتیب کے لحاظ سے دیوان آبرو سے پہلے ہے وہ ۱۱۵۸ھ سے پہلے لکھا گیا ہے ۔ »

یہ قیاس کچھ زیادہ موزوں نہیں جب ترتیب کلام میں شاعروں کے زمانے کا لحاظ نہیں رکھا گیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ جو کلام مجموعے میں پہلے ملتا ہے وہ نقل بھی پہلے ہی ہوا ہو؟

ص ۵۰ « شروع سے آخر تک . . . ایک ہی خط ملتا ہے . . . پختہ قلم کی وجہ سے تحریر بے حد دلکش ہے ۔ خط شکستہ آمیز جس سے مخطوطہ پڑھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے ۔ اس قیاس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ اس میں موجود کلام کا سب سے غالب حصہ ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۴۰ھ تک کا ہے ۔ »

کیا خط کی پختگی، مخطوطہ پڑھنے میں دشواری کا پیش آنا، سبب قیاس ہے؟ اور اس قیاس سے یہ تائید کیونکر ہوتی ہے کہ اس میں غالب حصہ ۱۱۳۱ھ ۔ ۱۱۴۰ھ تک کا ہے؟

« اس کے بعد پانچویں دہائی کا کلام ملتا ہے ۔ چوتھی دہائی یعنی ۱۱۵۱ھ سے ۱۱۶۰ھ تک کی صرف چھ (چھے) غزلیں ہیں ۱۱۵۱ھ کی دو، ۱۱۵۳ھ کی دو، ۱۱۵۴ھ کی ایک اور ۱۱۵۷ھ کی ایک غزل ملتی ہے ۔ ان اعداد و شمار سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس نسخہ (نسخے) کی نقل و کتابت دیوانِ زادہ کی ترتیب سے پہلے اور ۱۱۵۴ھ تک کے آس پاس ہوئی ۔ اسی سنہ کے تین سال بعد ۱۱۵۷ھ ملتی ہے ۔ بہرحال اتنا تو مسلم ہے کہ یہ مخطوطہ ۱۱۵۸ھ سے پہلے لکھا گیا ۔ »

اس اقتباس سے قارئین کیا سمجھیں گے ، کہنا مشکل ہے . کم ازکم میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ جب ۱۱۵۷ ھ کی ایک غزل کا خود مرتب ذکر کررہا ہے تو پھر اسے مخطوطے کو ۱۱۵۴ھ کے آس پاس کی تحریر کہنے پر اصرار کیوں ہے ؟ معلوم ہوتا ہے فاضل مرتب دیوان حاتم کو قدیم ثابت کرنے کی دھن میں بوکھلا گیا ہے اور اسی بوکھلاہٹ میں ادھر ادھر کی ہانک رہا ہے . ۱۱۵۸ھ سے پہلے کا کا دعوا بھی کھوکھلا ہے کیوں کہ اگلے ہی جملے میں فاضل مرتب کا فرمان ہے :

« ایک دوسری قباحت بھی سامنے ہے . دیوان زادہ کی رو سے ۱۱۶۱ ھ کی رو ۱۱۶۷ ھ (کذا) کی ایک غزل اس نسخے میں موجود ہے . ترقیمہ کی عبارت میں ۱۱۵۸ھ کی موجودگی سے کسی شبہے کی گنجایش باقی نہیں رہتی . »

جب ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۷ھ کی غزلیں مخطوطے میں موجود ہیں تو یہ ۱۱۵۸ھ سے پہلے کا مکتوبہ ہو ہی نہیں سکتا . ترقیمے میں ۱۱۵۸ھ کی موجودگی محض ایک فریب ہے . بھلا دیوان آبرو کے ترقیمے کا اطلاق دیوان حاتم پر کیوں کر ہوسکتا ہے ؟ اب اسے مرتب کی معصومیت کہیے یا جسارت ، بہرحال یہ ثابت ہے کہ مرتب جسے دیوان قدیم کہ کر اولیت کا شرف بخشنا چاہتا ہے وہ قدیم دیوان نہیں ہے .

ص ۵۱ « نسخۂ لاہور میں ۱۱۵۴ھ اور نسخۂ لندن میں ۱۱۴۵ ھ درج ہے . یہاں بھی ہندسے متضاد ہیں . »

« متضاد » نہیں متخالف یا بالعکس کہیے ، ورنہ ہندسے الٹ گئے ہیں لکھیے .

« ... محمود آباد کے نایاب ذخیرے کی ملکیت ہے . »

ایک موجودہ ذخیرے کو « نایاب » کہنا درست نہیں یہاں مرتب کی مراد نادر اور بیش قیمت سے ہے . « ذخیرے کی ملکیت » بھی عجیب ہے .

« لیکن بیشتر کلام کا حصہ ۱۱۶۹ ھ کے لگ بھگ نقل کیا گیا . »

کلام کا بیشتر حصہ نہ کہ « بیشتر کلام کا حصہ » ۱۱۶۹ھ کا ہے نہ کہ « نقل کیا گیا ہے . »

« دیوان زادہ کا یہ نسخہ بھی مرتب کی نگرانی میں تیار ہوا . »

« مرتب » کی نہیں ، مصنف کی نگرانی میں .

« بعض اشعار کا قدیم متن بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے قدیم متن کے اعتبار سے یہ نسخہ اہم ہے . »

مرتب کا مافی الضمیر واضح نہیں ہے .

ص ۵۲ ۔ «انھوں نے اس دیوان کی ترتیب میں بھی پہل کی لیکن انجام نہ پاسکا۔»
«انجام نہ پاسکی»

ص ۵۲ ۔ ۵۳ «نسخہ رام پور میں بھی ۱۱۸۹ھ کا اضافہ شدہ کلام حواشی میں درج ہے۔»
۱۱۸۹ھ تک کا اضافہ شدہ کلام

ص ۵۳ «کسی حد تک یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دیوان زادہ مصنف کے مطالعے میں بھی رہا ہے یا ان کی «نظر سے گزر چکا ہے»
«مطالعے» میں رہنے کا کوئی ثبوت نہیں۔ «نظر سے گزر چکا ہے» کافی تھا۔
«یہ دیوان زادہ کے تمام نسخوں میں سب سے زیادہ مکمل اور معتبر ہے۔»
مکمل ہونا تسلیم، معتبر ہونا محتاج ثبوت ہے، بلکہ غیر معتبر ہونے کا ثبوت خود مرتب نے فراہم کردیا ہے، کیوں کہ اختلاف نسخ کی صورت میں اس کے اندراجات کو ترجیح نہیں دی گئی۔ یہ نسخہ لاہور کا ذکر ہے جسے ۱۱۹۵ھ میں تیار کیا گیا کہا ہے۔ لیکن اس میں ۱۱۹۷ھ تک کا کلام ملتا ہے۔
«انتخاب سخن کی موجودگی میں ایک اور نسخے کی طرف نشاندہی کی جاسکتی ہے»
کس «انتخاب سخن» کی موجودگی میں؟ نسخے کی نشاندہی یا «نسخے کی طرف نشاندہی»؟

ص ۵۴ «انتخاب دیوان شاہ حاتم میں پیش نظر نسخہ کا ذکر نہیں»
اگرچہ غزلوں پر سن (سنہ) تصنیف لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔»
انتخاب دیوان شاہ حاتم سے مراد حسرت موہانی کا کیا ہوا انتخاب ہے۔ اس میں «پیش نظر» نسخے کا ذکر نہ ہونے سے کیا مراد ہے؟ جب کہ خود مرتب کے مطابق ان کے نسخے میں غزلوں پر سنہ کا اندراج نہیں ہے۔ دراصل «پیش نظر» نسخے سے مرتب کی مراد نسخۂ لاہور ہے جو جملے سے متبادر نہیں۔

ص ۵۵ ۔ ۵۶ «اس طویل نثری تحریر کے استناد پر زیادہ اعتماد سے گفتگو نہیں کی جاسکتی کیوں کہ کلام حاتم کے جتنے نسخے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں کہیں یہ عبارت نہیں ملتی۔
خط کشیدہ ٹکڑوں کی زبان درست نہیں۔ کلام حاتم کا اب تک ایک بھی مکمل

نسخہ دستیاب نہیں ہوا ، دیوان زادہ بھی انتخاب ہے اور مرتب کا ذاتی نسخہ بھی ، اس لیے کلام کے «جتنے بھی نسخے ملے ہیں» کہنا درست نہیں ۔ شاہ کمال نے جو «نثری تحریر» نقل کی ہے اسے انہوں نے دیوان شاہ حاتم سے منتخب کیا تھا اور دیوان حاتم کا کوئی نسخہ اب تک نہیں ملا ۔

ص ۵۶ «اگرچہ کچھ اشعار کا تکرار بھی ملتا ہے ۔»

اشعار کی تکرار نہ کہ «کا» ۔

حاتم کے باقیات و آثار کے اس مختصر جائزہ (جائزے) سے پتہ چلتا ہے کہ ذاتی خطی نسخہ سبھی نسخوں سے قدیم اور اہم ہے ۔

یہ «اہم» اس لیے نہیں کہ انتخاب کنندہ ایک معمولی کاتب ہے جسے درست و غلط اشعار کی بھی تمیز نہیں اور «قدیم» اس لیے نہیں کہ جب تک یہ بہ یقین معلوم نہ ہو کہ یہ نسخہ کب لکھا گیا تب تک اس کا قدیم ہونا مشکوک ہے ۔

بارھویں صدی کے فرد و سماج کے انبساط و انحطاط کی مختلف کیفیات حاتم کی شخصیت کے تصویر خانے میں دیکھی جاسکتی ہیں ۔»

کیا «فرد» سماج کا حصہ نہیں ہوتا ؟ اگر ہوتا ہے تو «فرد و سماج» لکھنا غلط ۔ انبساط و انحطاط مہمل ۔ شخصیت میں دیکھی جاسکتی ہیں کافی تھا ۔ فاضل مرتب نے شخصیت کو «آرٹ گیلری» بنا دیا ہے ۔

«بیرونی مناظر سے گریز و گرفت کی کش مکش حاتم کی قلندرانہ بے نیازی اور بانکپن میں موجود ہے ۔»

بیرونی مناظر سے «گریز و گرفت» غور طلب ہے ۔

«اس دور کے احوال و کوائف کا دل گداز اجتماع و انحراف ۔ ۔ ۔»

دل گدازی کی صفت نہ «اجتماع» میں ممکن ہے نہ «انحراف» میں ۔

«شخصیت روز و شب کے اعمال و افکار کی ترتیب و تربیت سے بنتی ہے ۔»

کیا دوپہر اور سہ پہر کے «اعمال و افکار» اس سے خارج ہوتے ہیں ؟ اگر اعمال و افکار غیر مرتب اور تربیت یافتہ نہ ہوں تو کیا شخصیت نہیں بنتی ؟

«قول و فعل کی یہی ہم آہنگی شخصیت کو ناپنے کے لیے ایک بڑے پیمانہ و قدر کا درجہ رکھتی ہے ۔»

«بڑے» اور «قدر» اصراف بے جا ہے ۔

ص ۵۷ «فن پارہ صرف اس کی قوت تخلیق کا ہی نہیں بلکہ پوری شخصیت کا بیش و کم و کاست اظہار ہوتا ہے ۔»

مرتب کا بے کم و کاست"، کے معنی سے ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ فن پارہ (جو یہاں شعر ونظم کے مترادف ہے) اگر شاعر کی شخصیت کا بے کم و کاست اظہار ہوتا تو سوانح نگاری کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ حق تو یہ ہے کہ شخصیت کا بے کم وکاست اظہار تو سوانح میں بھی ممکن نہیں۔

"اس کے ذہنی افتاد . . ."

اس کی ذہنی افتاد۔

"جس پر تاریخ کے جبر کا زور نہیں چلتا"

"جبر کا زور" محل نظر ہے۔

"عصری احساس و تقاضوں کو . . ."

احساس اور تقاضوں کو۔

"فارسی کو جو عزت و عروج حاصل تھا اس کی موجودگی میں اردو زبان کو ذریعۂ اظہار بنانا شخصیت و سیرت کو قربان کرنے کا خطرہ مول لینا تھا۔ لیکن مردِ خود آگاہ کی طرح ان کی دوربین نگاہیں اردو کے مستقبل اور مقبولیت کا بھرپور ادراک کرچکی تھیں۔"

دعوا بے دلیل ہے۔ حاتم سے پہلے ولی، مظہر اور خود آبرو اردو میں شعر کہہ رہے تھے۔ (ولی سے بہت پہلے اہل دکن نے اس کا آغاز کردیا تھا) فائز وغیرہ معاصرین بھی اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بناچکے تھے۔ اگر ان کی شہرت کو کوئی "خطرہ" پیش نہیں آیا تو حاتم کو کیا خطرہ درپیش تھا؟ "شخصیت و سیرت" حشو محض ہے۔ اردو کے تابناک مستقبل کا ادراک حاتم سے پہلے لوگوں کو بھی تھا ورنہ وہ اردو کو منہ ہی کیوں لگاتے۔ خان آرزو لوگوں کو اردو میں شعر کہنے کا مشورہ ہی کیوں دیتے۔ مستقبل کا ادراک وجدانی ہوسکتا ہے۔ لیکن "مقبولیت" کا اندازا تو مشاہدے ہی پر منحصر ہے اس لیے آخری جملے میں "مقبولیت" بے ضرورت ہے۔

"اس عہد تک اردو بول چال کی سرحدوں سے نکل کر تصنیف و تخلیق کی زبان میں ڈھل چکی تھی لیکن اب بھی علمی و ادبی کتابوں کی تصنیف و تسوید کے لیے فارسی ہی کو معیار سمجھا جاتا تھا۔"

اس سے پہلے اقتباس کے "درپیش خطروں" کو بھول جائیے اور اس تازہ انکشاف پر نظر رکھیے۔ "سرحدوں" نہیں "حدوں"۔ "زبان میں ڈھلنا" کہاں کا محاورہ ہے؟ کیا "تخلیق" غیر ادبی ہوتی ہے اور اگر نہیں تو "علمی و ادبی کتابوں" کا کیا

مطلب ہے ؟ « علمی کتابیں فارسی ہی میں لکھی جیاتی تھیں » کی جگہ « تصنیف و تسوید کے لیے فارسی ہی کو معیار سمجھا جاتا تھا » کہنا اصراف بےجا ہے۔

« فارسی ہندوستان میں بہر حال ایک بیرونی زبان تھی اور مادری زبان کا درجہ نہ لے سکی تھی۔ »

جملے بےربط ہیں۔ « مادری » کی بجائے ملکی یا ہندوستانی مناسب ہوتا۔

« اہل ہند کی فارسی دانی کے کم مائیگی کے نتائج ہیں۔ »

« احساس کم تری » بجائے « کم مائیگی »۔ جملے کی ساخت بھی غلط۔

ص ۵۸ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوچکا تھا مگر دیوان ولی کی آمد نے نئی تحریک و توانائی بخشی۔ »

جملے کی بے ربطی سے قطع نظر دعوا محتاج ثبوت ہے ولی کا دیوان ۱۱۳۲ھ میں دہلی پہنچا (شروع یا اخیر میں اس کا کوئی پتہ نہیں) لیکن وہ خود اس سے بہت پہلے دہلی آئے تھے اور یہاں کے شعرا کو متاثر کرگئے تھے۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز آمد ولی سے ہوتا ہے نہ کہ دیوان ولی کی آمد سے۔ اگر مرتب کا دعوا تسلیم کرلیا جائے تو انہیں شاہ حاتم کی ان غزلوں کی جو ولی کی زمین میں ہیں اور جن کی تاریخ تخلیق انھوں نے ۱۱۳۱ھ بتائی ہے، کوئی توجیہ پیش کرنا ہوگی۔

« یہ کلام — نو عمر شعرا کے لیے چراغ رہ گزر ثابت ہوا »

« چراغ راہ » کو « چراغ رہ گزر » کہنا فصاحت و بلاغت کی گردن پر چھری پھیرنا ہے۔

« عرس، محفلوں، میلوں میں بازار عکاظ کے عرب قبیلوں کی شاعری کا جوش پرخروش اور ان کی نوک جھونک کا سماں نظر آنے لگا۔ »

فاضل مرتب کا مقصد یہ ہے کہ دہلی کی محفلوں اور میلوں وغیرہ میں بھی بازار عکاظ کا سا سماں نظر آنے لگا جس کی روح رواں دور جاہلیت کے عرب شعرا تھے لیکن مندرجہ عبارت سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہے جیسے عرب قبیلے شاعری اور آپس میں نوک جھونک کررہے ہوں۔

دہلی میں ہر پیشہ (پیشے) اور طبقہ (طبقے) کے نمایندہ شعرا دکھائی دینے لگے۔ »

« نمایندہ » کا حرف بےمحل ہے۔ ہر طبقے اور ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ شاعری کر رہے تھے، درست لیکن یہاں « نمایندہ » شعرا کی صفت لگتی ہے

«حاتم بھی ... آبرو ... مظہر ... تاباں ... ناجی ... اور
یکرنگ جیسے معاصرین کے ہم نشین ہوگئے :»

قافیے کی کھٹک پیدا کرنے کے لیے تو «معاصرین» کے ساتھ «ہم نشین» ٹھیک ہے ورنہ ہم نشینی سے ہم پیشگی و ہم مشربی ظاہر نہیں ہوتی۔ اب اس ضمن میں چند بے دلیل دعوے اور بے ربط و بے معنی مگر مسلسل جملے ملاحظہ ہوں۔ بے ربطی اور «مہملیت» پر تبصرے کی بجائے ان کے نیچے خط کھینچ دیے گئے ہیں۔

ص ۵۸-۵۹ «انھوں نے وسعت خیال اور پیرایۂ بیان میں تنوع کے امکان کا جائزہ لیا اس امکان کی گرفت و گیر میں سچے اور بھرپور اظہار کے لیے زبان کی تنگ دامانی کا احساس تھا۔ ایک نئی زبان کو بھی فروغ دینا پڑا۔ زبان جو اردو کے فطری آب و رنگ سے میل کھاتی ہو۔ اور نرم و لطیف جذبہ و احساس کی ادائیگی میں پیچھے نہ ہو۔ ذخیرۂ الفاظ کو بھی وسعت دینی پڑی۔

ص ۵۹ «عوامی بول چال کو معیار مقرر کیا گیا۔ یہی زبان کا فطری بہاؤ (بہاو) صحیح میلان اور اصولی تقاضا تھا (معلوم نہیں کس نے معیار مقرر کیا اور ایہام گوئی کے دور کی صفت گری کو عوامی بول چال کی زبان ٹھہرانا کہاں تک روا ہے ؟) الفاظ کے مرقعے بول چال کے صوتی نظام سے مربوط تھے۔ عوام کی زبان خراد یا ٹکسال تھی۔ (؟) اسی خراد پر الفاظ بنتے یا ڈھلتے تھے۔ پھر قبول عام میں چلن پاکر درجہ اسناد کو پہنچے تھے۔ (پہنچتے تھے) یہی زبان اور تلفظ شاعری میں تخلیقی عمل کا فطری جز قرار پایا (؟)

شاعری اسلوب و ادا کے ساتھ زبان کی فطری سادگی میں اس طرح گھل مل گئی کہ قدما کے زبان و بیان کی سب سے بڑی خصوصیات قرار پائی صحیح اور سچے فطری جذبات سادہ و سلیس عوامی زبان کے خمیر میں شامل ہوئے تو اسلوب و زبان کا حسن دوچند ہوگیا زبان عبوری دور سے گزر چکی تھی (؟) لفظوں کا صوتی نظام (؟) تصرف و تحریف سے گزرکر مستند ہوچکا تھا (؟) معیار عوامی زبان

نهی کتابی یا علمی زبان نہیں اس لیے اس دور کی شاعری میں اسلوب و اظہار کا فطری میلان جاری ہے۔ (۹) اس پر مرصع کاری، تکلف کی رنگ آمیزی نہیں ہوئی۔ (یہ الہامی جملہ ان تمام علما کا منہ چڑا رہا ہے جو دور ایہام گوئی کے تکلف و تصنع کے شاکی ہیں) حاتم کی شاعری زبان و بیان کے اس فطری میلان کا ایک مرکزی دھارا ہے جس کی سبک روی اور نرم خرامی میں زبان کی رفتار ترقی کا راز مضمر ہے۔ (ناقدین ادب اور ماہرین علم زبان متوجہ ہوں)۔ ان کے جذبہ و احساس کی سادگی سچی زبان میں گھل کر جوئے رواں کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ زبان کی ناہمواری بھی خس و خاشاک کی طرح گھل مل کر معدوم ہوجاتی ہے۔

دعوے کی لغویت سے درگزر کیجیے، خس و خاشاک کا گھل مل کر معدوم ہوجانا ملاحظہ فرمائیے۔ خس و خاشاک کو مرتب شاید دھول مٹی سمجھتا ہے جس کا گھل مل جانا ممکن ہے۔ خدا جانے قارئین مجذوب کی اس بڑ کو کہاں تک معنی پہنا سکیں گے مجھے تو اس کا مصنف غالب کا یہ مصرع دہراتا محسوس ہوتا ہے
ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ص ۶۰ « حاتم کا کلام زبان و بیان کی ابتدائی صورت اور ارتقائی تبدیلی کی وجہ سے اردو کی لسانیاتی تاریخ میں سب سے اہم دستاویز ہے جس کے سنجیدہ مطالعہ کے بغیر اردو کی کوئی لسانی و ادبی کوشش کارآمد نہیں ہوسکتی۔ »

ادباء اور ماہرین لسانیات متوجہ ہوں۔

« وہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے پہلے اداشناس بھی ہیں جو زبان اور اس کے متعلقات پر گہری نظر رکھتے ہیں »

ہماری معلومات کے مطابق سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ہیں اگر مراد شمالی ہند سے ہے تو پہلے صاحب دیوان ہونے کی بات ابھی پایۂ ثبوت پر نہیں پہنچی، ع اب تلک پر زباں نہیں ہے درست، کے اعتراف سے قطع نظر، زبان کے پہلے ادا شناس ہونے کی تغلیط خود مرتب نے اگلے ہی جملے میں کردی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

«دیوان قدیم کی ترتیب کے بعد مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک اور عوام کے مزاج نے فارسی و عربی کے زیر اثر زبان کو روز مرہ کے مطابق ڈھالا. حاتم نے بھی ضرورت محسوس کی. قدیم الفاظ و املا کو نئی صورت دی.

گویا. مرتب کو مظہر کی تحریک کا اعتراف ہے جس سے متاثر ہوکر حاتم نے بھی اصلاح زبان کی ضرورت محسوس کی. املا کو نئی صورت میں کس طرح ڈھالا. اس کی کوئی مثال غالباً مرتب کو نہیں مل سکے گی.

«وہ جمہور جو ابھی صوتیات کی تراش خراش کی خاطر میں نہیں لارہی تھی.»

«جمہور» مذکر ہے. «صوتیات کی تراش خراش» بھی خوب ہے.

ص ٦١   «بول چال کی یہ زبان لب و لہجے (لہجہ) میں تبدیل ہوچکی تھی.»

کیا مطلب؟

«اس کا تعلق لغت سے کم تھا»

مرتب کس لغت کی بات کررہا ہے. اس دور میں لغات کہاں! اور ان سے سند لینا معلوم!

«یہی لب و لہجہ شاعری میں رائج تھا. جس کی وجہ سے فن میں فطری سادگی و پرکاری کے مرقع دکھائی دیتے ہیں.»

معنی عبارت فی بطن المرتب. اگلے چند جملے غالباً ماہرین لسانیات کی رہنمائی کے لیے لکھے گئے ہیں:

«صوتیات میں آواز ہی اصل ہے باقی فروعات ہیں. اور آواز وہ جو استعمال عام میں ہے. اسی آواز سے زبان کی تشکیل ہوتی ہے.»

«حاتم نے ایسے الفاظ کے تلفظ کو اصل املا سے مطابقت دی ہے. گویا تقریر و تحریر کا فرق بے بنیاد دکھائی دیتا ہے.»

«اصل املا سے مطابقت» دینا کیا ہوا؟ علاوہ ازیں الفاظ کے تلفظ کے مطابق لکھنا اہل دکن نے شروع کیا نہ کہ حاتم نے. حاتم تو ولی کا دیوان دیکھ چکے تھے، کیا اس میں یہ خصوصیت نہیں تھی. تقریر و تحریر کا فرق کس کو بے بنیاد دکھائی دینے لگا؟

« بعض مخصوص عربی الفاظ کا تلفظ ہمارے لیے مشکل رہا ہے
(دو ایک مخصوص لفظ نقل کرتے تھے) لیکن قدما نے ان کی تحریری
شکل میں تصرف کرکے اردو کے مزاج سے ہم آہنگ کیا تھا جو
بعد کی اصلاحات کے پیش نظر کالعدم قرار دیے گئے (کیا کالعدم
قرار دیے گئے؟)
ہائے مختفی کی الگ اور انفرادی صورت نہیں ہوتی (اگر صورت
نہیں ہوتی تو یہ « ہ » کیا ہے؟) بلکہ ماقبل کی حرکت کو سہارا
دیتی ہے۔

ممکن ہے مرتب « صورت » کی جگہ صوت لکھنا چاہتا ہو۔ « انفرادی » بےضرورت ہے۔

ص ۶۱ ـ ۶۲ « چوں کہ گفتگو میں ہائے مختفی کی آواز میں فرق مشکل سے
دکھائی دیتا ہے اس لیے الف کا بے تکلف استعمال (بے تکلف، الف کا
استعمال نہ کہ « الف کا بے تکلف استعمال ») ہوتا رہا ہے ... لیکن
اس استعمال میں ضرورت شعری ہی کار فرما ہے، اور قافیہ (قافیے)
کی رعایت کا بھی التزام ہے »

اس میں وزن کی ضرورت اور قافیے کی مجبوری کار فرما ہوتی ہے۔ «قافیہ کی رعایت کا بھی التزام ہے » بےمعنی ہے۔

ص ۶۲ « اس کے علاوہ لالہ کی جگہ لالا ملتا ہے »

یہ ایہامی ضرورت کے پیش نظر اور قافیے کی مجبوری کے سبب سے ہے ورنہ ایک آدھ شعر کو چھوڑ کر حاتم کے یہاں ہر جگہ « لالہ » ہی ملتا ہے۔

« زبان کی فطری ساخت اور تقاضوں کے تحت عربی و فارسی
ذخیرۂ الفاظ کو مزاج اردو کے مطابق تحلیل کیا گیا۔ یہ ایک بڑا
کام تھا۔ اس طرح ہندی لفظوں میں تصرف و تبدیلی کرکے اردو کے
خمیر میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی (خمیر غالباً قالب کو کہتے
ہیں!) اردو زبان بھی ان ہی رشتوں سے وجود میں آئی تھی۔ »

اس پوری عبارت میں کسی رشتے کا ذکر نہیں۔ « خمیر میں ڈھالنا » غالباً کوئی رشتہ ہے؟

« حاتم کے کلام میں ہندی آب و رنگ زبان کی حد سے گزرکر
لب و لہجے (لہجہ) میں منتقل ہوگیا ہے (؟ کیونکر) یہ لب و لہجہ

ہندی کا نہیں بلکہ خالص اردو کا اپنا لب و لہجہ ہے۔»

«خالص اردو کا اپنا» نہیں بلکہ اردو کا اپنا یا خالص اردو کا لب و لہجہ ہے۔

«یہ دل‌کشی دو تہذیبوں کے امتزاج و ارتباط کا دل نشیں مرکب ہے۔»

معجون مرکب اور جہل مرکب تو سنا تھا یہ «دل‌نشیں مرکب» غالباً کوئی ایجاد ہے؟

ص ۶۳ «ہندی کے یہ الفاظ ان کی شاعری کے عام مزاج اور پہلوداری پر روشنی ڈالتے ہیں۔»

حاتم کا جتنا کلام اس نسخے میں شامل ہے، زیادہ نہیں، فاضل مرتب اس میں صرف پانچ پہلودار شعر ہی دکھا دیں۔

«یہ انداز تخاطب یا طرز گفتگو زبان کے فطری پن اور مزاج و تعلق کا بھی پتہ دیتی ہے۔»

مزاج اور تعلق زبان کا؟ اگر ہاں، تو کس سے؟

ص ۶۴ «... صوتی تکرار نے غزل میں نغمہ و آہنگ کی مخصوص جھنکار پیدا کی»

ان الفاظ و تراکیب کے لیے مرتب کو ایک فرہنگ بھی کتاب میں شامل کرنا تھی۔

«غزل کی شاعری میں یہ ایک نئی آواز، نیا تجربہ اور خوش آیند روایت تھی جس میں بے انتہا وسعت و دل‌کشی تھی۔»

ممکن ہے مرتب کے لیے یہ روایت ہو۔ جن اشعار کو نئی آواز اور نیا تجربہ کہا گیا ہے، ولی کے یہاں اس قسم کے ہندی الفاظ سینکڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے لہذا اسے نیا تجربہ کہنا غلط۔ دل‌کشی کی حد تک مان لیا لیکن وسعت کے معنی مرتب کو لغت میں دیکھ لینا چاہئیں تھے۔

«جذبہ و احساس کی سادگی اور بے‌تکلفی کو کسی تصنع و آرائیش (آرایش) کے بغیر اس زبان میں پیش کیے جانے کا رجحان حاتم کے ہاں نمایاں ہے۔»

«سادگی و بے تکلفی» کو «تصنع و آرایش کے بغیر» سے مطلب؟ پیش کرنے کو «کیے جانے» کہنا عجز ہے یا اسراف بے‌جا۔

«حاتم کا یہ اسلوب فن انفرادی آواز بن سکتا تھا لیکن زمانے کے نشیب و فراز اور زبان میں نت نئی تبدیلیوں نے اس طرز میں

استقامت پیدا نہ ہونے دی»

اس میں زمانے کے نشیب و فراز کا کیا دخل؟ اب کچھ متضاد دعوے بلا تبصرہ پیش کیے جاتے ہیں

۱۔ «فطری اسلوب و زبان کا دل دادہ ایہام گوئی کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر اپنی صلاحیتوں کو قربان کردیتا ہے اور ان کی انفرادیت اندیشہ وگمان سے دو چار ہوجاتی ہے۔»

ص ۶۵ ۲۔ «وہ جب لفظوں کے بیچ و خم یا رعایت سے دو چار ہوتے ہیں تو شاعری میں حسن آفروری اور ترکیب تاثیر شدت احساس کو تیز کردیتی ہے۔ زندہ و بیدار لفظوں کے پیکروں سے حقیقی تصویریں ابھرنے لگتی ہیں اور ذہن و خیال میں مرتسم ہوجاتی ہیں۔»

۳ مکراوتا، جھڑ پاونا، سے معنی میں مستعمل ہے چڑھانے کو چلانے لکھا گیا ہے اڑیاں پڑیاں وغیرہ الفاظ بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ مخطوطہ (مخطوطے) میں الفاظ ممدودہ کی آواز کے لیے دو الف کا استعمال عام دکھائی دیتا ہے۔ کملائی بھی مستعمل ہے ان لفظوں کی آمیزش سے آہنگ میں انفرادی لے دکھائی دیتی ہے»

دعووں کے تضاد و تناقض سے قطع نظر یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ یہ تمام جملے مسلسل و بالترتیب نقل کیے گئے ہیں لہٰذا ان کی بے ربطی کی ذمہ داری ناقل پر نہیں۔

«ترشی ہوئی ترکیبوں کے حسن سے فن میں ایک جوت جگمگانے لگتا ہے۔»

جوت جگمگانے لگی ہے نہ کہ «لگتا» ہے۔ مثال میں تین شعر پیش کیے گئے ہیں لیکن اتفاق سے ان میں سادہ ترکیب بھی موجود نہیں ہے چہ جائے کہ «ترشی ہوئی تراکیب۔» قارئین خود ص ۶۵ - ۶۶ ملاحظہ فرمائیں۔

ص ۶۶ «حاتم کے کلام میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ضرب المثل کی صورت میں زبان زد ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔»

«زبان و بیان کی اس دل کشی نے خدائے سخن میر کے لیے زمین ہموار کی اور ابلاغ و اظہار کے جہاں ممکنات کا عرفان دیا۔» (کس کو؟)

یہ دعوے جن اشعار کے لیے کیے گئے ہیں ان میں ایک شعر یہ بھی ہے:

پانے بے وجود سے خلا کیوں تھا؟ آگہی۔ ابلاغ (مزے) کیا ہوا
کاش میر کے لیے زمین ہموار کرنے اور انہیں ابلاغ و اظہار کا جہانِ ممکنات عطا کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب مندرجہ بالا شعر پر سید کی اصلاح بھی ملاحظہ فرمالیتے۔ یہی وہ شعر ہے جس کے لیے میر نے «آتشک میں مبتلا ہونے» کی پھبتی کسی ہے۔

«لفظوں کی صوتی حرکت میں بھی یہ آزادی ہوتی گئی»

«صوتی حرکت» کیا ہوتی ہے؟

ص ۸۷ «اردو کی سرشت میں ہندوستانی تہذیب اور اس کے متعلقات کے سرچشموں کا سراغ مشکل ہیں۔»

اس جملے کا کوئی مطلب نہیں۔ ویسے جس مقصد کے حصول کو مرتب مشکل بھی نہیں سمجھتا، وہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

«یہ زبان اور ادب دونوں سطح پر ہندی تہذیب و تلمیحات کے علائم سے گراں بار ہے۔»

اول تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ «یہ» کا اشارہ کس کے لیے ہے۔ پھر دونوں سطحوں سے کیا مراد ہے؟ «تلمیحات کے علائم» کیا ہوتے ہیں؟ «گراں بار» اس سے پہلے بھی غلط استعمال ہو چکا ہے۔ ایک سیدھی سی بات کو ایک الجھے ہوئے انداز میں بیان کرنا شاید کمال فن ہے۔ مرتب کو کہنا صرف یہ تھا کہ اس دور کے ادب اور زبان دونوں میں ہندی تہذیب کا اثر ملتا ہے اور ہندی تلمیحات کا استعمال بہ کثرت ہوتا ہے۔ لیکن چیستاں سازی کے شوق نے بات کہاں کر دی۔ اگلا جملہ اس سے بھی عجیب ہے۔

«ایک فطری تقاضا تھا جس سے کوئی زبان بھی چشم پوشی نہیں کرسکتی۔ اس کی سرشت و سیرابی میں اس سر زمین کا بہت زیادہ دخل رہا ہے (یہ کس سر زمین کا ذکر ہے؟ سرشت و سیرابی میں کیا تعلق ہے؟ اور فطری تقاضا کیا تھا؟) خاتم کے جہاں ان تہذیبی و تلمیحاتی علامتوں میں روز و شب کی تپش اور گداز کا ہر پور تجربہ شامل ہے جو ان کی زندگی کا جز بن گیا تھا (یعنی چہ؟) مشرق و مغرب کی دو عظیم تہذیبوں کے اس دل نشین اتصال سے ہندوستان کی دوسری زبانیں محروم ہیں۔»

معلوم ہوتا ہے مرتب شعور کی رو قسم کی کسی تکنیک سے کام لے رہا ہے۔

« وسطِ ایشیا کے قافلے یہیں لٹتے ہیں اور دل دے بیٹھتے ہیں۔

قافلوں کا «لٹنا» تو سمجھ میں آتا ہے، «دل دے بیٹھنا» نہیں۔

ص ۶۸ « یہ محبوب ارضی اور سچی تصویریں پیش کرتا ہے۔ »

« تصویریں پیش کرتا ہے » سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کسی مصور کا ذکر ہے؟ بے ربط اور مہمل جملوں کی وہ فراوانی ہے کہ ہر سطر پر

ع کرشمہ دامنِ دل می‌کشد کہ جا اینجاست۔ کا عالم ہے۔ قارئین خود پورا مقدمہ پڑھ کر اس کی تصدیق کرسکتے ہیں۔ فی الوقت ادھر اُدھر سے کچھ جملے پیش کیے جاتے ہیں۔

ص ۶۹ « حسن پرستی، خوش نوائی اور کج ادائی کی عام فضا شاعری میں موجود ہے۔ »

« حسن پرستی کی فضا » تو خیر گوارا ہے لیکن « خوش نوائی » وغیرہ کا تعلق تصویر کشی سے نہیں انسان سے ہوتا ہے

« یہ پری پیکر حسن و نظر افروزی کا مرقع لیے ہوئے ہیں جس کا سراپا فارسی شاعری کے تصورات سے محض روایاتی بن جاتا ہے۔ »

اس عبارت کے معنی شاید خود مرتب ہی سمجھ سکتا ہے۔

«حاتم کا محبوب ادا و ناز و دل بری میں بانکا ہے۔ اس کی سراپا نگاری میں حاتم نے کلاسیکی سرمایہ صرف کیا ہے »

« دل بری میں بانکا ہے » سے قطعِ نظر یہ عرض کردینا بے جا نہ ہوگا کہ اس انتخاب میں کوئی سراپا نہیں ملتا اگر مختلف غزلوں میں اس کے کچھ خدو خال بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں تو اسے سراپا نگاری سے تعبیر کرنا درست نہیں « کلاسیکی سرمایہ صرف کیا » سے کیا مراد ہے؟

ص ۶۹-۷۰ « یہ سراپا ناتمام رہتا ہے بات کمر تک پہنچتی ہے۔ ساری توجہ چہرے پر ہے (کمر تک بات پہنچ کر چہرے پر کیونکر پلٹ آئی؟) اور اسی میں بھی آنکھوں کی تشبیہ و تمثیل زیادہ پر کشش محسوس ہوتی ہے (خود آنکھیں پر کشش ہیں یا تشبیہ و تمثیل؟) یہ بھی اسی تہذیبی بانکپن کی علامت ہے جس میں تاک جھانک۔ اشارہ و کنایہ انتہائے عشق ہے گویا عشق کی رسائی آنکھوں تک ہے۔ شاید اس سے زیادہ

بوس وکیری کی اجازت بھی نہ تھی۔

یہ لڑکھڑاتا ہوا بیان «یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں» کا مظہر ہے۔ «بوس گیری» شاید ماہی گیری قسم کی کوئی چیز ہے۔ یہ پورا صفحہ اس سیاسی انتشار بلکہ خلفشار کا شکار ہے جس کا بیان مرتب نے کیا ہے۔ قارئین کرام خود ملاحظہ فرمالیں۔ اس سلسلے کا آخری بیان یہ ہے:

> ص ۷۰-۷۱ «اس دور کی زندگی ایک دوئی یا دوہرے پن سے دو چار ہے۔ اس دوہرے پن نے کردار میں بھی کھوکھلا پن پیدا کیا۔ جس سے قدریں پامال ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے نظر فریب تبدیلیاں واقع ہوئیں۔»

قدروں کی پامالی سے افسوس ناک، حیرت ناک یا عبرت ناک تبدیلیاں تو واقع ہوسکتی ہیں۔ «نظر فریب تبدیلیاں» کیوں کر واقع ہوئیں؟
الفاظ کے اس بے محل صرف سے بچنے کے لیے سلف میں بلاغت کی تعلیم دی جاتی تھی۔

> ص ۷۱ «دل و نظر کے سفینے کو راہ فرار پر ڈال دیا۔»

سفینے راہوں پر نہیں دریاؤں میں ڈالے جاتے ہیں۔

> «اس سے بھر پور اور زیادہ معنی خیز شعر وہ ہے جسے اصلی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔»

گویا اس سے پہلے جتنے شعر پیش کیے گئے ہیں وہ «نقلی صورت» میں تھے۔

> حاتم کے یہاں یہی مرزائی تہذیب اور اس کے بانکپن کے دوسرے سبھی انداز بھی موجود ہیں۔

«بھی» کی کیا ضرورت تھی؟

> «یہی مجلسی زندگی خواہ شعر کی ہو یا بزم طرب کی، زندگی کا مقصود اور نشاط زیست کا مرکزی ادارہ بن چکا تھا۔

«شعر کی مجلسی زندگی» بھی خوب ہے۔ نشاط زیست کا مرکزی ادارہ یعنی چہ۔ «بن چکی تھی» نہ کہ «بن چکا تھا۔»

> ص ۷۲ «حاتم نے ایک جگہ سپاہی پسر کہہ کر (کیسے؟) اس پر اسرار وغیرہ کو بھی افشا کردیا جو محمد شاہی دور کی خوش فعلیوں کا مرکز التفات تھا
>
> ع پہنیتہ لعل ترے سر پہ وہ سر پیچ زری پگ میں جوتا ہے پٹے دار کٹیاں جاتا ہے

پہن کر بر میں بت تنگ بستی جاماں ، ملک گیری کے زمیں دار کہاں چلتا ہے»

رمز اور وہ بھی پراسرار ! بہرحال یہ آج ہی معلوم ہوا کہ خوش فعلیاں کیسی رمز سے بھی کی جاسکتی ہیں۔ «مرکز التفات» بھی عجیب مرکب ہے۔ اس کے علاوہ ان اشعار میں «سپاہی پسر» قسم کی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ مرتب کو مثال میں وہ اشعار پیش کرنے تھے جن میں محبوب کو سپاہی پسر کہا گیا ہے۔

«زمانہ و زندگی کی مایوسیوں کے باوجود وہ نغمہ سنج ہیں، نوحہ خواں نہیں؛ ان کا لب و لہجہ بھی متاثر ہوا۔»

جب مایوسیوں کے باوجود وہ نغمہ سنج ہیں تو ان کا لب و لہجہ کیوں کر متاثر ہوا؟ یہ متاثر نہ ہونے کا مقام ہے

ان کا دوست بھی خنجر بدست ہے۔ آن بان ان کا شیوۂ زندگی ہے، یہی بانکپن اسے طرح دار بناتا ہے۔

یہی کی وجہ سے یہاں «دوست» محبوب یا معشوق کے معنی نہیں دیتا۔ «ان کا» کی جگہ «اس کا شیوۂ زندگی» کہنا تھا۔

ص ۴۳ «پوری تہذیب اور اس کا انداز فکر جمال ہم نشیں کی طرح روشن ہے۔»

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے؟ «جمال ہم نشیں کی طرح روشن ہے» سے کیا مراد؟ یہ مہملیت، جا و بےجا اشعار کی نثر بنا کر اسے فقروں میں کھپانے کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا فقرہ لکھتے وقت مرتب کے ذہن میں یہ شعر در آیا

ع جمال ہم نشیں در من اثر کرد وگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ص ۴۴ «ولی کے کلام میں ایہام کی مثالیں موجود ہیں۔ مگر تعداد و کیفیت کے اعتبار سے وہ اتنی متحرک نہیں ہوسکتیں۔»

«ہوسکتیں» کیوں «ہیں» کیوں نہیں؟ «تعداد کے اعتبار سے متحرک» ہونا بھی خوب ہے

«زبان و بیان کا اسلوب فطری حسن و سادگی سے بھرپور ہے۔»

«زبان و بیان» یا اس کا «اسلوب»؟

«متقدمین اس روایت کی اثرآفرینی سے محفوظ نہ رہ سکے»

«اثر سے» نہ کہ «اثرآفرینی» سے۔

ص ۴۴-۴۵ «یوں بھی ذخیرۂ الفاظ میں ہندی اثرات سے بھی لحن خیال کی توثیق ہوتی ہے۔»

دوسرا «بھی» فاضل ہے [illegible]

ص ۷۵ «ہندی فارسی لفظوں کی ترکیب سے بھی زبان دانی اور قدرت استعمال کا مظاہرہ ایہام گوئی کے پردوں میں ہوا۔»

قدرت کلام یا «قدرت استعمال»؟ «ایہام گوئی کی صورت میں ہوا» بہتر تھا، اگر مرتب کو «پردوں» سے زیادہ دلچسپی تھی تو «پردے میں» کہنا تھا، «پردوں میں» نہیں۔

جس طرح جسمانی قوت بازو کا اظہار . . .

کیا «روحانی قوت بازو» بھی ہوتی ہے؟

«ایسے الفاظ کی ترکیب سے معنی قریب مراد نہیں ہوتا بلکہ دار و رسن کی جگہ ذہنی کرتب و کرتوت کی آزمایش ہوتی ہے۔ جیسے مورکھ کی ترکیب یا حاتم کے یہاں . . .»

ایہام کی تشریح میں دار و رسن کی درازدازی سمجھ میں نہیں آئی۔ غالباً مرتب کے ذہن میں غالب کا مصرع گونج رہا تھا ع «جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے۔» جسے اس نے بےسوچے سمجھے نثر میں کھپا دیا۔ «کرتوت» شاید مرتب کے نزدیک «کرتب» کا مترادف ہے۔ «مورکھ» کی ترکیب سے غالباً «مورکھتا» کا مظاہرہ مقصود ہے۔ ویسے یہ «مورکھ» مقدمۂ دیوان آبرو سے اڑایا گیا ہے۔

«دوسری صورت میں ایسے لفظوں کی کثیر تعداد دکھائی دیتی ہے جو دونوں زبانوں میں سند ہیں مگر مفہوم مختلف ہے»

دونوں زبانوں میں «مستعمل» نہ کہ «سند»

ص ۷۶ «ایہام کے التزام سے اشعار بوجھل نظر آتے ہیں اور طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ جمہور کا مزاج تھا اور حاتم جمہور کی مطابعت سے مجبور تھے۔»

دوسرا جملہ فضا میں معلق دکھائی دیتا ہے۔ پہلا جملہ لکھتے ہوئے مرتب یہ بھول گیا ہے کہ وہ اسے «خوش گوار» روایت قرار دے چکا ہے نیز ولی کے ایہام کو حاتم کے مقابلے میں «غیر متحرک» کہہ چکا ہے۔

«رعایت لفظی ایک صوتی حسن پیدا کرتی ہے۔»

«صوتی حسن» سے غالباً مرتب کی مراد «صوری» حسن ہے۔ ورنہ «صوتی حسن» کیوں کر پیدا ہوتا ہے۔

«حاتم کے اشعار میں نرمی و نازک نغمہ و آہنگ کی کمی دکھائی دیتی ہے (؟) وہ خوش الحان ضرور ہیں مگر شاعری میں خوش نوائی

کا یہ آہنگ کمزور دکھائی دیتا ہے۔"
حاتم موسیقار تھے نہ مغنی۔ ان کی خوش الحانی سے مرتب کی کیا مراد ہے؟
خوش نوائی کا اظہار نغمے میں تو ہوسکتا ہے شعر میں نہیں غالباً خوش گوئی اور
خوش کلامی کو مرتب خوش الحانی و خوش نوائی سے تعبیر کرتا ہے
ص ۷۷ " متقدمین کا یہ دور ایہام گوئی کی صداؤں سے گونج رہا ہے۔
ایہام گوئی کی وجہ سے زبان و بیان میں غیر فطری رنگ جھلکنے لگا۔"
جملوں کی بے ربطی سے درگزر کیجیے
" پہلودار لفظوں کی تلاش و دلچسپی کے ساتھ ساتھ ہندی لفظوں کا
استعمال اور چلن ایہام کی مقبولیت میں معاون ہوا . . . اور یہ ایک
شعوری میلان کی صورت میں نمودار ہوا یہ ایک پسندیدہ شعوری
میلان تھا۔"

ان جملوں کی بے ربطی اور لغویت کی حد تک ابہام سے قطع نظر جس بات کی طرف قارئین کی توجہ منعطف کرانا مقصود ہے وہ بیان کا تضاد ہے۔ طبیعت میں انقباض پیدا ہونے کی بات آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، " غیر فطری رنگ کی جھلک " بھی آپ نے دیکھی۔ اس پر طرہ مرتب کا اسے ایک پسندیدہ اور شعوری میلان قرار دینا ہے۔

" سبک ہندی کی شاعری اہل زبان کے ادبی اکتسابات سے فرو تر
سمجھی گئی اور اسلوب و آہنگ کو بھی غیر مستند کہا گیا "

" سبک ہندی " سے اس کے علاوہ بھی لوگ واقف ہیں اور اس کا صحیح استعمال بھی جانتے ہیں۔

ص ۷۷-۷۸ " تلاش مضمون تازہ کی روش نے پیچیدہ گوئی کی طرف
رہنمائی کی اور ذہنی معمہ کا عمل شروع ہوا۔"

" ذہنی معمہ کا عمل " کیا ہوتا ہے ؟ " پیچیدہ گوئی کی طرف رہنمائی " بھی خوب ہے۔

ص ۷۸ " حاتم نے جمہور کی اتباع کی "
" اتباع " مذکر ہے

صفحہ ۸۰ " تقریباً پچاس سال کے بعد یہ شاعری کھٹکنے لگی۔"
کیسے کھٹکنے لگی؟

" ایسے رجحانات سے پتہ چلتا ہے کہ جلد ہی ایہام گوئی کے خلاف شدید
تحریک شروع ہوگئی۔"

«رجحان» بے ضرورت ہے۔ شدید نفرت کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ نفرت کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ نا پسندیدگی کی بات اور ہے۔

«الفاظ و معانی کے ارتباط پر توجہ دی جارہی تھی۔(؟)، اردو کو فارسی سے قریب تر اور بازاری زبان کی سطح سے اٹھاکر کتابی اور اشراف کی زبان میں ڈھالنے کی بھر پور کوشش تھی۔»

«کتابی زبان میں ڈھالنے کی کوشش» کیا؟ اور کیا مرتب کے خیال میں اشراف کی زبان کتابی ہوتی ہے؟

ص ۸۰ «۱۱۴۹ھ میں مرہٹہ پیشوا بالاجی راؤ دلی پر بے دردی سے حملہ آور ہوا۔»

«بے دردی» حشو ہے۔ کوئی بھی ہمدردی سے حملہ آور نہیں ہوتا۔

«ہر فرد سراسیمہ ہوکر زندگی کے اچھے دن بھول گیا۔»

حالاں کہ ایسے میں اچھے دنوں کی یاد زیادہ آتی ہے۔

شعر و سخن کے ساتھ نشاط زیست کے سارے ٹھکانے ویران نظر آنے

«نشاط زیست کے ٹھکانے» کیا؟ کیا شعر و سخن بھی ٹھکانوں میں شامل ہیں؟

«حاتم نے طولانی زندگی میں کیسے کیسے اور کتنے مدوجزر کا مشاہدہ کیا۔»

«اپنی طویل زندگی میں» نہ کہ «طولانی زندگی میں»۔ «کیسے کیسے» کا مقام ہے صرف «کیسے» کا نہیں۔ «مشاہدہ کرنے» اور دیکھنے میں فرق ہے۔

ص ۸۱ «سید برادروں کی سازش فرخ سیر کا قتل، پیہم بیرونی و اندرونی حملوں کی پیکار نے حاتم کی فکر و نظر کو غم آگیں بنا دیا۔»

سید برادران بادشاہ گر مشہور تھے۔ صرف سازش کہنے سے متبادر ہوتا ہے جیسے انھوں نے کوئی ایک سازش کی تھی۔ یہاں «سازشوں» کہنا چاہیے تھا۔ بیرونی حملے ہوتے ہیں اندرونی کے لیے خانہ جنگی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ «حملوں کی پیکار» کیا ہوتی ہے؟ حاتم کی فکر کو غم گیں «بنایا» یا «غم آگیں»؟ «نظر» کی کوئی ضرورت نہیں۔

«قناعت کرکے قسمت کے بیچ بیٹھا رہے۔»

قناعت پر قناعت کرکے بیٹھ رہنے کو قسمت کے بیچ بیٹھ رہے کہنا عبرت انگیز ہے۔

«حاتم نے حرص و ہوس کو راہ نہ دی۔ قسمت پر قانع رہے۔»

ے ادب ، بمبئی

نکرار بےجا سے قطع نظر حرص و ہوس « کو کہاں راہ نہ دی ۔

ں ۸۲ « ان کی قلندری و بانکپن میں نو آگہی کے بھر پور شعور نے

دل گداز بصیرت عطا کی ۔«

بانکپن میں بھرپور شعور « » دل گداز بصیرت « اور » شعور میں بصیرت عطا « کرنا

چھوٹا انداز بیان ہے ۔

» دل گداز بصیرت کے اظہار کو اپنی تخلیق کا اصل الاصول سمجھا ۔

ان کی غــزلوں میں اس اظہار کی بڑی دل کش بے حجاب ایمائی

تصویریں ملتی ہیں ۔«

» بے حجاب « اور » ایمائی تصویروں « کا یہ اجتماع ضدین کرشمہ ہے

ص ۸۳ » کہیں کہیں یہ رجحان دعــوت تبلیغ و ہدایت کی شکل اختیار

کرلیتا ہے ۔ «

» دعوت « کی کیا ضرورت تھی ؟

» حاتم پر ان کے معتقدات کی گرفت وگیر سخت ہے «

» گرفت « سے معنی واضح ہیں » گیر « مہمل ہے ۔

» فکری ساخت اور الھان میں یہ تصور گہرے انہماک کے ساتھ ملتا ہے ۔«

» کس کی الھان « ؟ » تصور کا گہرا انہماک « کیا ہوتا ہے ؟

ص ۸۴ » ان میں (لفظوں میں) تسلسل خیال . بیان کی روانی کے ساتھ

ساتھ بڑھتا ہے ۔ «

معمہ ہے ۔

» یہ غزلیں نقش گری کی بہتر تصویریں پیش کرتی ہیں ۔ «

» نقش گری کی تصویریں « کیا ؟

» قوت بیان کا جوش اور خروش احساس قابل ذکر ہے «

» احساس کا خروش « کیا ہوا ؟

ص ۸۵ » ان کا شہر آشوب ایک تصویری اور عہد آفریں نظم ہے «

» تصویری نظم « نظم کی کون سی قسم ہوتی ہے ؟

» اس میں ایک سو دس اشعار موجود ہیں ۔ «

اگر نظم میں کل ایک سو دس اشعار ہیں تو » موجود ہیں « کہنے کی کیا ضرورت ہے ؟

» شہر آشوب میں سماج کی مکروہ و معیوب تصویر کے خد و خال کا

ایک پہلو پیش کیا گیا ہے جو زشت روئی کے ساتھ قابل نفریں بھی ہے۔

تصویر کے بجائے اس کے خد و خال کا صرف ایک پہلو پیش کرنا ، پھر پہلو کو « زشت رو » کہنا اور اسے « زشت روئی کے ساتھ قابل نفریں » قرار دینا فاضل مرتب ہی کا حصہ ہے۔

> « ان نظموں میں سماجی کیف و نشاط کی جو ایماں فروش تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ دوسری جگہ نایاب ہیں ۔ »

دشمن ایماں یا غارت گر ایماں کو « ایماں فروش » کہنا عجز بیان ہے ۔

ص ۸٦ حاتم کا کلام درحقیقت اپنے عہد و احساس کا ایک نگارخانہ ہے ۔

اپنے عہد کا ، اپنے عہد کے احساسات کا ، یا اپنے احساسات کا ، یہ « اپنے عہد و احساس کا » نگار خانہ کیا ہوا؟ مقدمے کا آخری جملہ ہے :

> « قلندر کی یہ بات مائل بہ زوال معاشرے میں ایک الہامی آواز سے کم نہ تھی ۔ »

کون سی بات ؟ اس کا پتہ قارئین کرام دیوان حاتم کا مقدمہ پڑھ کر خود لگائیں۔

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر ۔ اختتام تک پہنچ کر تبصرے کے طومار ہوجانے کا احساس ہوتا ہے تو شرم سی محسوس ہوتی ہے ۔ اغلاط کی ایسی پوٹ پر قلم اٹھانا اس کی اہمیت کو بڑھانا اور اپنی حماقت کا اعتراف کرنا ہے ۔ اگر شروع میں احساس ہوجاتا کہ بات اتنا طول کھینچے گی تو ابتدا ہی نہ کرتا اور احساس ندامت سے بچ جاتا ۔ مگر یقین کیجئے یہ ناممکن تھا ۔ آپ خود اسے پڑھ کر دیکھیے ، آپ کو اس کے کلاسیکی شاہکار ہونے کا اندازا خود بہ خود ہوجائے گا ، دیوان غالب اور امراو جان ادا کی طرح ۔ جیسے امراو جان ادا کو جتنی بار پڑھیں ہر بار نیا لطف آتا ہے ۔ اور غالب کے اشعار کو پڑھ کر ہر بار معنی کی نئی تہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اسی طرح اگر قارئین اس مقدمے کو بار بار پڑھیں تو ہر بار نئی نئی غلطیاں ان کے دامن نگاہ کو کھینچیں گی ۔ اور ہر جملے پر احساس ہوگا کہ

ع زیر ہر سطر عبارات ہیں لاکھوں محذوف بہر حال مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے (مرتب کو اس کے لیے راقم کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس مضمون کی اشاعت سے انکی تالیف کی مانگ بڑھ جائے گی اور طبع ثانی کی نوبت بھی آسکتی ہے جو ویسے زندگی بھر نہ آتی) لیکن جب ایک بار غلطی سرزد ہو ہی گئی تو اس کے Justification یا دل کی تسلی یا جھینپ مٹانے کے لیے کہہ لیجیے ، قارئین اک ذرا عذر تراشی کی اجازت دیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ عذر لنگ نہیں ہوگا

ہمیں "انتخاب حاتم۔ دیوان قدیم" کے مرتب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اغلاط کی یہ رپوٹ شائع کرکے اس جرات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے جو فی زمانہ ما یاب ہے۔ بلکہ اس میں قارئین کے لیے عبرت کے کئی پہلو موجود ہیں مثلاً اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان واقعی ختم ہورہی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جن کے ذمے زبان سکھانے کا فرض ہے وہ ایسی ناقص زبان کبھی نہ لکھ سکتے اور ہمیں شیخ سعدی کی یاد نہ دلاتے۔ ان اغلاط کی نشاندہی سے ہمیں مرتب کی اصلاح کا اتنا خیال نہیں جتنا اپنے پیشے کی عزت و ناموس کا۔ دوسرا عبرت انگیز پہلو یہ ہے کہ بلند بانگ دعــووں کے باوجود تحقیق کا وجود محض واہمہ ہے عملاً جو اس کا حال ہے وہ اس ترتیب سے ظاہر ہے عبرت کے علاوہ اس تصنیف یا تالیف میں قارئین کے لیے ایک تلقین بھی یعنی:

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اور آیندہ ایسے فعل ناستحسن سے توبہ کرو اور کان پکڑو۔ اسے دیکھ کر اگر یہ نہ سیکھ سکو کہ کام کس طرح کرنا چاہیے تو کم ازکم اتنا تو سیکھ ہی لو کہ کام کو کس طرح نہیں کرنا چاہیے۔

● ● ●

سپاس گذار ہیں ہم

● ان اہل قلم حضرات کے جن کے مقــالے نوائے ادب کے لئے بغرض اشاعت موصول ہوتے رہے ہیں

● ● ان ناشرین کرام کے جن کے ادارے کی نئی مطبوعات کی دو جــلدیں نوائے ادب میں برائے تبصرہ دستیاب ہوتی رہی ہیں اور

● ● ● ان اردو نــواز احباب کے جن کے توسط سے ادبی اور تعلیمی ادارے اور لائبریریاں نــوائے ادب کی خریداری منظور کرتے رہے ہیں۔

(مدیر)

* تنویر احمد علوی

بارہ ماسہ وحشت

یہ بارہ ماسہ شاید افضل کے بارہ ماسہ کے بعد اردو کا دوسرا قدیم‌تر بارہ ماسہ ہے۔ اس سے متعلق اطلاع سب سے پہلے میر حسن کے یہاں ملتی ہے جنہوں نے اپنے زمانے تک ریختہ گو شعرا کے جو طبقے قایم کیے ہیں ان میں وحشت کو طبقہ متاخرین میں جگہ دی ہے۔ تذکرۂ میر حسن میں وحشت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

(۲۸۸) میر بہادر علی از یاران میاں حسرت المتخلص بہ وحشت سید زادۂ خوش اوقات و نیک صفات جوان وضع دار در پیشۂ سپہ گری استوار اکثر درتعیناتی بہ طرف گورکھپور بہ جہت روزگار بر می برد طبع موزو نے دارد با فقیر بسیار آشناست بہ فرمایش یاران آن دیار بارہ ماسۂ دیگر مانند بکٹ کہانی گفتہ است حق تعالیٰ سلامت دارد ازوست۔

شب وروز وصل کو روئیے کہ عجب وہ لیل و نہار تھا
کبھی ہم سے یار کو لطف تھا کبھی ناز تھا کبھی پیار تھا
مرا دل ہو اشک ٹپک گیا جگر آہ و نالہ سے پک گیا
تو نظر سے جونہی سرک گیا میں اجل سے وونہی دو چار تھا

جبتک کہ کہیں نہ تھا ٹھکانا دل کو دشوار تھا اک قدم بھی جانا دل کو
کوچہ ترا دیکھا ہے، سو جانے کے لیے اب لحظہ بہ لحظہ ہے بہانہ دل کو[۱]

تذکرہ گلزار ابراہیم میں یہ روایت اس طور پر آئی ہے۔

---

* ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

۱ تذکرۂ میر حسن، ۱۸۹

وحشت میر بہادر علی ازمنسلکان سرکار نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم بود گویندکہ بارہ ماسہ بکٹ‌کہانی گفتہ اما بہ‌نظر مولف نرسیدازوست۔

وجیہ الدین عشقی کے یہاں وحشت کے ترجمہ کی روایت میر حسن یا علی ابراہیم سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے ویسے دونوں کے یہاں یہ روایت ایک معاصر روایت ہے لیکن عشقی نے ان کے بارہ ماسہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

(۴۱۳) وحشت تخلص، نامش میر بہادر علی جوانے سپاہی پیشہ زیبا وضع از یاران میر جعفر علی حسرت و منسلکان سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر است طبع مستمد و ذہن درست دارد[1]

اس کے ساتھ جو اشعار دیے گئے ہیں وہی اشعار ہیں جو میر حسن کے یہاں موجود ہیں مصحفی کے یہاں (تذکرۂ ہندی) انکا ترجمۂ احوال بےحد مختصر ہے صرف اتنا لکھا ہے:

« شاگرد جعفر علی حسرت فقیر اور اندیدہ ازوست »

آہ آگے تو نکلتی تھی جگر سے باہر اب جگر نکلے ہے خود دیدۂ تر سے
کیوں کہ تم گھر سے نہ نکلو گے میاں دیکھیں گے ہم نکالیں گے تمہیں لاکھ ہنر سے باہر
آہ کس طرح سے دیدار میسر ہووے پاؤں رکھتا ہی نہیں وہ کبھی در سے باہر
نکل گھر سے ذرا اے یار مجھ بیمار کی خاطر کھڑا ہوں منتظر کب سے ترے دیدار کی خاطر
جو کچھ ہم پر ستم کیجے بجا ہے کہ ہم نے تم کو اپنا دل دیا ہے[2]

تذکرۂ مجموعہ نغز میں انکا ترجمہ داخل ہے لیکن نہ اس کے ساتھ ان کا نام دیا گیا ہے نہ ان کے اس بارہ ماسہ کا کوئی ذکر آیا ہے۔ ہاں جعفر علی خاں حسرت کے تلمذ کی طرف اشارہ ضرور ہے (میر حسن کے بیان کے مطابق وہ حسرت کے شاگرد نہیں دوست ہیں) بہر حال مجموعہ نغز میں ان کا ترجمہ ان الفاظ کے ساتھ شامل ہوا ہے:

وحشت، تخلص عزیزیست صاحب مکنت از شاگردان میاں جعفر علی حسرت این ہفت بیت از گفتہائے اوست[3]

ان میں پہلے دو شعر وہی ہیں جو مصحفی کے یہاں شامل ترجمہ ہیں اس کے بعد پانچ شعر داخل ترجمہ کیے گئے ہیں۔

---

۱ ، ۲۵۲ ۲ تذکرۂ ہندی ، ۲۶۵

۳ مجمو نغز ، حصہ دوم ، ۲۹۵

مرے سامنے گروہ اک آن ٹھیرے　　تو آنکھوں میں آکر میری جان ٹھیرے
تری عقل ناصح بتا کیوں گئی ہے　　بھلا ہم تو دل دیکے نادان ٹھیرے
عجب یہ جنوں ہے کہ ہاتھوں سے جس کے　　نہ دامن رہے نے گریبان ٹھیرے
کہا میں کہ رونے سے وحشت نہ دیکھا　　جو اک دم تری چشم گریان ٹھیرے
لگا کہنے میں ضبط کرتا ہوں لیکن　　کہاں تک جگر میں یہ طوفان ٹھیرے[1]

اس کے بعد کے بعض تذکروں میں بھی وحشت کا مختصر ترجمہ داخل ہے عمدۂ منتخبہ «گلشن بےخار» اور «گلستاں بےخزاں» ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں. صاحب عمدۂ منتخبہ نے ان کو باشندۂ لکھنؤ لکھا ہے جو ان سے متعلق ہمارے مختصر دائرہ معلومات میں ایک گونہ اضافہ ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ان کے نام و نشان سے واقف نہیں[2].

گلشن بےخار کی روایت حسب ذیل ہے.

وحشت تخلص ار شاگرداں جعفر علی حسرت اسىت دیگر حالش معلوم نہ شد[3]
صاحب گلشن بےخار کے حریف قطب الدین باطن کے یہاں بھی انکا ترجمہ موجود ہے مگر لفاظی کے سوا اس میں شیفتہ یا ان سے کچھ پہلے آنے والے تذکرہ نگاروں پر کوئی اضافہ نہیں.

وحشت تخلص لاعلم جعفر علی حسرت سے تلمذ پایا سودائے فکر وحشت طبع کو سوئے وادی مضمون لایا۔ کیا خوب مضمون ہے جس کے اثر سے شہر کاغذ مثل ہامون ہے.»

آہ آگے تو نکلتی تھی جگر سے باہر　　اب جگر نکلے ہے خود دیدۂ ترسے باہر[4]

ان تراجم سے پتہ چلتا ہے کہ میر حسن اور نواب علی ابراہیم خان خلیل کے علاوہ جن کے تذکرے بارھویں صدی ہجری کے آواخر کی یادگار ہیں عشقی ان کے معاصر ہونے کے باوجود وحشت کے اس ادبی کارنامے (بارہ ماسہ) سے واقف نہیں جس کا میر حسن اور علی ابراہیم نے خصوصیات کے ساتھ ذکر کیا ہے. بعد کے تذکرہ نگار تو خود صاحب ترجمے کے ان کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں

---

۱ مجموعہ نغز، ۲۹۵　　۲ عمدہ منتخبہ، ۸۰۹　　۳ ۶۲۸ (طبع مجلس ترقی ادب لاہور)
۴ گلستان بےخزاں، ۲۷۹

وحشت کا زمانہ پیدایش کیا ہے اس کے بارہ میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ میر حسن کے معاصر ہیں لیکن اس سے ان کی صحیح عمر کا تعین مشکل ہے۔ علی ابراہیم خاں کے یہاں شامل ان کے ترجمہ کی روشنی میں جس کے ساتھ "بود" کا لفظ آیا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تذکـــرہ کی تکمیل ۱۱۹۵ھ یا اس کے قریبی زمانہ تک وہ وفات پاچکے تھے۔

ان کے ترجمہ نگاروں نے ان کے نام یا تخلص کے ذکر کے ساتھ صرف چند شعر نقل کیے ہیں اور بعد کے اصحاب تذکرہ نے تو ایک دو شعروں پر ہی قناعت کی ہے۔ ایسی صورت میں ان کے رنگ سخن کے بارہ میں کوئی تنقیدی گفتگو ممکن نہیں ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا طرز گفتار عاشقانہ تھا اور مضامین ہجر و فراق سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔

ان کا یہ اہم ادبی کارنامہ جسے رفتہ رفتہ بھلا دیا گیا (بگمان غالب) ہنوز غیر مطبـــوع ہے اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف کے پاس اردو کے تقریباً تمام مطبوعہ بارہ ماسے موجود ہیں اور بعض اہم بارہ ماسے ایک سے زیادہ مجموعوں میں شامل ہیں لیکن وحشت کے بارہ ماسہ کی کسی بھی روایت سے یہ سب مجموعے خالی ہیں۔

اس بارہ کی یہ واحد روایت اپنی جگہ مکمل ہے لیکن ترتیب شاید پوری طرح صحیح نہیں اس کا انداز تحریر قدیمانہ ہے یہ مصنف کا اپنا نسخہ نہیں ہے۔ اسے احمد خـاں نامی کسی شخص نے نقل کیا ہے جس کا اظہار اس مختصر تعلیقہ سے ہوتا ہے۔

بعت تمام شد نسخۂ بارہ ماسہ بدست فقیر حقیر پر تقصیر احمد خـاں بپاس خاطر مہربانان منشی رام نگارش یافت۔

اس سال سے تحریر کا پتہ نہیں چلتا لیکن اصل نسخہ کے کاغذ اور انداز نگارش سے یہ تخلیق پچھلی صدی ہجری کے نصف آخر کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ گ پر دوسرا مرکز موجود نہیں ضمہ اور کسرہ کی حرکت کو "و" اور "ی" سے ظاہر کیا گیا ہے الگ الگ لکھے جانے والے لفظوں کو ملاکر لکھا ہے۔ نقطوں کے اندراج اور ترتیب میں کوئی خاص اہتمام نہیں برتا گیا "ی" معروف اور "ے" مجہول میں کوئی امتیاز موجود نہیں کہیں کہیں ت، ٹ، میں بھی فرق نہیں کیا گیا یہ قدیم اسلوب خط کی عام خصوصیات ہیں جو دوسری قلمی تحریروں اور خطی نسخوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں انہیں میں اس سے کو "اسے" کی

شکل میں لکھنا بھی ہے۔ کاتب اگرچہ بد خط نہیں ہے مگر جگہ جگہ غلطیاں کرتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے کچھ حصے املا کیے ہوتے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں عــــرض کیا گیا ہے یہ بارہ مـاسہ اردو کے قدیم تر بارہ ماسوں سے ہے۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ اردو میں جتنے بھی بارہ ماسے ہیں وہ سب کے سب «لوک ساہیتہ» کی گیت پرمپرا سے جڑے ہوئے معلــــوم ہوتے ہیں اور ایک مستقل تصنیف کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ اس سے ایک آدھ کوئی ایسا بارہ ماسہ مستثنےٰ ہو سکتا ہے جو کسی ہندوی مہا کاویہ کے منظـوم ترجمہ کا حصہ ہو یا اس سے ماخوذ ہو۔

اردو کے یہ بارہ ماسے مختصر گیت نہیں اپنی جگہ پر مکمل عشق نامے ہیں اور انہیں بے تکلف اودھی، راجستھانی اور پنجـابی کے ان بارہ ماسوں کے مقـابلـہ میں پیش کیا جاسکتا ہے جو ان زبانوں کے پر بندھ کاویوں کا حصہ ہیں۔

زیر نظر بارہ ماسے بظاہر ریختہ کے معروف بارہ ماسہ نگار افضل کی تقلید میں لکھا گیا ہے لیکن اس کا فکری منصوبہ نہ صرف یہ کہ افضل سے مختلف ہے بلکـہ عـام بارہ ماسوں سے بھی اس کا انداز بہت کچھ الگ ہے بارہ ماسہ ہوتے ہوئے بھی یہ ایک ساقی نامہ معلوم ہوتا ہے۔ شروع سے آخر تک اس میں ساقی سے خطاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور تشنگی احساس اور طلب مئے کا ذکر بار بار شاعر کی زبان قلم پر آتا ہے اس میں ایک ایک کرکے سارے ہندی مہینے موضـوع ذکر و فـکر بنے ہیں لیکن یہاں تک موسمی کیفیات کے بیان یا «رتوورنن» کا سوال ہے وہ بڑی حد تک ساون بھادوں تک ہی محدود ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس بارہ ماسے کے شاعر کو موسموں کی تصویر کشی اور فضا و ہوا کی عکاسی سے زیادہ اپنے جذبات عشق کی ترجمانی سے دلچسپی ہے۔ ایک اور اہم بات جـو اسے دوسرے بارہ ماسوں سے الگ کرتی ہے وہ یہ کہ یہ سب بیان درد جدائی کسی فراق آشنا عورت کے منہ سے نہیں مرد کی زبان سے ہوا ہے جو سنسکرت، فارسی اور اردو شاعری کی عام روایت ہے اردو میں اس کی دوسری مثـال جو اپنی تفصیـلات میں اس سے بہت مختلف ہے، «بارہ ماسہ دستور ہــــند» میں ملتی ہے۔ اس کی ایک امتیازی خصوصیت یـہ بھی کہی جاسکتی ہے۔

کہ عام بارہ ماسوں کے روش کے برعکس محبوب سے ملاقات کنوار ماس میں ہو گی اس سے پہلے اور اس کے بعد کے مہینے «برہ ورنن» یا ہجراں نصیبی کی داستان پرغم سے متعلق ہیں مقامی مـاحول اور ریت رواجوں کا بیان بھی اس میں نہیں

ملتا یا یں ہم ایک بارہ ماسہ کے ادبی محاسن سے ، اس شعری تخلیق کو محروم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ اردو میں جذبات نگاری اور بیان غم فراق کا ایک اچھا مرقع ہے ۔

مخطوطہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے جس کے دائیں طرف «رب یسر» اور بائیں طرف «وتمم بالخیر» لکھا ہوا ہے۔ نظم بہت سے بارہ ماسوں کی طرح براہ راست تخاطب سے شروع ہوتی ہے

عزیزو کچھ نہ پوچھو حال میرا برا ہے اندروں احوال میرا

چونکہ اس بارہ ماسہ کی تخلیق دوستوں کی فرمایش کے زیر اثر ہوئی ہے اسلئے یہ حرف آغاز اور طرز گفتار غیر موزوں بھی نہیں آگے چل کر شاعر لکھتا ہے

جگر میں عشق نے آتش لگائی جلے ہے دل دہائی ہے دہائی
کسے میں حال اپنا جاسناؤں کوئی پوچھے تو کیا اس کو بتاؤں
ڈسے ہے دل جگر میں عشق کا ناگ میرے تن اور بدن میں لگ گئی آگ
مثال شمع سب تنکو گلایا جلایا عشق نے مجھ کو جلایا

شروع کے چند شعروں میں اپنے دل پر موسموں کے ستم ڈھانے کا بیان اس طور پر کیا ہے جو صرف چار رتوں سے متعلق ہے ۔

لگی ہے اگ اور جلتا ہے سینا نظر آتا نہیں اب مجھ کو جینا
نہیں گرمی میں حبیبے کی مجھے آس مجھ کے وصل بن بجھتی نہیں پیاس
جو آتا ہے کبھی ہولی کا ہنگام تو مجھ کو خاک اڑانا صبح اور شام
قیامت سر اوپر لاتی ہے برسات برستا ہے لہو آنکھوں سے دن رات
کبھی جو مور جنگل میں چنگھارے میں کہتا ہوں کدھر ہے تو پیارے
جو آتا ہے کبھی جاڑے کا موسم تو آہ سرد سے ہوتا ہے بے دم
غرض چاروں رتوں میں ہوں میں بےچین نہ لگتے کاش جوبوں سے مرے نین

معلوم ہوا کہ مردانہ عشق ہے اور اپنی عمومی روایت کے مطابق آزاد ہے شاعر کا محبوب کوئی من ہرن مرد ہے یا حوا کی کوئی حسین بیٹی اس کا صحیح اندازہ اس وقت بھی نہیں ہوتا جب ہم اسے شاعر کا شریک بزم دیکھتے ہیں اور عاشق وصل محبوب سے شاد کام ہوتا ہے وہاں وہ ایک وفادار محبوب ضرور ہے اور اپنے وعدے کے مطابق اپنے جاں نثار عاشق سے ملنے آتا ہے ۔ معشوق کی یہ وفا شعاری فارسی شاعری اور خود اردو شاعری کے تصور عام سے مختلف ایک تصور ہے اور اس اعتبار سے اس کے کردار میں ہندوستانیت کی ایک جھلک ملتی ہے ۔

وہ جس طرح اپنے وعدہ پر آتا ہے اسی طرح کچھ وقت گذرنے پر واپس چلا جاتا ہے (یا چلی جاتی ہے) اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد آنے والے ماس بیقراریوں میں گذرتے ہیں اور بارہ ماس کا سلسلۂ روز وشب ختم ہونے پر بھی لمحات انتظار ختم نہیں ہوتے اور شاعر یہ کہتا نظر آتا ہے :

ملاکر ایک دم مجھسے مرا یار کیا پھر مجھکو فرقت میں گرفتار

اس پہلو سے یہ نظم اردو شاعری کے اس دائمی جدائی کے تصور سے وابستہ ہے جس میں ایک دفعہ مل کر بچھڑتے ہیں تو پھر جیتے جی وصل محبوب نصیب نہیں ہوتا اور ایک بار دیکھ کر پھر ہزار بار دیکھنے کی تمنا باقی رہتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عارضی وصل بھی دائمی جدائی کے احساس کی شدت کو بڑھانے کا ایک مرحلہ ہے۔ ۔دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا کسی کے ساتھ عرض کیا جاچکا ہے ساقی نامہ کے اشعار نے اس کے سلسلۂ بیان کو ریشم کے دھاگوں کی طرح جوڑا ہے

اس کے تفصیلی جائزہ کا تو اس لیے موقع نہیں کہ یہاں اس نسخۂ نایاب کا اپنا متن پیش کیا جارہا ہے لیکن بعض اہم گوشوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ ان میں خصوصیت سے وہ فارسی اشعار قابل ذکر ہیں جو شاعر کے تصـــور عشق کی وضاحت کے لیے آئے ہیں :

عزیزاں عالمے را سوخت ایں عشقؔ — تیر غم جگر بردوخت ایں عشق
گہے رسوائے بازارم نماید — گہے از زیست بیزارم نماید
گہے دیوانہ گہہ فرزانہ سازد — گہے ہشیار گہہ مستانہ سازد
گہے از دیدہ ام خون ناب ایزد — گہے باجان و گہہ بادل ستیزد
برد از کعبہ و بت خانہ مارا — کشد از کفر و دیں بیگانہ مارا
گہے کافر گہے دیندار سازد — گہے مستانہ گہہ ہشیار سازد
بہر رنگے مرامی سرزد ایں عشق — فوں چندے مرا آموز و ایں عشق

موسمی کیفیات کے بیان میں اگرچہ کوئی خاص رنگا رنگی اس شعری تصنیف میں نہیں ملتی لیکن بعض چیتر بہت رنگین و دل آویز ہیں ہولی کی رنگ بازیوں کی مرقع کشی شاعر نے اپنے خون دل سے کی ہے اور اس طرح دوسروں کے مقابلے میں اس کے بیان میں ایک ندرت پیدا ہوگئی ہے۔

چل رائے دل دونوں ہم تم پھاگ کھیلیں — بہت سی جھولیوں میں خاک لیلیں

صبر اس خاک کا سر پر اڑاویں پر اک جنگل میں جا دھومیں مچاویں
لہو سے چشم کے کر خاک کو لال بناویں ہم گلال اور سر پہ لیں ڈال
نین کا خون کپڑوں پر چھڑک دیں سما اوس رنگ افشانی کا دیکھیں

ساقی نامہ کے اشعار اس ریشمی سلسلہ ہیں جگہ جگہ ٹوٹتے اور جڑتے ہیں اور دھنک کے نیم دائرہ کی طرح افق سے تابہ افق اس کو اپنے ہفت رنگ حلقے میں لیے نظر آتے ہیں۔

ارے ساقی کہاں تک میں کروں صبر مجھے اک دم کی ہے یہ زندگی جبر
ارے ساقی نہ کرنا جبر ظالم مرے جینے کی کر تدبیر ظالم
تجھے اس چیت کے موسم کی سوگند تجھے عاشق کے دل کے غم کی سوگند
تجھے اس گل کے کھلنے کی قسم ہے تجھے بلبل کے ملنے کی قسم ہے

چیت کے بہار آفریں موسم کے ذکر کے ساتھ ساقی نامہ کے رنگین اشعار ایک سا لطف دیتے ہیں۔ ہندوستانی مہینوں کا سوز و ساز سے بھرا تذکرہ اور اسی کے ساتھ ساقی نامہ کے اشعار کا جڑتا ہوا سلسلہ اردو شاعری میں در آتے ہوئے نئے رنگ و آہنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اساسی طور پر بارہ ماسہ کی فضا ہندوی ہے اور اس کے بغیر اس کا کوئی لطف نہیں لیکن شاعر کے اپنے ادبی مزاج پر فارسی شاعری کے گہرے اثرات کا پرتو موجود ہے۔ وحشت کے پیش رو افضل نے بھی فارسی اشعار سے اپنے ریختہ کی شاعری کو سجایا تھا اسکی زبان قلم پر آتے ہوئے فارسی شعر ریختہ گوئی کے مزاج کے عین مطابق تھے لیکن اپنے ہندوی اشعار میں افضل نے بارہ ماسہ کے فطری آہنگ اور اس کے مقامی رنگ کو متاثر نہیں ہونے دیا وحشت کے زبان و بیان اور اس سے زیادہ فکر و خیال پر فارسی کی چھاپ بہت گہری ہے۔

ماہ چیت سے متعلق یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گیا پھاگن اور آئی چیت سر پر کدھر ڈھونڈوں کہاں ہے میرا دلبر
گل و بلبل سے ہووےگی ملاقات سجن میرا جدا ہے تجھ سے ہیہات
پڑی ہے گل کے اوپر شکو شبنم ٹپکتی ہیں مری یہاں چشم پر نم
چمن میں لہلہاتا ہے جو شمشاد مجھے اس سرو کا آتا ہے قد یاد
کرے ہے سرو پر قمری جو فریاد مچاتا ہوں میں اوس دم داد بیداد
نظر پڑتی ہے جوں ہی نرگس زار مجھے یاد آوے ہے وہ چشم بیمار

گل اورنگ میں دیکھوں ہوں کھلتا مجھے یاد آوے ہے وہ فندق یا
مثال غنچہ ہے دل تنگ میرا سنو بلبل صفت آہنگ میرا

یہاں جو پھول کھل رہے ہیں جو خوشبوئیں مہک رہی ہیں اور جو آہنگ ہم سن رہے ہیں وہ فارسی شاعری کی صدائے بازگشت ہے اگرچہ اس دور کے باغات اور چمن زارونکی سیر کرنے والوں کے لیے یہ کوئی غیر ہندوستانی فضا نہیں ہے یہ سب رنگینیاں بھی تو اسی سرزمین بہشت آئین پر بکھری ہوئی ہیں۔

برسات کی بہاریں یہاں کی اپنی ہیں یہ جل تھل کہیں اور نظر نہیں پڑتے۔

چلی آتی ہے اب تو سر پہ برسات تغافل کا نہیں اب وقت ہیہات
چڑھا ساون گھٹا امڈی ہے گھنگھور کروں پی پی پپیہا سا چہوں اور
چڑھا ساون مگر پر دل کے لے فوج جو کوئی جیتا بچے اس میں کرت موج
کڑک بجلی سے بجتا ہے نقارا نقیب آمور جنگل میں پکارا
نشان اور بان لے کر بادلوں کے لگے جی جس سے پھٹ جاویں دلوں کے
پڑا مینہ اس طرح جیسے پڑے دھاڑ پڑے بوچھاڑ جیوں آہوں کی بوچھاڑ
کماں قوس قزح کی ہے نمودار لگاوے تیر ایسا وار اور پار
لیڑی اور پپیہا کوئل اور مور کریں چاروں طرف میدان میں شور

ون بھومی کی سی یہ فضا جو گھنگھور گھٹاونکی آمد کے ساتھ وابستہ کی گئی ہے ملک محمد جائسی کے یہاں پاوس رُتو ورنن کی یاد دلاتی ہے وہاں بھی امڈتے بادلوں کی گھن گرج میدان جنگ کی پر شور فضا کا عکس پیش کرتی ہے لیڑی پپیہا، کوئل اور مور خالص ہندوستانی پرندے ہیں ساون بھادوں کے اس پس منظر میں یہ حسین نظارہ بھی دیکھئے:

گھٹا کو دیکھ کر برسیں مرے چشم سجن کی دید کو ترسیں مرے چشم[1]
ہوا سب کوہ و صحرا بھر کے سرسبز نظر آوے ہے ہرسو بام و در سبز
بغل میں ہر کسی کے شیشۂ مے ہراک سو نعرہ و چنگ دفوے
ہر اک کے ہاتھ میں ہے شیشہ و جام ہراک کے پاس معشوق دل آرام

اس جل تھل اور موج بہار سے پہلے جیٹھ کا مہینہ گذرا ہے جس میں ہر طرف دھوپ ہی دھوپ نظر آتی تھی اور زمین آسمان سب توے کی طرح تپ رہے تھے۔

---

۱ یہاں چشم کو نین کی مناسبت سے غالباً مذکر باندھا گیا ہے۔

برستے آسمان سے ہیں انگارے چلے جاتے ہیں ہم الفت کے مارے
چمن میں جو ہرے اور سبز تھے روکھ وہ اب جاتے رہے اس دھوپ سے سوکھ
ہرن اس رت میں ہوجاتے ہیں کالے خدا اس دھوپ کے پالے نہ ڈالے
چلے دھرتی تلے اوپر پڑے دھوپ بھلا اب جینے کا ہے کون سا روپ
زمین دشت سوں جلتا توا ہے کوئی رکھے قدم امکان کیا ہے

یوں تو یہ سارا بارہ ماسہ ہی ایک فراق آشنا روح کی پکار ہے[1] لیکن کوار کا مہینہ اس کے لیے لمحات وصل کی خوشیاں لیکر آیا تو عاشق کا دل چاند کی چاندنی کی طرح کھل اٹھا ہے:

کنوار آیا گئے دن غم کے بھاری سجن کی گھر میں آپہنچی سواری
ہوے طالع بھلے دن غم کے بیتے نہ ہونے پائے کچھ دشمن کے چیتے
قدم رکھا سجن نے میرے گھر میں اجالا ہوگیا سارے نگر میں
کبھی صورت کو اس کی دیکھ رہتا کبھی دل کو مبارک باد دیتا
ادھر میں ہوگیا پی پی کے مدہوش ادھر وہ بے تکلف ہو ہم آغوش
ادھر شیشہ سے مے ہاتھوں میں چھلکے ادھر پیالے میں اس کا عکس جھلکے
بغل میں ماہ رو اور چاندنی رات کٹے اس طرح یاروں کی سب اوقات

ماہ اگھن کے بعد ماگھ اور پوس کا بیان بغیر ان مہینوں کا نام لیے ہوے کیا گیا ہے اور بہت مختصر ہے ویسے بھی اپنی موجودہ صورت میں یہ بارہ ماسہ کچھ بے ترتیب سا اور قدرے نامکمل نظر آتا ہے۔

آخر کے چند شعر یہ ہیں:

کہی ہر اک مہینے کی کہانی بہت آنکھوں نے کی اب خوں فشانی
نہیں حاجت مری بہ سعی بے حد «عرض نقشیے ست کزما یاد ماند
جو وحشت ہم مولیے یہ تو بجا ہے کہ ہستی را نمی بینم بقاے»

فارسی اشعار میں رضا تخلص آیا ہے۔

رضا در مثنوی ایں بہت خوش گفت عجائب نظم جوں ملک گہر سفت
چہ می پرسی زحال استر من مسی دائم چہ آمد برسر من

جس کے معنی یہ ہیں کہ فارسی اشعار کسی دوسرے شاعر سے اخذ کیے گیے ہیں اسکی زبان اس زمانے کی عام ادبی و شعری زبان سے قدرے مختلف اور بول چال کی زبان سے بہت قریب معلوم ہوتی ہے ہندی کا پٹ اس میں کچھ زیادہ نہیں

---

[1] اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ رضا کا بارہ ماسہ ہے۔

ہے لیکن آس، سیانے، نت، لگن، روکھ اگھن، سوں (कसम قسم) سوگ، جوگ سجن، بھبھوت، سمرن ساجن، جٹا، کیس، مندرا، برہ دھونی اچھر، سادھنا، پل، چھن، نین، جگ، دھرتی، روپ، بھاگ، (انگارے अगारे) لک، چھاند (بمعنی ماس मास) پکھیرو، بھسمنت، ساونت، (सावत) ناؤں، چھوں اور داڑ، دھاڑ، اچرج، پوچھاڑ جھڑ (جھڑی)، ہند ونت، جیوں (طرح) ککا، دوں (آگ) ساگر تال نکر وغیرہ۔

یہ اور اس نوع کے بعض دوسرے ہندوی الفاظ اس میں جگہ جگہ مل جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے یہ صورت حال ریختہ کے بدلتے ہوئے رنگ اور خود وحشت کے اپنے شعری مذاق اور ادبی مزاج کی طرف اشارہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی کے بعض ڈھیلے ڈھالے مصرعے اور مجھ پاس تجھ پاس قسم کی ترکیبی زبان کی قدیمانہ روش کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و تمم بالخیر

عزیزو کچھ نہ پوچھو حال میرا برا ہے ان دنوں احوال میرا
جگر میں عشق نے آتش لگائی جلے ہے دل دہائی ہے دہائی
کسے میں حال اپنا جا سناؤں کوئی پوچھے تو اس کو کیا بتاؤں
ڈسے ہے دل جگر کو عشق کا ناگ مرے تن اور بدن میں لگ گئی آگ
مثال شمع سب تن کو گلایا جلایا عشق نے مجھ کو جلایا
لگے ہے فصل گل میں آگ گلزار لگے ہے گل مری آنکھوں میں خوں خار
لگی ہے آگ اور جلتا ہے سینا نظر آتا نہیں اب مجھ کو جینا
نہیں گرمی میں جینے کی مجھے آس سجن کے وصل بن بجھتی نہیں پیاس
جو آتا ہے کبھی ہولی کا ہنگام تو مجھ کو خاک اوڑانا صبح اور شام
قیامت سر اوپر لاتی ہے برسات برستا ہے لہو آنکھوں سے دن رات
کہیں جو مور جنگل میں چنگھارے میں کہتا ہوں کدھر ہے تو پیارے
جو آتا ہے کبھی جاڑے کا موسم تو آہ سرد سے ہوتا ہوں بے دم
غرض چاروں رتوں میں ہوں میں بے چین نہ لگتے کاش خوبوں سے مرے نین
عزیزو عشق ہے یا آفت جان عزیزو عشق ہے یا خانہ ویران
کہیں اس درد کی دارو نہیں ہے نہیں اس درد کی دارو کہیں ہے

طبیب اس درد کی دارو نہ جانے
سیانے آپ پھرتے ہیں دوانے

کتابیں عشق کی پڑھ کر رکھا میں
ڈبو دیں اپنی ملا نے کتابیں

جسے ہو عشق کا سایہ زبوں ہے
کہ دنیا میں نہیں اس کا فوں ہے

جو کوئی عشق کے خم کا ہو ہے نوش
اٹھے روز قیامت کو بھی مدہوش

محبت کا جو کوئی جام پیوے
وہ متوالا ، جیوے پر نہ جیوے

نہیں یہ جام تو مشرب کا خاصا
وہ پیوے جو اجل کا ہو پیاسا ،

محبت حس کا ہو آئین مشرب
گنوادے اپنا وہ سب دین مذہب

اگر پوچھے عبارت اس سے کردار
تو وہ بولے کہ میں ہوں بندۂ یار

مجھے اک قطعہ یاد آیا ہے اس دم
کے چشم زخم کو کرتا ہے پر نم

کہ مجنوں شدبہ حلوت خانۂ خاک
ندا آمد بروا ز ایزد پاک

کہ اے مجنوں چہ آوردی بدرگاہ
برآمد از دل مجنوں یکے آہ

کہ چنداں شور لیلٰے در سرم بود
کجا پروائے کار دیگرم بود

عجب اس عشق کو ہے یاد افسوں
کہ یہاں حیراں ہے عقل فلاطوں

خدا بھی آپ عاشق ہے نبی کا
عجب ہے عشق صدیق ولی کا

اسی کے عشق میں حضرت عمر ہیں
اسی کے عشق میں شمس و قمر ہیں

اسی کے عشق میں عثماں سرور
اسی کے عشق میں ہیں شاہ حیدر

کہوں کیا عشق کی میں سحر سازی
کہ ہوجاوے حقیقی سے مجازی

لگے یہ عشق جا حس دل ربا سے
تو احسر کو ملا دیوے خدا سے

کرے یہ عشق ہی بیتاب و بے ہوش
کرے یہ عشق ہے سب کچھ فراموش

گریباں اس نے گل کا کردیا چاک
اسی نے نت رکھا بلبل کو غم ناک

اسی نے شمع کے تن کو گلایا
پتنگوں کا اسی نے جی جلایا

اسی نے سروقد کو کرکے بالا
گلے میں قمریوں کے طوق ڈالا

اسی نے کوہ کن کے سر کو پھوڑا
بندھایا خسرو اور شیریں کو جوڑا

اسی نے کردیا محمود کو خوار
ایاز اس سے ہوا اتنا طرح دار

اسی سے جاں بلب ہیں ہیر رانجھا
رہانت سی اور نینوں سے لانجھا (کذا)

غرض یہ عشق سوتوں کو جگاوے
جہاں میں نت نیا فتنا اٹھاوے

ارے ظالم سمجھ تو کیا ہے ہنگام
نہ کر تاخیر، جلدی جام بھر جام

تجھے اپنے مغاں کے سر کی سوگند
نہ کر مجھ پر درِ راحت کو تو بند

تجھے اس جام و مینا کی قسم ہے
تجھے گلرنگ صہبا کی قسم ہے

تجھے اپنے رخِ گلفام کی سوں
تجھے اپنے شراب و جام کی سوں

تجھے ہولی کے موسم کی قسم ہے　　تجھے اس چشم پر نم کی قسم ہے
تجھے اس میرے دل کی چاہ کی سوں　　شتابی بھر کے لا ما جام کی سوں
تجھے مے کے چھلکنے کی قسم ہے　　تجھے میرے بہکنے کی قسم ہے
مرا منہ دیکھ کر میرا پلاوے (کذا)　　مجھے رووے اگر جلدی نہ جاوے

[ماہ پھاگن]

چلا آتا ہے پھاگن کا مہینہ　　مجھے دو بھر نظر آتا ہے جینا
سجن بن تن بدن میں لگ گئی آگ　　اگر جیتے بچیں کھیلیں گے ہم پھاگ
چل اے دل دونوں ہم تم پھاگ کھیلیں　　بہت سی جھولیوں میں خاک لیلیں
عبیر اوس خاک کا سر پر اڑاویں　　ہر اک جنگل میں جادھومیں مچاویں
لہو سے چشم کے کر خاک کو لال　　بناویں ہم گلال اور سر پہ لیں ڈال
نین کا خون کپڑوں پر چھڑک دیں　　سما اس رنگ افشانی کا دیکھیں
ہمارے نین یہ جو خوں فشاں ہیں　　عجب ہی رنگ کی پچکاریاں ہیں
کھلا ہے آج ہر جنگل میں ٹیسو　　جگر کا داغ دکھلاویں ہم اور تو
ہمیں دلدار کی فرقت کا ہے سوگ　　چلیں جوگی بنیں ہم تم کریں جوگ
چل اب جوگی کا سانگ اپنا بناویں　　سجن کو شاید اس عنوان اتارویں (کذا)
بھبھوت اپنے بدن پر خاک سے مل　　مڑ ہی سے تن کی کہ جیتو نکل
لڑی سے آنسوؤں کی کر کے سمرن　　جپا کر ہر گھڑی ہر نام ساجن
جٹا رکھ سر پہ اور اپنے بڑھا کیس　　پہن منندر ایسا جوگیا بوں بھیس
برہ کی آگ سے دھونی لگاوے　　ہوا و حرص دنیا کی بجھاوے
لگادے جان میں آہوں کی دھونی　　ہونے پاوے کم بلکہ ہو دونی
دو تارا ہمدمی کا کر رگ و پوست　　بجھاویں اس میں یہ اچھر کہ پر دوست
نہ کھاویں چار دن کچھ ان پانی　　ہری ہر ، جپ اگر ہے دل میں ٹھانی
سجن کے ہجر کا کر دل میں تو سوگ　　اگر جوگی ہوا ہے سادھ لے جوگ
جو کوئی پوچھے تو کیوں جوگی ہوا ہے　　تو کہہ میرا سجن مجھ سے جدا ہے
ارے ساقی چلا ہولی کا ہنگام　　شتابی ہو کہیں تک جام بھر جام
ارے ساقی کہاں تک میں کروں صبر　　مجھے اک دم کی ہے یہ زندگی جبر
خدا کے واسطے مے دے شتابی　　مجھے دلدار بن ہے اضطرابی
مرا دلدار اب مجھ سے جدا ہے　　مرا جی زندگانی سے خفا ہے

ماہ چیت

چلے آتے ہیں سر پر چیت کے دن / مرا گھٹتا ہے جی بلبل گھڑی چھن
ارے ساقی نہ کر تاخیر ظالم / مرے جینے کی کر تدبیر ظالم
تجھے اس چیت کے موسم کی سوگند / تجھے عاشق کے غم کی دل کے سوگند
تجھے اس گل کے کھلنے کی قسم ہے / تجھے بلبل کے ملنے کی قسم ہے
نہ کرنا حیلہ تو زنہار زنہار / کہ پھرکر پھولتا ہے آج گلزار
تجھے اس میری زاریکی قسم ہے / تجھے اس بیقراری کی قسم ہے
تجھے جو چاہتا ہو اسکی سوگند / جو تیرا دل رہا ہوا اسکی سوگند
تجھے اس دل کے مشرب کی قسم ہے / تجھے اپنے ہی مذہب کی قسم ہے
تو کافر ہو اگر مے بھر نہ لاوے / یہودی ہو اگر جلدی نہ جاوے
بہار آئی ہے اب پھر بوستاں میں / خوشی ہے عیش ہے ہر جا جہاں میں
مرے دل میں اٹھا ہے جوش سودا / شتابی سے لے تو ایک جام بھر لا
عمل کر بیت پر اوستاد کے تو / بلاکر لے ......[1]
«بہار آئی دوانے کی خبر لے / اگر زنجیر کرنا ہے تو کرلے»

[ماہ بیساکھ]

گیا چیت اور ہے بیساکھ سر پر[2] / کدھر ڈھونڈھوں کہاں ہے میرا دلبر
گل و بلبل سے ہوویگی ملاقات / سجن میرا جدا ہے مجھ سے ہیہات
کھلے لالہ سے گل پھولا ہے سب باغ / دکھاؤں کس کو اپنے دل کا میں داغ
پڑی ہے گل اُپر شکو جو شبنم / ٹپکتی ہے مری یاں چشمِ پُر نم
چمن میں جوں جوں سنبل لہلہاوے / مجھے زلف اس کی ہمدم یاد آوے
چمن میں لہلہاتا ہے جو شمشاد / مجھے اس سرو کا آتا ہے قد یاد
کرے ہے سرو پر قمری جو فریاد / مچاتا ہوں میں اس دم داد بیداد
نظر پڑتی ہے جوں ہی نرگس زار / مجھے یاد آوے ہے وہ چشم بیمار
گل اورنگ جب دیکھوں ہوں کھلتا / مجھے یاد آوے ہے وہ فندق پا
کھلے جب گل تو ہووے دل مرا چاک / جو بلبل بولے ہوجاؤں میں غمناک
مثال غنچہ ہے دل تنگ میرا / سنو بلبل صفت آہنگ میرا

---

۱ مصرع کے باقی حصے کی قرأت ممکن نہ ہوسکی۔
۲ اصل میں یہ مصرع اس طور پر ہے گیا پھاگن اور آئی چیت سر پر، جو کاتب متن کا تسامح ہے۔ یہاں قیاسی تصحیح کی گئی ع

جنوں کا جوش ہے اس فصل گل میں ہر اک مدہوش ہے اس فصل گل میں
گریباں چاک یوں رہتا ہوں جوں گل زباں پر ہے فغاں مانند بلبل
جنوں ہے میں ہوں اور چاک گریباں دل وحشی ہے اور سیر بیاباں
کبھی ہنسا کبھی رونا کبھی غم کبھی شادی کبھی اندوہ و ماتم
کبھی ہے ہائے ہو اور بادہ نوشی کبھی یہ خون دل کرنا خموشی،
کبھی صحرا میں جاکر خاک اوڑانا کبھی آنکھوں سے جوئے خوں بہانا
کبھی بستی میں آنا زار رونا تو کھانا گالیاں اور سنگ طفلاں
عجب ہی طرح کا جوش جنوں ہے رواں آنکھوں سے میرا اشک خوں ہے
عزیزاں ایں چنیں سودا کہ دارد دل شیدائیے رسوا کہ دارد
زدرد ہجر کار من تمام است زعمرے خواب و خور برمن حرام است
نراز دنیا من آگاہم نہ از دین نہ دین خوش می دانم نہ آئین
مرا تا عشق خوباں کرد رسوا چو قیس آوارہ ام در کوہ و صحرا
رضا در مثنوی ایں بیت خوش گفت عجائب نظم چوں سلک گہر سفت
چہ می پرسی زحال ابتر من نمی دانم چہ آمد بر سر من
نہیں پہچانتا اپنا بیگانہ پھروں ہوں کوہ و صحرا میں دوانہ
کہاں ہے ساقی آجا تو کہاں ہے مری آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہے
تو کہتا تھا کہ جب بساکھ آوے تو میرا وندوں[1] میں وصل پاوے
تو مجھ کو کتنے بینگی گذریں گھڑیاں برہ کی ساعتیں ہیں سخت کڑیاں
ہر اک پل اشک آنکھوں سے رواں ہے گھڑی گھنٹا تو پھر کس کو گماں ہے
ہر اک دن ہے قیامت کا مجھے روز ہر اک شب ہے بلائے جان پر سوز
بلک[2] چھن چھن کٹے آنکھیں جھپکتے ہیں پتھرا گئے ہیں راہ تکتے
ہوا ہے انتظار آنکھوں کو جب سے نہیں لگتی پلک اک آن تب سے
شتابی کر ادھر اے جان پھیرا پڑا ہے تجھ بنا سب جگ اندھیرا
بیا اے روشنی بخش دو دیدہ کہ دل لے تو نہ خاک و خوں طپیدہ
بیا اے جان مشتاقاں کجائی کجائی آخر اے جاناں کجائی
ہجرت می دہم ....[3] نمی باید مرا ایں زندگانی

---

۱ ون، وس بمعنی ان اور اس قدیم دہلی کی بولی ٹھولی میں شامل تھا
کرخنداری میں اب بھی موجود ہے ع ۲ بمعنی بلکہ کوڑی میں ابتک رائج ہے ع
۳ « اماں حلانی » لکھا ہے جسکا اس موقع پر کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا

اگر چندیں جدا از من نشینی
مرا در خاک و خوں غلطاں بہ بینی

کجاہت آں وفات وعدۂ تو
بگفتی راست گاہے یکسر مو

گہے از وعدہ اش ایں نہ کردی
بجز جور و ستم ماشانہ کردی

کہاں ہے ساقی درمیان عاشق
مکاتی ہے نرے بن جان عاشق

کہاں ہے ساقی اے زخموں کے مرہم
شتابی آنہیں تجھ بن مرے ہم

ارے ساقی چلا بیساکھ ہے ہائے
وہ ظالم ، پر نہ آیا اب تلک ہائے

اب اس کے واسطے قاصد میں بھیجا
مرا اس غم سے جلتا ہے کلیجا

وہاں سے جب تلک قاصد پھر آیا
مرا جی تب تلک کیونکر رہیگا

مرا قاصد وہاں سے جب لگ آوے
قسم ہے تجھ کو گر تو مے نہ لاوے

شتابی جام میں وہ مے تو بھرلا
کہ جس سے بھول جاوے دین و دنیا

پیالے مے کی پی جاؤں میں گن گن
کسی عنوان سے کٹ جاویں یہ یہ دن

[ماہ جیٹھ]

مچائی جیٹھ نے سر پر مرے دھوم
لگے ہے پیاس اور سوکھا ہے حلقوم

تپش سے جیٹھ کی اب جی ہی جاوے
اگر پانی نہ موہن میں تو چواوے

گیا بیساکھ آئے جیٹھ کے دن
مجھے کب پیاس میری یار کے بن

ارے دل جیٹھ نے مجھکو ستایا
تو ہی چل واں سے قاصد تو نہ آیا

کہ ہم ہم ڈھونڈنے قاصد کو جاویں
کسی عنوان مطلب دکھا پاویں

کریں جا کوہ اور صحرا میں تالاش[1]
ملیں دل رہی سے قاصد ہی سے کاش

اگر پھرنا نصیبوں میں لکھا ہے
تو بہتر ہے ہمارا زور کیا ہے ،

اگر قسمت میں ہے یہ دھوپ کھانا
تم ہمکو بھی نہ ہرگز منہ پھرانا ،

کوئی بھی جیٹھ میں گھر سے چلے ہے
کہ اس موسم میں جنگل بھی جلے ہے

دہکتے ہیں پڑے سب کوہ و صحرا
تپش سے سوکھتے جاتے ہیں دریا

برستے آسماں سے ہیں انگارے
چلے جاتے ہیں ہم الفت کے مارے

چمن میں جو پرے اور سر نہے روکھ
سواب جاتے رہے اس دھوپ میں سوکھ

ہرن اسی رت میں ہوجاتے ہیں کالے
خدا اس دھوپ کے پالے نہ ڈالے

چھپے ہیں جانور پانی میں سر ڈال
چلے جاتے ہیں ہم جنگل میں خوشحال

مرے ہیں جانور پیاسوں کے مارے
عجب ہے دوستو طالع ہمارے

نصیبم کو دھوپ سو جوے ہے نہ کچھ چھاؤں
پھپولے پڑگیے اور جل گئے پاؤں

---

۱ دیہات وقصبات (مغربی یوپی) میں اب بھی بولا جاتا ہے ع

جلے دھرتی تلے اوپر پڑے دھوپ بھلا اب جینے کا ہے کونسا روپ
تپے جنگل ہے اور چاروں طرف لوں انگاراجل کے ہو دل سانس جب لوں
تپش گرمی کی تسپر ہجر کی آگ بھلا کیونکر بچیں ایسے ہوں جب بھاگ
جو نکلے آگ لک سے دل ہمارے[1] تو برسے ہیں اسکارے ہی انکارے
قیامت تپتے ہینگے کوہ و صحرا مگر خورشید محشر آج نکلا
ہر اک مو لگ رہے پانی کے چھنکے گلے میں پیاس سے آحاں اٹکے
پھروں ہوں وصل کا اک تو پیاسا کیا ہے تس اُپر جنگل میں باسا
کوئی ایسا خدا کا دوست آوے لگی کو آن کر میری بجھاوے
مگر ساقی توہی آتش بجھاوے «عذاب النار» سے مجھکو چھڑاوے
ارے ساقی کہاں ہیگا تو اس آن نکلتی ہے مری گرمی سے اب جان
مثال شمع سب تن تو جلا ہے مگر اک دل جگر میرا بچا ہے
تو اب پہنچی ہے آتش استخواں تک جلا دیگی جگر کو بلکہ جاں تک
شتابی آن کر مری خبر لے لگے ہے آگ ٹک پانی چھڑک دے
ارے ساقی گیا ہے جیٹھ سارا ولے قاصد نہ پھر آیا ہمارا
ارے ساقی ہوا قاصد ہے گمنام نہ لایا یار کو میرے نہ پیغام
میں کوہ و دشت سارے چھان مارے و لیکن برنیامد ہیچ کارے

[ماہ اساڑھ]

چل اب اساڑھ کے دن کاٹ ڈالیں صراحی لا ٹک اک منہ سے لگالیں
کہاں تک ہم کریں فریاد و زاری بجھاوے پیاس تو ہی ٹک ہماری
اگر اس چاند میں قاصد نہ آوے تو اس جنگل میں میرا جی ہی جاوے
گیا یوں جیٹھ اور اساڑھ آیا لگی دوں آگ نے تن من جلایا
بھڑکی اب اور آتش اس جہاں میں گئے جل بل صبا گل بوستاں میں
جلے ہیں لوگ یوں اساڑھ کے بیچ کہ جیسے بھونتے ہیں بھاڑ کے بیچ
ہوا اس رت کی دوزخ کی ہوا ہے سمندر جسکی تپ سے سوکھ جاہے
پکھیرو جو اڑے جل بل ہو بھسمنت چلے دھرتی پہ کوئی کیا ہو ساونت
فلک نے ہمکو اب گھر سے نکالا ہمیں جیتے ہی جی دوزخ میں ڈالا
کوئی دشمن نہ ہو اس رت میں راہی نہ نکلے گھر سے یوں کھاکر تباہی
زمیں کی پشت جوں جلتا توا ہے کوئی رکھے قدم امکاں کیا ہے

---

۱ اصل میں تنگ ہے جو وزن میں نہیں آتا

ہمیں اس رت میں ہے صحرا نوردی
کبھی گردش رہی یا پائے مردی

اوڑانا خاک اور جنگل میں پھرنا
زمیں پر ہر قدم اُٹھ اُٹھ کے گرنا

بھٹکنا رات دن صحرا بہ صحرا
بہانا روز و شب آنکھوں سے دریا

یہ گرمی اور یہ رت یہ حیرانی
نہیں حد بشر یہ اضطرابی (کذا)

ولے جو کچھ دکھاتا ہے سو یہ عشق
جو کچھ فتنہ اُٹھاتا ہے سو یہ عشق

نہ ہوتا کاش یارب مبتلا دل
جو لایا سر پہ میرے یہ بلا دل

الٰہی گم شود ایں دل زدنیا
کہ از دستش شوم درخلق رسوا

دل من چوں دل میں چوں دل من
دل کافر مبادا چوں گل من

غرض دن رات جنگل میں بھٹکنا
ہر اک جا سنگ سے سر کو پٹکنا

چلا جاتا تھا میں گریاں و نالاں
کہ ناگہ مل گیا قاصد مرا واں

کہا میں نے اسے اک کھینچ کر آہ
کہ اے قاصد کدھر ہے مرا وہ ماہ

بگو اے قاصد فرخندہ انجام
چہ آوردی سخن از یار پیغام

بتا جلدی کہاں وہ دل ربا ہے
یہاں آنے کو اس نے کیا کہا ہے

ارے قاصد تو کیوں اُسکو نہ لایا
مگر پیغام میرا سب بھلایا

سہی میں اپنے سر پر دھوپ اور چھاؤں
نہ آیا چین اس جی کو کسی ناؤں

نہ لایا ساتھ اُسے یہ کیا سبب ہے
شتابی کہہ مرے جی پر غضب ہے

کہ اسکو کچھ رقیبوں نے سکھایا
سبب گرمی کے وہ یاں تک نہ آیا

وہ یا مجھسے ہی کچھ جی میں خفا ہے
نہ آنے کا سبب بتلا تو کیا ہے

اگر کچھ ہوگئی ہے مجھسے تقصیر
تو بتلا دے کروں میں اُسکی تدبیر

شتابی بول منہ سے ہو کے دلشاد
نہیں یہ زندگی ہوتی ہے برباد

کہا قاصد نے تب تو مسکرا کر
کہ بس چپ رہ نہ تو مجھ پر جفا کر

ترا دلبر نہ تو روٹھا ہے تجھسے
نہ اُسنے اپنا دل پھیرا ہے تجھسے

نہ بہکایا ہے اس کے تئیں کسی نے
نہ چاہا آنے کو بھی اُس کے جی نے

کہی ہے اس نے اپنے دل کی یہ بات
کہ آگے سر اوپر آتی ہے برسات

رکھے ہے لطف کیا اس رت میں آنا
سمجھ دل میں تو ہی[1] گر ہے سیانا

بھر ینگے راہ میں سب ساگر و تال
پھر ونگا گھر کو کیونکر وہاں سے خوشحال

لگے جھڑ اور چڑھے ندیوں میں پانی
تو پھر مشکل رہیگی راہ پانی

جھڑی لگ جائے گر دس بیس دن کی
تو گھر کے خوف سے نکلے مراجی

---

[1] یہ لفظ کئی مواقع پر بہ تخفیف "و" نظم ہوا ہے

کہیں سب لوگ اس میرے نگر میں　　کہ جا بیٹھا ہے دیکھو کس کے گھر میں
کریں سب لوگ اس نگری کے مدام　　تو پھر اس طرح[1] کا کیوں کیجئے کام
یہ بہتر ہے کہ کٹ جاوے یہ برسات　　تو پھر تجھسے مری ہوگی ملاقات
کہیں یہ ساون اور بھادوں تو جاویں　　کوار آوے تو ہم تجھ پاس آویں
نہ ہوگا قول کا اب جھوٹ زنہار　　ولیکن صبر ہے اب تجھکو درکار
ارے قاصد مجھے تو صبر ہے جبر　　کہاں تک میں کروں گا بار بن صبر
ارے ساقی سنا قاصد کا پیغام　　نہ کر تو ڈھیل جلدی جام بھر جام

[ماہ ساون]

چلی آتی ہے اتنو سر پہ برسات　　تغافل کا نہیں اب وقت ہیہات
چلا اساڑھ ساون سر پہ آیا　　چلا جی ڈوب کر میرا خدایا
کٹے کس طرح یہ رت برشگالی　　گھٹا امڈے ہے دل پر غم کی کالی
ہوا ہے ابر ہے کالی گھٹا ہے　　صراحی یار بس ساقی گھٹا ہے
ارے کافر نہ کر اس وقت میں ڈھیل　　حساتک تجھسے ہو کر آج تعجیل
اٹھا لا ہاتھ میں تو جام پیالا　　پلادے مجھکو اور زاہد کو دکھلا
نہ پیوے جو کہ اس رت میں مئے ناب　　حرام اسپر ہو کوثر کا وہاں آب
جو کوئی رندوں میں مے پیوے نہ پیوے　　تو پھر وہ لطف سے ہرگز نہ جیوے
خصوصاً جو کوئی ہو عاشق زار　　نس اوپر ہجر میں ہووے گرفتار
تو پھر وہ کیا کرے گر مے نہ پیوے　　نہ بھولے غم تو پھر کس طرح جیوے
ارے ساقی قسم تجھکو مغاں کی　　قسم تجھکو شراب ارغواں کی
مرے اس غم کو تو کردے فراموش　　پلا کر خم کے خم کر ڈال مدہوش
اگر تو تر کرے میرا نہ حلقوم　　تو ہو اپنی جوانی سے تو محروم
چڑھا ساون گھٹا امڈی ہے گھنگور　　کروں پی پی پپیہا ساچہوں اور
چڑھا ساون نگر پر دل کے لے فوج　　جو کوئی[2] جیتا بچے اس میں کرے موج
ہوے ہیں سامنے بادل نمودار　　لڑائی کے لیے ہر ایک تیار
چڑھا ساون مرے اک دل پہ لے دھاڑ　　کٹیگا دل[3] بہت ہوگی بڑی راڑ
چڑھا ساون سیہ کالی گھٹا لے　　دو بھیار ہو تو اس کا وار ٹالے (کذا)
کڑک بجلی سے بجتا ہے نقارہ　　رقیب آ مور جنگل میں پکارا

---

۱ سکون رائے مہملہ پڑھا جائے　　۲ بروزن فی پڑھا جائے
۳ بمعنی مار کاٹ

نشاں اور بان لے کر بادلوں کے
لگے جی جس کے پھٹ جاویں دنوں کے

پڑا مینہہ اس طرح جیسے پڑے باڑھ
پڑے بوچھار جیوں اولونکی بوچھاڑ

کماں قوس قزح کی ہے نمودار
لگاوے تیر اپنا وار اور پار

لگے ہے آسماں سے آکے اولا
کہ جیسے غیب سے لگ جاوے گولا

کڑک بجلی کی ایسے کان پھوڑے
کہ جیسے کوئی ہزاروں توپ چھوڑے

لگے ہے بوندیوں پانی کی ہر بار
انی برچھی کی جیسے دل میں ہو پار

شفق بادل سے ایسی لال لاگے
کہ جیسے خونیوں کے لال باگے (کذا)

لڑائی کا ہر اک دل میں ہے یہ جوش
ہوئی موج ہوا بھی اک ذرہ پوش

رکھے ہے بلبلا بھی اس طرح خود
ہوا چار آئنہ چاروں طرف دود

الگے کنکر[1] چمن کے اس طرح دھاڑ (کذا)
کہ تیغ و تیر کی جس طرح ہو باڑ

ہوا گھوڑا انھوں کا برق کوڑا
جدھر چاہا ادھر کو پلمیں موڑا

اٹیہری اور پپیہا کویل اور مور
کریں چاروں طرف میداں میں شور

کہ ایسا ہو جو کوئی سامنے آئے
ذرا امید ان کی کوئی برلائے

بڑا ساونت ہو جو اڑے آوے
دو بہاں ہی یہاں سے جیتا جاوے

امڈ آئے ہیں دل بادل چھوں اور
جو کوئی آوے یہاں جاوے شرابور

یہ ساون ایک پل میں لاکھ دریا
کریں اک آن میں طوفان برپا

ڈباویں آن میں لے عرب تا شرق
کریں پل مارنے میں سب جہاں غرق

گھٹا اس زور کی دن کو کرے رات
کوئی اس کے مقابل ہو نہ ہیہات

کرے سارے جہاں میں آپ ہی آپ
نکلنے دے نہ ٹک خورشید مہتاب

شہنشاہ آج یہاں کا خشمگیں ہے
مہ و خور جس کے سب زیر نگیں ہے

گرا جاکی اگر چادر اٹھاوے
وہی سب ایکے پانی میں ڈباوے (کذا)

نکلنے دیں نہ ہرگز چاند سورج
سنا ہوگا کہیں ایسا بھی اچرج

شہنشاہ یہاں کا وہ جیتا رہیگا
کہ ہے ارض و سما پر حکم جسکا

دیا ہے حق نے ساون اس کے تئیں نام
یہی اس کا ہے ہر عاشق کو پیغام

برس میں اک مہینہ ہے مرا راج
تو سب عشاقوں سے لیتا ہوں میں باج

مدر چاہوں نہ مانگوں مال زنہار
فقط عاشق کا جی ہے مجھکو درکار

اگر دنیا[2] ہوے تو جلدی دیجے
نہیں لڑنے کا اب سامان کیجے

چڑھا ساون تو لیکر موج خونخوار
پڑے ہے سر کے اوپر موسلا دھار

---

۱ کنک دیہات میں اولے کو کہتے ہیں ۲ ([illegible]) پڑھا جائیگا

جو اے دل تجھے اب ہووے سو کر بھی — نہیں تو مفت جاتا ہے یہ اب جی
نکل جاوے اگر اس میں مری جان — تو رہ جاوے سجن کا جی میں ارمان
اُسے جلدی ملا تو میرے ساقی — نہیں حسرت رہیگی جی میں باقی
نکل جاوے یو ہیں گر جان تن سے — ملیگا کیونکہ تو اپنے سجن سے
ارے دل تو بھی کر لڑنیکا ساماں — گریز اب کچھ کہ سر پر ہے پڑی آں
بلا ساقی کو کہدے مئے کا خم لا — دکھا اس دارو کو اُنکا تماشا (کذا)
غم و درد و الم کو اپنے کر فوج — سپہ سالار ہو تو اور کر موج
فغاں اور نالہ و آہ شرر مار — طرف گردوں کے کردے انکی بھرمار
سپر سینہ کی کر اور زخم کے پھول — سا کر آہ کو اور مار اک بھول (کذا)
تڑپھ کے اسپ پر چڑھ بیٹھ کر لاگ — ولے مت صبر کی لے ہاتھ میں باگ،
تڑپھ کے اسپ کو کردے اشارا — بجا فریاد کا دل کی نقارا،
عدو کو قہر کی تلوار سے مار — لگالے بے نہایت وار پر وار،
جگر کر سخت، دے لشکر کو تنخواہ — سراسیمہ نہ ہو لڑنے کی لے راہ
اگر وہ ابر سے کرتا ہے بوچھاڑ — تو تو بھی آنسوؤنکی باندھ لے باڑھ[1]
لگادے آنسوؤنکا جھڑ تو دن رات — بہادے اپنی اک رستے میں برسات
شتابی فتح کر یہ بھی لڑائی — بھرا دے عشق کے تن میں دہائی
ہارا ڈھارس لڑائی میں نہ بولا[2] — اٹھا گھوڑا، جسے دے اسکو مولا
نہیں غم گرچہ زخموں سے تو ہو چور — و لیکن دشمن ناہی ہو مقہور
اگر تلوار پر تلوار برسے — ولے مت پھیر منہ کو تو ادھر سے
اگر گھایل کریں سرشار تجھکو — کریں ہم مرہم دیدار تجھکو (کذا)
و گر اس جنگ میں پاوے شہادت — تو بھی، عاشق کو مرنا ہے سعادت
ہوا جنگ[3] اور پھکی تڑپوں کی بوچھاڑ — ہوا دل بھی مقابل اب قدم گاڑ
اگرچہ خون عاشق کا محل ہے — نہیں پھرنے کا جیتے جی یہ دل ہے
ہوا جب خوب کوئی اور گھمسان — تو ساون نے بھی مانی خوف سے آن (کذا)
لگا پڑنے قدم پیچھے کو اس کا — لڑے عاشق سے گردا ہے یہ کس کا
ارے ساقی مرے جلدی ملاکر — کہ ہوں اس وقت میں بے چین، مضطر

---

۱ بوچھاڑ ہے جسکی صحت مشتبہ ہے قیاسی تصحیح کی گئی ہے ۲ بولانا - حیران و پریشان کرنا ۳ جنگ کو بدھ کے ہم معنی ہونے کی وجہ سے (جو مذکر ہے) یہاں مذکر باندھا گیا ہے۔

مرا دلدار گر مجھ پاس ہوتا
تو کاہیکو میں رو رو جان کھوتا ،

مرا دلدار گر ہوتا مددگار
تو کیوں ساون سے ہوتا میں دل افگار

اگر ہوتا مرا دلدار مجھ پاس
تو ہوتی زندگانی کی مجھے آس ،

اگر دلدار میرا مجھ تک آتا
تو کیوں ساون مجھے اتنا ستاتا

نہیں ساون کہو اب اسکو ساوت
کہ جس کے خوف سے مرجانے پنونت

ڈرانی اسکو یہ کالی گھٹا ہے
و لیکن اب تو پیچھے کو ہٹا ہے

پہنچ اس وقت میں تو جلد ساقی
کہ اب مجھ میں نہیں ہے جان باقی

اگر اس دم تو مجھکو مے پلادے
تو میرے تن بدن میں جان آوے

[ماہ بھادوں]

گیا ساون چلا آتا ہے بھادوں
عجب ہی لطف دکھلاتا ہے بھادوں

ولیکن اب نہیں جینے کی کچھ آس
کہ میرا دلربا میرے نہیں پاس

اگر تو مے پلا دے تو بچونگا
نہیں ظالم تو میں رو رو مرونگا

ارے ظالم تجھے بھادوں کی سوگند
مرے دل کو ذرا تو کرلے خورسند

سماں ہے ابر ہے برسے ہے باراں
(نہیں بن مے مرے جینے کا ساماں)[1]

جہاں میں جوں جوں سبزہ لہلہاوے
مرا جی مے بنا نکلا ہی جاوے

ارے ظالم بتا کبتک کروں صبر
کسی پر بھی روا ہے اس قدر جبر

ارے کافر تو میری جان لے جا
و لیکن اک پیالا مے کا دے جا

گیا ساون بجا بھادوں کا ڈنکا
تو مری دے دہائی کر کے کنکا (کذا)

جدا ہونے سے اس کے دل گیا ڈوب
ہوا ویراں مگر قسمت گئی پھوٹ

یہاں بھادوں کا مینہ جوں جوں پڑے ہے
مرے دل میں اگن تیوں تیوں بڑھے ہے

پڑے جوں جوں ہے پانی آسماں سے
اُٹھے ہے آگ میرے درد و جاں سے

نہیں پانی برستا ابر تر سے
پڑی آتش برستی ہے سقر سے

زمین و آسماں پانی میں ہیں غرق
ولے اس دم لگے آتش سی نہیں[2] فرق

بجاو پانی یہ آتش بجھاوے
مرے دل کو یہ دونی دوں لگاوے

یہ آب جوں[3] سے ہرگز نہ جاوے
اسے ہاں وصل کی آتش بجھاوے (کذا)[4]

یہ آتش ہجر کی نار سقر ہے
کوئی اس میں جلے کس کا جگر ہے

کہ یہ آگ ایک ہمکو ہی ملی ہے
ہماری جان سب ایسی جلی ہے

---

۱ یہ مصرع اصل میں موجود نہیں اضافہ مرتب ہے   ۲ بروزن نی پڑھا جائیگا
۳ آب جوں - جمنا کا پانی   ۴ یہاں آتش کے بجائے پانی (وصل کا پانی) ہونا چاہیے

لگے ہے دل کو جھڑی بارش کی ایسے 	بڑنق آوے (ہے) یہ سوند جیسے[1]
اگر دریا امڈکر لاکھ آوے 	مرے دلکی اگن سے سوکھ جاوے
گھٹا بھادوں ڈراوے مجھکو دکھلا 	کبھی برسے کبھی ایک دم کو کھل جا
کبھی چاروں طرف سے گھر کے آوے 	کبھی سارے جہاں میں پھیل جاوے
دکھاوے اپنا مجھکو جوں جوں عالم 	مری آنکھیں سجن بن ہوویں پرنم
نظر آویں بھرے تالاب جیوں جیوں 	ہوا جاوے مرا جی آب تیوں تیوں
بھریں تال اور تلیاں ساگر و نال (کذا) 	مری آنکھیں بھر آویں دیکھ یہ حال
اور آیا دل اوپر یوں غم کا بادل 	ہوے آنسو رواں آنکھوں سے پلپل
لگیں آنکھیں مری دریا بہانے 	لگا جی ہجر غـــم میں ڈوب جانے
ادھر کو مور «آعوں» ہی پکارے، 	مرا دل نعرے لاکھوں غم سے مارے
کرے دریا کنارے غوک فریاد، 	مچادے دل ادھر سے دار بیداد
پپیہا پی کہے تب جی ہی جاوے 	کرے «کوکو» جو کویل دم نہ آوے
گھٹا کو دیکھ کر برسیں مرے چشم 	سجن کی دید کو ترسیں مرے چشم
ہوا کوہ و صحرا پھر کے سرسبز 	نظر آوے ہے ہر سو بام دور سبزہ
جدھر دیکھو تو سبزہ ہے نمودار 	ہوا سرسبز مینہ سے ہر خس و خار
بچھا وہ کوہ اور صحرا میں سبزہ 	کہ فـــرش مخمل اخـــضر ہے گویا
زمیں کے عکس سے دیکھا جو یکسُر 	ہوا ہے سبز سارا چرخ اخضر،
چھپا سبزہ میں سارا صفحۂ خاک 	درختوں نے بھی پہنی سبز پوشاک
جو پانی کی طرف کو چشم اٹھاتی 	تو دیکھی اس کے اوپر سبز کائی
سبھی انسان، حیوان دیکھ سبزہ 	گئے ہر دشت میں بہر تماشا،
کریں حیواں معیشت اپنی دل خواہ 	ہیں جو انساں انہونکو شہر کی چاہ
بغل میں ہر کسی کے شیشہ اور جام 	ہر اک سو نعرۂ چنگ و دف ونے
ہر اک کے ہاتھ میں ہے شیشہ اور جام 	ہر اک کے پاس معشوق دل آرام
مرا جی یار بن نکلا ہی جاوے 	مجھے رنگ اس کا سبرا یاد آوے
نہیں دلدار مے کیونکر کے پیوں 	مزا کیا زیست کا کیونکر کے جیوں
اگـــر دل بر مرا مجھ پاس آتا 	تو میں اسکو بھی جھولے میں جھلاتا
سو اس موسم میں وہ مجھسے جدا ہے 	اگر مے پیئے تو کیا مزا ہے

---

۱ خط کشیدہ حصہ ناقابل فہم ہے

[ماہ کنوار]

کہا ہے اس نے جس دم کنوار آوے — تو تو بیشک ہمارا وصل پاوے
چل اے ساقی شتابی آپہنچ تو — کہ آتا ہے کوئی دم میں وہ مہ رو
چلا بھادوں کوار آیا ہے سر پر — جو حق چاہے تو آتا ہے وہ دلبر
کٹے دن ہجر کے ملنے کی ہوئی[1] آس — مرا دل دار آبیٹھے مرے پاس
نگر دل کا مگر آباد ہوجاے — غم و اندوہ سب برباد ہوجاے
خوشی سیتی نہ میں پھولا سماؤں — جہاں میں رات دن دھومیں مچاؤں
نظر آجاوے جوہی وہ دل آرام — مرا دیں سب ملیں ہر آویں سب کام
میں اسکی راہ پلکوں سے بہاروں — قدم پر اس کے اپنے جی کو واروں
نظر بھر کر اسے جس وقت دیکھوں — وہیں پسیرونکی جلدی منتیں دوں
ارے ساقی تو کر رکھ اپنا سامان — کہ آتا ہے مرے گھر یار مہمان
جہاں تک آج سے تو حکمیں پاوے — قسم ہے تجھکو تو مت کر نہ لاوے
ہمارے دیدۂ کم خواب کر فرش — بچھاویں کرسی اوپر بہتر از عرش
بلا لا مطربوں کو مادف و چنگ — کہ بولے خوب سی شادی کے آہنگ
ابھی مقارچسی اک دو ملالے — خوشی اور عیش کی نوبت بجالے
اٹھاوے مطرب اپنی یکطرف نے — بلانا جا ادھر سے تو مجھے مے
بجاوے اسطرف کوئی[2] جھانجھ اور ڈھول — ادھر کرنا بجے بولے کل بول
بجیں طبلے ادھر کو اور اوپر چنگ — بجاویں تال دیکر ساتھ مردنگ
لگادے باغباں گل اور ریحاں — مرے گل کے لیے گھر کردے شبستاں
چراغاں رات کو اور دیکھو گلزار — خفا جس میں نہ ہووے خاطر یار
کنوار آیا گئے دن غم کے بھاری — سجن کی گھر میں آپہنچی سواری
ہوے طالع بھلے دن غم کے بیتے — نہ ہووے پاے کچھ دشمن کے جیتے
خدا نے وصل کا دن پھر دکھایا — بلاے ہجر سے مجھکو چھڑایا
فلک کی گردشیں ہوگئیں موافق — پٹکتے رہگئے سر کو منافق
فلک اب بار آیا کج روی سے — اٹھایا ہاتھ جوں توں مرے جی سے
گئی سر سے بلاے آسمانی — مطہر اپنے لگی اب زندگانی
قدم رکھا سجن نے میرے گھر میں — اجالا ہوگیا سارے نگر میں
مرے گھر مہربانی یار نے کی — تصدق اسپر ہو جلدی ارے جی
اگر اس دم نہ تو کچھ کام آوے — تو پھر کیا عاشقوں کو منہ دکھاوے

---

۱ بروزن ہی پڑھا جائیگا ۲ بروزن ہی

اگر اس وقت میں جیتا بچے تو تو پھر دن ہجر کے رو رو مرے تو
نہ دکھلاوے خدا پھر ہجر کا روز جلادے جان تو اس ہجر کا سوز
جہاں باور کرے مانے نہ مانے جلے اس آگ میں جو کوئی جانے
دکھایا ہے خدا نے وصل کا دن نہیں معلوم ہے یہ کونسا دن،
میں اس دن کے تصدق ہو کے مر جاؤں تو پھر فرقت کے روزوں میں نہ دکھ پاؤں
یہ دن نوروز کا یا عید کا ہے نہیں معلوم اب یہ روز کیا ہے
خوشی دل میں مرے یانتک ہے اس آن کہ شادی مرگ ہوویگا مرا جان[1]
عجب یہ روز ہے فرخندہ انجام نہ تھا ہرگز گمان ہونگے یہ ایام
الٰہی کس دعا کیا اثر ہے کہ میرا ماہ رو اب میرے گھر ہے
الٰہی ہے اثر یہ کس دعا کا کہ میرا دلربا مجھ پاس بیٹھا
الٰہی ہے یہ کس نالے کی تاثیر الٰہی کون جاپہنچا وہاں تیر
کہ دل بر کو مرے تجھ پاس لایا مجھے دن وصل کا اس نے دکھایا
عجب یہ دن ہے یارو اور عجب رات کہ دن کو عید اور شبکو ہے شبرات
کبھی دیکھا کروں منہ اور کبھی دل کبھی سوچوں نہیں یہ اس کے قابل
کبھی اس کے گلے میں ہاتھ ڈالوں کبھی سر کو قدم اوپر جھکاؤں
کبھی اپنے کہوں حال زبوں کوں کبھی منشاؤں میں اپنے کہنے کوں
کبھی پوچھوں نہ آنے کا سبب میں کبھی اپنا لکھوں رنج و تعب میں
کبھی پوچھوں کہ کہہ تو اے پیارے بھلا کیا آگئی دل میں تمہارے
جو تم گھر میں مرے تشریف لائے سبب کیا ہے جو آپہی ایسا آئے
کبھی دیکھ اسکو میں بے ہوش ہوتا کبھی ہنستا کبھی پھر زار روتا
کبھی صورت کو اسکی دیکھ رہتا کبھی دل کو مبارک باد دیتا
کبھی سب اس سے کہتے راز دل کے کبھی کہتا بہت خوش ہم ہیں مل کے
منگائی گہ صراحی گاہ مینا بھڑا دیتا کبھی سینہ سے سینا
ادہر میں ہو گیا پی پی کے مدہوش ادہر وہ بے تکلف ہو ہم آغوش
ادھر بکھرے گل و سنبل پر اک سو ادھر کھولے ہوئے وہ زلف کے مو
ادہر شیشے سے مے ہاتھوں میں چھلکے ادہر پیالے میں اس کا عکس جھلکے
بغل میں ماہ رو اور چاندنی رات کٹیں اس طرح یارو سب کے اوقات

---

۱ جان کو قدیم اہل زبان نے مذکر باندھا ہے اور ہندی لفظ پران کے ہم معنی ٹھہرایا جو مذکر ہے

پر اک ہاتھوں میں لے جوں مست و سرشار
نہایت بےخودی کا گرم بازار

کبھی مثل صراحی قہقہہ زن
کبھی مانند مینا گریہ کردن

جو میں مانند مینا سر جھکاتا
تو وہ جوں جام منہ سے منہ لگاتا

جو وہ پیتا نہ مجھ سے لے کے پیالی
تو میں جوں شیشہ کرتا دل کو خالی

گیا یوں کنوار کا سارا مہینہ
رہا اک جام ہاتھ اک ہاتھ مینا

چل اب جلدی سے آ کچھ پاس ساقی
پلادے مے اگر کچھ ہووے باقی

فلک اب تک تو مجھ پر مہرباں ہے
کہ میرے پاس میرا جان‌جاں ہے

خدا جانے کہ کیا آگے ہوا ہے
نصیبوں میں مرے کیا کیا لکھا ہے

دیا ہے چرخ نے اپنو مجھے کام
رہے باقی صدا اللہ کا نام،

ارے ساقی غنیمت جان یہ دم
کہاں پھر یار کی صحبت کہاں دم

شتابی ہو کہ لک مہلت نہیں ہے
جہاں میں وقت کی فرصت نہیں ہے

پیالے اور بھی دور چار پیالے
پلا ظالم پلا ظالم پلالے

میں ڈرتا ہوں جدائی پھر نہ آجائے
خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھلاوے

(ماہ کاتک)

چڑھا کاتک چلے شادی کے ایام
جدائی کا دیا دلبر نے پیغام

لگا جی تن ستی باہر نکلنے
لگا افسوس سے میں ہاتھ ملنے،

ملا نے سحر میرے سر پہ آنی
متاع صبر سب دل سے چھنائی[1]

چلا پھر ہاتھ سے وحشی مرا دل
خبر سن اس کے جانے کی چلا دل

لگا ہونے جدا سب عیش و آرام
دیا درد و الم نے دل کو پیغام

کہ کیوں اے مہرباں بیٹھے ہو دل شاد
کرو سب عیش اور شادی کو برباد

گئے وہ دن جو تم کو چھوڑ کے ہم
سو تم بیٹھے رہو خوشنود و خرم (کذا)

ہمارے پیچھے تم نے عیش لوٹے
یہ سمجھے تم کے اب ہم غم سے چھوٹے

رہے تم ہم سے ایسے سخت غافل
کیا دو دن میں کہو[2] کیا عیش حاصل

نہ جانا یہ کہ پھر کیا دن دھرا ہے
نصیبوں میں جدا ہونا لکھا ہے

فلک کی دیکھ گردش موافق
سبھی بھولے غم و اندوہ سابق

نہ سمجھے ہم کہ یہ گردوں ہے کجرو
جو دے اک عیش تو غم دے کئی سو

خوشی سے رات دن یہ جام پیا
جہاں میں رہ کے یوں دل شاد جینا

بغل میں بیٹھا[3] لے کے دل ربا کو
بھلا نا ہم سے کہنا آشنا کوں (کذا)

---

۱ چھینتا، چھنانا اب بھی بولا جاتا ہے ۲ بروزن کو ۳ بہ تخفیف الف

تمہارے آشنا ہم درد و غم میں — رفیق عشاق کی دنیا میں ہم ہیں
خوشی سے عاشقوں کو کام کیا ہے — نصیبوں میں تمہارے غم لکھا ہے
چلا تم پاس سے دلبر تمہارا — یہ ہے وقت اور ہے قابو ہمارا
جو چاہیں گے ستم تجھ پر کریں گے — خوشی سے ایک دن جینے نہ دینگے
بہاوینگے تری آنکھوں سے خوں ناب — کرینگے دل جگر کو سربسر آب
جلاوینگے ترے ہر استخواں کو — نہ چھوڑینگے بدن کے بیچ جاں کو
کرینگے دل کے ٹکڑوں پر عمل ہم — الٹھا دینگے خوشی بتلائینگے غم
لگی کہنے خوشی اب ہم ہیں راہی — پڑی اب آنکر مجھ پر تباہی
نہ دیوینگے ترا اس وقت ہم ساتھ — گریباں ہے ترا اور میرا ہے ہاتھ
جو کچھ اب ہوسکے تجھسے سو کرنا — تڑپھا جان دینا، رو رو مرنا
لگا دل کہنے میں تڑپونگا دن رات — لگا جی کہنے میں بھکونگا دن رات
لگی یوں چشم کہنے رووینگے ہم — نہ سووینگے نہ سونے دیوینگے ہم
خرد بولی ہوے اب ہم تو شاد آج — وداع صبر و تاب و ہوش ہے آج
جگر بولا چلا وہ یار جانی — بہونگا چشم سے میں ہوکے پانی
ہوا سارا جہاں مجھ پر اندھیرا — بلاؤں نے مجھے ہر سو سے گھیرا،
کہا اس دل ربا سے میں کہ اے یار — مجھے اک دم ہے تجھ بن زیست دشوار
کٹینگے کس طرح سے ہجر کے دن — جیونگا کیونکر اک دم میں ترے بن
لیا ہے جب سے تو نے ہجر کا نام؛ — مجھے اک دم نہیں ہے تب سے آرام
ابھی بیٹھا تو ہیگا یار مجھ پاس — نہیں جینے کی تسپر کچھ مجھے آس
مرا جاتا ہوں میں اس غم کے مارے — نجاؤ چار دن اور اے پیارے
لگا کہنے مجھے تو پاس ہی جان — جو جیتے ہیں ملینگے تجھ سے پھر آن
مناسب نہیں تجھے اب زیادہ کہنا[1] — نہ رہنا مجھکو ہرگز یہاں نہ رہنا
یہ دن کاتک کے میں تجھ پاس ہونگا — اگھن کی صبح کو یہاں سے چلونگا
ارے ساقی پلا اک زہر کا جام — کہ آخر ہو شتابی سے مرا کام
مجھے لادے ہلاہل مے کے بدلے — کہ چھٹ جاؤں میں دکھ سے اس برہ کے
جدائی بیچ مے کا کیا مزہ ہے — ہمیشہ خون دل پینا بھلا ہے
کباب لخت دل اور رشک خوں ہے — یہی رشک گزک ہے اور مئے ہے (کذا)
ہوئی سب بادہ نوشی اب فراموش — جدائی سے مرا جاتا رہا ہوش

---

[1] نہیں بروزن نی زیادہ بروزن سادہ ع

ترے ترغیب تو مجھکو کہ مے دے   مری میخوارگی کو عشر۔ ۔ ۔

[ماہ اگھن]

گیا کاتک اگھن اب سر پہ آیا   کروں کیا میں کدھر جاؤں خدایا
ہوا مجھ سے جدا دلـــدار میرا   مجھے لاکھوں بلا نے آن گھیرا
گیا وصل اور آئی پھر جدائی   عجب ہے اے خدا تیری خدائی
الـہی کیسی آفت مجھ پہ لایا   کہ جس نے صبر سب دل سے بھلایا
کٹیگی زندگانی کس طرح سے   نہیں جینے کا میں تو اس طرح سے
الـہی یہ جدائی کیا غضب ہے   غضب مجھ پر جو آیا کیا سبب ہے
دیا تھا وصل کیوں مجھکو الـہی   جواب فرقت نے دی ایسی تباہی
الـٰہی چرخ کے کیا دل میں آیا   جو ایسا دن جـــدائی کا دکھایا۔
فلک تجھکو لگے ظالم مری آہ   کیا تو نے جدا مجھسے مرا ماہ
فلک تو ہے سـدا مجھکو ستایا   ہمیشہ دل جلایا ، خون رلایا
دیا دو دن سے مجھکو عیش آرام   رکھا غمگیں مجھے ہر صبح و شام
مگر یہ دن جو کوئی جامہ ویران   لگا تھا غم مرے دل سے کسی آن
سو کیا جاوں چلا تو کون سی چال   کریگا کس قدر اب مجھکو پامال
سـے تھی یہ مہربانی از شرارت   مجھے ہر طرح پہـــنچائی اذیت
مزا دے وصل کا پھر دے جدائی   پـــڑی ہے ہائے یہ آفت سمائی (کذا)
گیا دل دار اپنے کر صبر اور جاں   ارے ظالم جـــدا تـــیرا نگہباں
تجھے جانا ہے تو تو بھی سفر کر   نہیں تنہائی پر مـــیری نظر کر
توہی[1] اس غم میں ہو غم خوار میرا   رفاقت کر بھلا ہـــو یگا تیرا
مجھے ہر روز ہے رونے ہی سے کام   تڑپھنا ہر گھڑی ہر صبح و شام
ملی قسمت میں بھی ہے نالہ و آہ   رفاقت کو مری تو بھی ہو ہمراہ
کبھی میرے تئیں جنگل میں پھرنا   کبھی میرے تئیں نالی میں گرنا
کبھی صحرا میں جاکر خاک اڑانا   کبھی آنکھوں سے اشک خوں بہانا
کبھی کرنا بہت فـــریاد و زاری   سجن بن ہے یہ کچھ حالت ہماری
گریباں چاک کرنا دن میں سو بار   نہ رکھنا جیب اور دامن میں یکتار
سـدا غم بیچ رہنا سر بزانوں   بہانا چشم سے دن رات آنسو
سمجھنا اور نہ کچھ گرمی و سردی   ہمیشہ رات دن صحرا نوردی

---

۱ بروزن وہی

گزرکرما ہر اک رستے پہ جاکر   رگڑنا سر ہر اک نقش قدم پر

یہ کہنا یہاں سراغ اس شمع کا ہے   سمجھنا یہ اسی کا نقش پا ہے

گیے وہ روز شادی اور خوشی کے   نہیں یکساں رہتے دن کسی کے

ندارد کار دنیا اعتبارے   وگر دارد ہو روزے یا چہارے

ارے ساقی کتا شادی کا ہنگام   شتابی پھوڑ مینا توڑ دے جام

مے و میخانہ کو آتش لگادے   خوشی کا ساز جو کچھ ہے جلا دے

ارے ساقی گیا سب مے کا پیا   مرے آگے سے لیجا جام و مینا

مری آنکھیں کریں جو خوں فشانی   یہی سب ہے شراب ارغوانی

کباب اپنے جگر کا وہ گزک ہے   عجب ہی لطف کا اس میں نمک ہے

ارے ساقی اگھن تو کٹ گیا یوں   اب آگے دیکھئے کیا کیا میں دیکھوں

اٹھے ہے دمبدم دل میں مرے درد   ہوا ہے کتی اس موسم کی اب سرو

ماہ ماگھ

پڑا ہے ماگھ سے اب مجھکو پالا   ہوا جاتا ہے دل روئی کا گالا

ہوا جی سرد جانوں کے اثر سے   نکلتا ہے دم سرد اب جگر سے

زمیں کانپے ہے دل اور پڑتی ہے برف   نکلتا نہیں[۲] زباں سے صاف اک حرف

بیاباں میں نہیں جانے بنا گل   ہوے سردی سے ہاتھ اور پاؤں سب شل

کسی کو جس طرح مارے ہے جھولا   رہے ہیں دست پاؤں ہوکے اولا

اب اس دلدار تک میں کیونکہ جاؤں   جو اس کو حال اپنا جا سناؤں

مگر بھڑکے کہیں دل میں مرے آگ   تو جاوے جی کے یہ سردی مرے بھاگ

زبس ہے نامرادی مجھکو اور غم   نکالی میں نے ٹھنڈی سانس ہر دم

کہاںتک میں جدائی کا کہوں درد   کہیں ہوجائے میری جان اب سرد

جو وہ خورشید رو مجھ پاس ہوتا   تو کیوں سردی سے میں اب جان کھوتا

پہنچتی اس کے چہرے کی جو گرمی   نکلتا کیونکہ سردی سے مرا جی

فلک بے مہر نے اپنے ستم سے   کیا اسکو جدا اس وقت ہم سے

سو اپنے تو نصیب ایسے پھرے ہیں   کہ اک دن کو خوشی دیکھی نہیں میں

ہمیشہ میں رہا غم میں گرفتار   مجھے دیتا رہا نت چرخ آزار

ملاکر ایکدم مجھکو میرا یار   کیا پھر مجھکو فرقت میں گرفتار

اب اس کا ناوک غم ہے جگر دوز   یونہی رہ جاؤنگا مر کر کوئی روز

ارے ساقی وصیت رکھ مری یاد   کہ جس جا ہووے طرح بادہ بنیاد

مری میخوارگی کو یاد کر کر   گرا دینا ذرا سی مے زمیں پر

الٰہا دو ہاتھ لے لیا میرا نام
کہ میری روح رہ جائیگی ناکام

وگر یہ ہوسکے تجھسے مرے یار
تو تو مت بھولیو یہ بات زنہار

کہ کاہے سادۂ گلگوں کو پی کر
بہا دینا مری تربت کے اوپر

دعا پھر قبر میں تجھکو دونگا
نہیں عجز کو دامن گیر ہونگا

اب آگے کیا کہوں میں ماہ کا غم
کہ مجھ میں کچھ نہیں باقی رہا دم

[ماہ پوس]

لگا ہے پوس اور دل پر نہیں پاس
بھلا جینے کی ہو کیسے مجھے آس

جدائی نے نہیں چھوڑی مری جان
ہوا سب خانماں یکبار ویران

نہیں آنے کا مجھ کو گور میں چین
ٹپکے پھوٹ کر ہر دم مرے نین

نہیں ہے میری غم خواری کو دلبر
بھلا آوے مجھے اب چین کیونکر

اُلٹ گئے یوں نصیب اور پھر گئے دن
ہوا میں رونے رونے یار کے بن

مگر وہ اب تو مسعود یہاں آئے
تو مری سر سر بہبود ہو جائے

بس اب دل میں ہے میں ہو جاؤں خاموش
کہ سننے والوں میں باقی نہیں ہوش

کہوں ہر اک مہینے کی کہانی
بہت آنکھوں سے کی اب خوں فشانی

کہاں تک حلق بس اس دکھ کو رونے
کہیں ایسا نہ ہو کوئی جان کھووے

نہیں جاتی مری یہ سعی بے حد
غرض نقشے است کز ما یاد ماند

جو وحشت ہم مونے یہ تو بجا ہے
کہ ہستی را نمی بینم بقاہے

ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر

اردو گرامر پرتگالی زبان میں

ایک زندہ زبان کے لئے ابتداء میں صرف ونحو اور لغت و فرہنگ کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اہل زبان اس معاملہ میں بے نیاز ہوتے ہیں. عموماً گرامر اور لغت کی ضرورت بظاہر اس وقت محسوس ہوتی جب کسی اجنبی قوم نے کسی وجہ سے دوسری قوم کی زبان حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اس زبان کی قواعد اور فرہنگ وجود میں آئیں۔ زبان اردو بھی اس کلیہ سے مستثنٰی نہیں ہے. اول اول اردو زبان کی گرامر اور لغت پر اہل یورپ نے بضرورت توجہ کی اور اس کے بعد ہی اہل اردو نے زبان کی باریکیوں کو لسانی اور علمی طریقے پر جانچ کر اردو کی قواعد اور لغت تیار کیں۔

جب یونان فتح کرلیا گیا تو اہل روم کو یونانی زبان حاصل کرنے کا شوق ہی پیدا نہیں بلکہ خبط سوار ہوا اور پہلی مرتبہ لاطینی زبان میں یونانی زبان کی گرامر تیار ہوئی اسی طرح جب اہل عرب نے فارس کو تسخیر کرلیا تو اہل فارس کے لئے عربی زبان کی تحصیل کی غرض سے اسکی گرامر مرتب کی مسلمانوں کے دور حکومت میں فارسی تقریباً آٹھ سو سال تک ہندوستان میں درباری اور ثقافتی حیثیت سے براجمان رہی اور نتیجہ میں اہل ہند نے اپنے مقصد براری کے لئے فارسی زبان کو سیکھنا ضروری سمجھا اور فارسی کی گرامر اور لغت منظر عام پر آئیں اردو زبان کا بھی یہی حال رہا. اہل یورپ میں بالخصوص انگریز، پرتگیزی اور فرانسیسی حضرات نے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد یہاں کی مقبول اور عوامی زبان ہندوستانی یعنی اردو کو مذہبی اعتبار سے یا سیاسی لحاظ سے حاصل کرنے کی نہ صرف جدو جہد کی بلکہ اس کی گرامر اور لغت کی تدوین و ترتیب کی طرف اپنی پوری توجہ مرکوز کی اور انجام کار لاطینی، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں اردو گرامر اور لغت رومن حروف اور رسم خط میں پیش کیں اور ان کا اس زبان کو اپنانے کا مقصد اولی مسیحی تبلیغ اور حکومت کی استواری تھی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زبان اردو کی ترویج و اشاعت میں اہالیان ہند میں مسلمانوں کے ساتھ کشمیر کے برہمنوں، پنجاب کے سکھوں، اتر پردیش کے کایستھوں، سمتی کے پارسیوں اور مدراس کے عیسائیوں ہی نے نہیں بلکہ یوروپین اقوام میں انگریز، پرتگیزی اور فرانسیسی حضرات نے بھی خصوصی طور پر پر امکانی کوششیں کیں اور اردو ادب کے سرمایہ میں گرانبہا اور قیمتی اضافہ کیا۔

اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ میراث اور زندہ یادگار ہے۔ نورالدین جہانگیر اور شہاب الدین شاہجہاں جیسے علم دوست اور خوش مذاق بادشاہوں کے زیر سایہ یہ مثالی زبان پروان چڑھتی رہی اور شائقین کی بڑھتی ہوئی قدرافزائی سے پھلتی پھولتی رہی حتیٰ کہ محمد شاہی دور میں ہندوستان کے عوام بلا تخصیص مذہب و ملت اس عوامی زبان اردو کو باعث دلبستگی تصور کرنے لگے اور دانایان فرنگ یعنی اقوام یورپ نے جو ان دنوں تجارت کے بھیس میں حکومت کا سنگ بنیاد رکھنے آئے تھے اپنے ارمانوں کے تقاضوں سے اسی آشفتہ مزاج اردو کو (جسے وہ ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے تھے) نہ صرف حکومت میں استحکام و استواری پیدا کرنے بلکہ مسیحی ابلاغ و اشاعت کا مضبوط ذریعہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ (Dr John Gilchrist) اور موسیو گارسن دی تاسی (Monsieur Garcin de Tassy) کا ذکر نہ کرنا احسان فراموشی کے مترادف ہوگا۔ ان کے نام نامی اردو زبان اور ادب کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں کیونکہ انھوں نے نہ صرف فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں اس زبان کے متعلق لکھا بلکہ اپنی اپنی قوم کو اس زبان کے حاصل کرنے کی ترغیب دی اور اپنی زبانوں میں قواعد و فرہنگ بھی تیار کئے۔

اردو کی سب سے پہلی گرامر ۱۷۱۵ء میں لاطینی زبان میں جان جوشوا کیٹلر (John Joshua Ketelaer) نے ہندوستانی زبان (De Lingua Hindostanee) کے نام سے مرتب کی۔ ۱۷۴۴ء میں گرامیتیکا ہندوستان (Grammatica Hindostanica) کو بنجامن شولٹزینو (Benjamin Schultzino) نے لاطینی میں پیش کیا اور ۱۷۷۲ء میں جارج ہیڈلے (George Hadley) نے ہندوستانی زبان کی ایک مختصر قواعد (A Short Grammar of Moors Language) انگریزی میں تالیف کی۔

آج سے تقریباً دوسو سال قبل پرتگیزیوں نے اس زبان کو مسیحی تبلیغ کے لئے ایک ذریعہ بنایا اور ایک اردو گرامر بنام گرامیتیکا اندوستان * (Gramatica Indostana) ۱۷۷۸ء میں پرتگالی زبان میں لزبن سے شائع کی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن روم سے ۱۸۰۵ء

میں شائع ہوا ہے۔ اس قواعد کا ذکر گارسن دی تاسی (Garecin de Tassy) نے ۱۸۲۹ ع میں اور جولین ونسن (Julien Vinson) نے ۱۸۹۹ ع میں اپنی کتابیات میں کیا ہے۔ اس گرامر کو مسیحی تبلیغی جماعت (روم) نے لزبن سے شائع کیا اگرچہ اس جماعت کا قیام ۱۶۶۲ ع میں عمل میں آیا جبکہ تاریخ شاہد ہے کہ پرتگیزی قوم ہندوستان میں ۱۴۹۸ ع میں وارد ہوئی۔ اس کے مولف کا نام درج نہیں ہے تاہم یہ مسلمہ ہے کہ وہ ایک مسیحی مبلغ تھا جو پرتگیزی ہی نہیں بلکہ پرتگالی زبان کو اپنی زبان قرار دیتا ہے اور یہ بھی بلا جھجک کہتا ہے کہ اردو زبان کو اس نے دہلی میں سیکھا ہے۔

پرتگال و ہند کے روابط کے پیش نظر پرتگیزیوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں میں ہندوستانی زبانوں کو خصوصی طور پر حاصل کرنے کی سعی ہی نہیں کی بلکہ اپنے برادران وطن کو ترغیب دی کہ وہ بھی سیکھیں اور اس طرح پرتگالی زبان میں ہندوستانی زبانوں میں سے بالخصوص کوکنی، مراٹھی اور اردو کے قواعد رومن حروف اور رسم خط میں ملنے لگے۔

کوکنی زبان کی گرامر ۱۶۴۰ ع میں شائع ہوئی اور مراٹھی اور اردو گرامر تقریباً ایک ہی وقت میں منصۂ شہود پر آئیں اردو گرامر کا سن اشاعت ۱۷۷۸ ع لکھا ہوا ہے مراٹھی گرامر ۵۱ صفحات پرمشتمل ہے لیکن اردو گرامر تقریباً ۲+۱۳۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

اردو گرامر کے پہلے پانچ صفحوں پر پھیلی ہوئی ایک تمہید ہے پرتگالی اور اردو کا لسانیاتی طرز پر بنایا ہوا طریقۂ کار اور ہندوستان کے متعلق عام معلومات ملتی ہے اور اپنے علم کے پیش نظر زبان کے بارے میں مؤلف لکھتا ہے کہ ہندوستانی زبان یعنی اردو ہندوستان کی مقبول زبان ہے اور قلمروئے مغلیہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے مزید یہ کہتا ہے کہ تلفظ کے اعتبار سے مقامی بولیوں میں فرق پایا جاتا ہے لیکن وہ دلی کی زبان سے اچھی طرح واقف ہے بقول مؤلف اردو کا آغاز سنسکرت، عربی اور فارسی کی اساس پر ہوا ہے اردو خط رومن الفبا میں پیش کرنے میں اسے بڑی مشکل پیش آئی کیونکہ صوتی اعتبار سے رومن خط میں ایسے حروف نہیں ملتے ہیں۔ تاہم اس نے اردو حروف کو رومن حروف میں لسانیاتی اور صوتی لحاظ سے اپنی اسکیم کی تحت پیش کیا ہے جو بہت ہی مختصر ہے۔ ساتھ ہی ایک فرہنگ ہے جس میں عربی و فارسی الفاظ جو علم ادبیات میں استعمال ہوتے ہیں ان کے مترادفات لاطینی زبان میں دئے ہیں۔ اردو زبان کا تجزیہ کلاسیکو آٹھ اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے کیا ہے اور (کا۔ کے۔ کی) کا اضافہ کیا ہے

اس بیان کے لئے مؤلف نے ۳۲ صفحات لئے ہیں۔

ہندوستانی تراکیب و محاورات کو پرتگالی حروف میں اور ترجمے کی صورت میں تین صفحوں میں پیش کیا گیا ہے۔

آخر میں منتخب الفاظ کا ایک مجموعہ دیا گیا ہے جو گوناگوں قسم کا ہے اور جس سے اسانی زندگی آشکارہ ہوتی ہے یعنی گتی، موسم، یوم اور قیمتی پتھر وغیرہ کے علاوہ سیاسی اور سماجی زندگی کے متعلق الفاظ اور اسی طرح پیشہ ورانہ اور فلسفیانہ اصطلاحات ہیں۔ ساتھ ہی ہندوستان کے سترہ حکمرانوں کے نام تیمور سے لے کر محمد شاہ تک دئے گئے ہیں۔ تتمہ کے طور پر لاطینی زبان میں دو صفحوں میں صاحب تالیف کا اجازت نامہ اور جماعت کا منظوری نامہ درج ہے۔

یہ ہے مختصر تعارف اردو گرامر کا جو پرتگالی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس سے ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں زبان اردو کس قدر مقبول تھی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں اردو قواعد خصوصی طور پر بیرونی زبانوں میں ایک ایسا موضوع ہے جس پر تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے جس سے اور بہت سے ایسے گوشے نمایاں ہوسکتے ہیں جن کی بنا پر اردو زبان کی ساخت و پرداخت کے بارے میں مزید حقائق کا انکشاف ہوسکتا ہے۔

---

* (1) GRAMATICA INDOSTANA
A MAIS VOLGAR QUE SE PRACTICA NO IMPERIO DO GRAM MOGOL
OFFERECIDA AS MUITOS REVERENDOS PADRES MISSIONARIOS
DO DITTO IMPERIO
GRAMATICA INDOSTANA EXPLICADA EM PORTUGUES
ROME BY THE CONGREGATION DE PROPAGANDA FIDE IN 1778

* (۲) راقم الحروف نے اس گرامر کے تعلق سے فرانسیسی زبان کے معاون پروفیسر الین دیرولیر (Alain Desouliers) حال مقیم اسلام آباد (پاکستان) سے رابطہ قائم کر کے استفادہ حاصل کیا ہے

● ● ●

تبصرے

●

جناب سلامت رضوی

ڈاکٹر زرینہ ثانی

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

جناب سلامت رضوی

وفیات ماجدی یا نثری مرثیے

مولانا عبدالماجد دریابادی ایک اچھے صحافی، بلندپایہ ادیب، صاحب طرز انشا پرداز اور زبردست عالم واصل ہی نہیں تھے ایک عظیم مفکر بھی تھے۔ عالم واصل اور مفکر میں بڑا فرق ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

«جو لوگ بڑے عالم واصل ہوتے ہیں ان کی تحریر سراسر مانگے کی ہوتی ہے یہ لوگ جتنے اساتذہ اور ماہرین کی سندیں پیش کریں اور ان کے اقوال جتنے زیادہ اپنی تحریر میں شامل کریں اتنے ہی عالم واصل سمجھے جاتے ہیں، مگر ایک مفکر سارے جگ سے بےنیاز ہوکر اپنے ہی ذہن کی گہرائیوں سے فکر کے موتی نکالتا ہے»

مولانا بلاشبہ مفکر تھے ان کا اشہب قلم یوں تو نشاط و طرب اور تبسم اور قہقہے بکھیرنے پر بھی قادر تھا لیکن درد و الم، آہ و فغاں، فریاد و شیون اور عبرت و موعظت میں ایسی جولانیاں دکھاتا تھا کہ باید و شاید۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ ما من شئ فی المیزان اثقل من حسن الخلق (کوئی شئے حسن اخلاق سے زیادہ وزنی نہیں ترازو میں) کے بمصداق اخلاق کی اعلا قدروں کے بھی حامل تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جس کا اخلاق وسیع ہوگا اس کے تمدنی تعلقات بھی اتنے ہی وسیع ہوں گے۔

وسیع اخـــلاق اور وسیع تمدنی تعلقات ہی کے یہ نمونے ہیں جو ہمیں «وفیات ماجدی یا نثری مرثیے» میں ملتے ہیں۔ «وفیات ماجدی» دراصل مولانائے مرحوم کے وہ تعزیتی مقالے اور شذرات ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کے اخبار «سچ» «صدق» اور «صدق جدید» میں شائع ہوتے رہے ہیں اور جنھیں ان کے خویش، بھتیجے اور جانشین جناب حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی نے کتابی صورت میں جمع کرکے ادب نوازوں کے سامنے عموماً اور مولانا کے پرستاروں کے سامنے خصوصاً پیش کرنے کا فرض منصبی انجام دیا ہے۔

گزشتہ نصف صدی بلکہ اس سے بھی کچھ زائد عرصہ تک مولانا نے اپنے تمدنی تعلقات میں اخلاقی قدروں کو جس طرح نبھایا اور ان سے جس طرح عہدہ بر آ ہوئے «وفیات ماجدی» اسکی بہترین مثال ہے۔

مولانا کے تمدنی تعلقات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہے اس میں جہاں ان کے نزدیک و دور کے رشتہ دار نظر آتے ہیں وہاں احباب اور پڑوسی بھی۔ جہاں برادران دین و ملت ہیں وہیں اہل وطن بھی۔ اس میں چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی اور ہم عمر بھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تعلق جتنا قریب ہے وہاں آہنگ اسی اعتبار سے «تلخ تر» ۔ کہیں آہیں ہیں، کہیں آنسو، کہیں چیخیں ہیں تو کہیں جگر لخت لخت۔

حکیم صاحب نے بڑے سلیقے سے کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ مزید یہ کہ انتخاب میں بھی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ ہر شذرہ اور ہر مقالہ میر کے اس شعر کی تشریح کرتا ہے۔

گلچیں! سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے لخت جگر پڑے ہیں نہیں برگہائے گل

راقم الحروف کو «جااین جاست» کے مصداق سب سے زیادہ جس مقالے نے متاثر کیا ہے وہ ہے «ایک خدمت گار کی یاد میں ص ۳۵

اسلام نے یقیناً غلامی کی بیخ کنی کی ہے۔ پھر بھی ہمارے ملک کے زمیندار مسلم گھرانے آج تک اس لعنت سے چھٹکارہ نہ پاسکے مولانا کا گھرانا بھی زمیندار گھرانہ تھا وہاں بھی پروردے تھے، ایسے ہی ایک «پروردہ» کے انتقال پر پر جو مقالہ مولانا نے سپرد قلم کیا ہے، وہ عبرت اور موعظت اور حقیقت پسندی کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس مقالے میں مولانا خود بھی روئے ہیں اور قاری کو بھی رونے پر مجبور کیا

ہر سماج اور ہر معاشرہ برائی سے پاک و مبرہ ہرگز نہیں ہے یہی حال اسلامی معاشرہ کا بھی ہے یہ بھی طبقاتی کش مکش میں مبتلا ہے۔ مولانا نے اس برائی پر برائی سمجھ کر تبصرہ کیا ہے ذات پات اونچ نیچ اور آقا و غلام کا فرق کو سراہنے والے اور کوئی ہوں گے۔ مولانا نے کھلم کھلا نہ صرف اسکی اپنے خاص انداز میں برائی کی ہے بلکہ وہ چونکہ خود اس میں ملوث رہے ہیں اس لئے خود اپنے اوپر بھی نفرین کی ہے اور خدا سے معافی مانگی ہے

مقالے کی انتہا کس پیار سے اور تیکھے انداز سے ہوتی ہے :

« خدمت گار ! یہ طبقہ بھی بھلا اس قابل ہے کہ « بہاں لوگ » اس کا ذکر خیر اپنی مجلسوں میں کریں ، چہ جائیکہ اخبار کے صفحے میں یہ تذکرے بار بار پائیں ۔۔۔۔ »

ہمارا سماج اس طبقہ کوکس نظر سے دیکھتا ہے ، چند لفظوں میں مولانا نے کس خوبی سے سمجھا دیا ۔ پھر آگے رقمطراز ہیں :

« خدمت گار کا آقا صرف ایک نہیں ہوتا ۔ گھر کی مالکہ ، آقا زادوں ، آقا زادیوں ، ان کے بھائی بھتیجوں سب کی رضا جوئی یکساں اس پر واجب ہوتی ہے ۔۔۔۔ »

یہ ہے ادنیٰ معاوضہ پر اس کے فرائض جو اسے اخلاص ، دیانت داری ، وفاداری ، بہی خواہی اور نمک حلالی کے نام پر انجام دینے پڑتے ہیں ۔ اس طرح مولانا نے گویا خادم ، اسکی خدمتیں اور اس کی کس مپرسی اور مظلوم شخصیت کو ہمارے سامنے پورے قد و قامت کے ساتھ کھڑا کردیا ہے ۔ یہاں تک مولانا صرف آقا کے روپ میں ظاہر ہورہے ہیں لیکن یہاں وہ اسلامی رخ اختیار کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

« میں نے ہاتھ دعا کر اور رو رو کر کہا کہ معافی تو دونوں طرف سے ہونا چاہیے میں نے معاف کیا تم بھی معاف کردو ۔ »

و العافین عن الناس کے قرآنی حکم کی کیا اعلیٰ مثال اور نمونہ ہے ۔ غسل دینے کا منظر اور کفن پہنانے کا سماں اتنا عبرت آموز ہے کہ ہمیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہم « نثری مرثیے » نہیں « انیس کے مرثیے » پڑھ رہے ہیں ۔ ہر منظر دلخراش ہے اور ہر منظر میں درس وموعظت کا ایک عجیب انداز ہے ۔

● ● ●

وفیات ماجدی یا نثری مرثیے مرتبہ حکیم عبدالقوی دریابادی
ناشر : مولانا عبدالماجد دریا بادی اکاڈمی ، لکھنؤ
قیمت ۔ ۱۰ روپے

ڈاکٹر زرینہ ثانی

تلسی داس اور رام چرت مانس

تلسی داس ہندوستان کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ انکی تصنیف رام چرت مانس آج چار سو سال سے محلوں سے لیکر غریبوں کے جھونپڑوں تک اور مندروں سے لیکر گاؤں کے چوپالوں تک بڑے خلوص اور عقیدت سے پڑھی جاتی ہے۔ گیتا کے بعد مانس اس ملک کی مقبول ترین کتاب ہے تعجب ہوتا ہے کہ اتنے اہم شاعر اور اتنی اہم تصنیف پر ہندوستان کی اہم ترین زبان اردو میں اب تک کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر صفدر صاحب نے پہلی مرتبہ خالص محققانہ اور ناقدانہ انداز میں اتنے بڑے شاعر اور اتنی عظیم تصنیف کی خصوصیات اور محاسن سے اردو دنیا کو روشناس کیا۔ تلسی اور مانس پر اس مرتبے اور اس سلیقے کی کتاب شاید ہندی میں بھی نہیں ہے۔ حالانکہ ہندی میں تلسی پر اور تلسی سے منسوب اس وقت تقریباً پانچ سو کتابیں ہیں۔

زیر نظر کتاب میں صاحب موصوف نے ہندو علوم کی صرف ورق گردانی ہی نہیں کی ہے بلکہ انہیں پوری طرح ہضم کرکے ایک صاحب نظر عالم کی طرح ان پر مجتہدانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ سب سے پہلے مصنف نے تلسی کی حیات، شخصیت، مولد اور خاندان کا موضوع لیا ہے اور اس سلسلے میں وہ ہندو جیوتش، معتقدات اور روایات کی ان گہرائیوں تک گئے ہیں جہاں تک ہندو مذہب کے واقف‌کار بھی عام طور پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ توہمات اور اعتقادی روایات میں لپٹی ہوئی تلسی کی حیات مصنف نے دریافت کرلی ہے، لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ تلسی کی حیات کے بہت سے پیچیدہ گوشے ایک صداقت اور حقیقت کی طرح ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ اب تلسی کا مولد، بچپن کے مصائب، گرو کا ورود وغیرھم ایسی باتیں ہیں جن پر شک و شبہے کی بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے

تلسی پر اب تک جو اہم کام ہوا ہے مصنف نے اسکی ستائیس منزلیں متعین کی ہیں۔ پہلی منزل ۱۷۶۱ ع سے شروع ہوتی ہے۔ اس سال آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر ایچ۔ ایچ۔ ولسن نے اپنے مسلسل مضمون « رلیجس سیکٹس آف دی ہندوز » میں تلسی پر پہلی بار تحقیقی اور تنقیدی انداز میں گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد عہد بہ عہد یہ کام آگے بڑھتا گیا جس کی زیر نظر کتاب میں آخری منزل آچاریہ سیتا رام چترویدی کی کتاب تلسی گرنتھاولی ہے۔ جو تین حصوں میں ۱۹۷۳ ع میں شائع ہوئی ہے۔

بشمول « رام چرت مانس » تلسی کے بارہ گرنتھ مستند مانے جاتے ہیں جن میں سے چھ اودھی ہیں اور چھ برج بھاشا میں ہیں۔ ان تمام گرنتھوں کا مصنف نے جائزہ لے کر ان کے مقام اور معیار کا تعین کیا ہے نیز ناگری پرچاری سبھا کی طرف سے متعین ان گرنتھوں کے مرتبین اور ہندی ادب میں ان کے ناقدین پر تنقیدیں بھی کی ہیں۔ مصنف نے ایک اہم کام یہ بھی کیا ہے کہ تلسی کے سارے کلام میں جن جن عوامی یا کلاسکی بحور کا استعمال ہوا ہے، ان کا ایک مختصر جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

تلسی کی زبان، تلسی کے عہد کے شعری رجحان اور تلسی کے عہد کی ناگری تحریر پر بھی مصنف نے ایک بالغ انداز میں نظر ڈالی ہے۔ مصنف نے بتایا ہے تلسی کے علاوہ اودھی ادب کے سارے سر براہ شعرا مسلمان تھے اور اودھی پہلے فارسی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی تھی۔ ملک محمد جائسی کی « پدماوت » اودھی کا منتہائے عروج ہے۔ خود تلسی نے پدماوت سے کافی استفادہ کیا ہے۔

مانس کی کتھا کے سلسلے میں فاضل مصنف کا کام ہمیشہ یاد رہے گا۔ مانس کے ساتوں کانڈ کا ایک ایک جزو کس کس سنسکرت رامائن سے اخذ کیا گیا ہے اسکی واضح نشاندہی کی ہے ساتھ ہی کہانی کے لفظ کی روشنی میں مانس پلاٹ اور کرداروں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ مانس سے مختلف سنسکرت رامائنوں کا تقابل ایک گرانقدر علمی کام ہے۔ مصنف کی نظر میں مانس ہندوستان کی ایک نمائندہ نظم ہے جس میں قدیم ہندو معاشرہ اپنے صحیح خد وخال میں مانس کا بڑا حصہ ہے۔ مانس کے کتنے دوہے اردھالیاں ایسے ہیں جو ہندوستانی زندگی کے مضبوط اصول بن گئے ہیں۔ نئے عہد کی روشنی بھی ابھی تک ان اصولوں پر پر اثر انداز نہیں ہوسکی ہے۔

مصنف نے تلسی سے ماقبل کے شاعر سور اور جائسی سے انکا مواز کیا ہے۔ ان تقابلی مطالعوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تلسی نے ان دونوں شاعروں سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔

تلسی بھگت شاعر ہیں۔ ان کی بھگتی کو ذہن نشین کرانے کے لئے مصنف نے ہندوستان میں رائج بھگتی کے تین راستوں کی وضاحت کی ہے ۱کبیر کی بھگتی ۲سور کی بھگتی اور ۳تلسی کی بھگتی۔ بھگتی کے یہ تینوں فلسفے بڑی بالغ نظری سے بیان کئے گئے ہیں۔

مانس کے رنگا رنگ شعری محاسن سے نمونہ کلام بھی زیر نظر کتاب میں شامل ہے۔ اودھی اور سنسکرت اب اردو رسم الخط میں صحیح پڑھی نہیں جاسکتی لہٰذا حاشیے میں اصل متن بھی ناگری ٹائپ میں درج کردیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

اتنی علمی کتاب میں جابجا طباعت کی غلطیاں دیکھکر سخت افسوس ہوتا ہے۔ اردو مطبعوں میں پروف ریڈنگ کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا جسکے نتیجے میں اغلاط کا ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے کتاب میں مجھے ایک کمی نظر آئی کہ بعض جگہ علمی اور فنی بحثیں اردو قاری کی دست رس سے باہر ہوگئی ہیں۔ حاشیوں اور توضیح سے مزید ان مقامات کو آسان تر بنایا جاسکتا تھا۔

• • •

تلسی داس اور رام چرت مانس، از ڈاکٹر صفدر آہ
ناشر : مہاتما گاندھی سنٹر بمبئی (مہاراشٹر)
قیمت : ۱۵ روپے

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

اردو ڈرامے کا مطالعہ

فاضل مصنف نے ڈراما اور فن پیش‌کش سے اردو ڈرامے اور اردو تھیٹر کا مختصراً تاریخی پس منظر بیان کرنے کے بعد بتایا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جنھوں نے اردو ڈرامے کو نقصان پہنچایا اور اس کی ترقی مغرب کے ترقی یافتہ تھیٹر کی بلندی کو نہ چھو سکی۔

«ہدایت کار اور ہدایت کاری» میں انھوں نے بتایا ہے کہ اسٹیج ڈراموں، فلمی ڈراموں اور ریڈیو ڈراموں میں ایک ہدایت کار کا کیا مقام ہوتا ہے اور وہ کونسی خوبیاں ہیں جو ان میں ایک ہدایت کار کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں مدد کرتی ہیں۔

«ریڈیو ڈراما اور اسٹیج ڈراما» میں انھوں نے ریڈیو ڈراما اور اسٹیج ڈراما کے فرق کو واضح کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ ان دونوں میں میں مماثلت کیا ہے اور مغائرت کیا اور ان کے مقاصد کیا ہیں

«ریڈیو ڈراما روپ» میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ ان ریڈیو ڈراموں کے لئے مواد کہاں سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کو ریڈیو ڈرامے کا روپ دینے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں

«اردو ریڈیو ڈرامے کی تاریخ» میں انھوں نے لکھا ہے کہ ریڈیو ڈراموں کا آغاز ہندوستان میں نشریات کے آغاز کے ساتھ ہی ہوگیا تھا لیکن چونکہ اس کی باقاعدہ تاریخ مرتب کرنے کی کبھی کسی نے کوشش نہیں کی اس لئے اس کی بہت سی کڑیاں اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں اور اس کی تاریخ ایک ادھوری تاریخ ہے۔

آخر کے تین مضامین «اردو کا پہلا ڈراما «سجاد سنبل شمشاد سوسن» اردو کا پہلا ڈراما چند حقائق چند نتائج» میں انھوں نے «اردو کا پہلا ڈراما» پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد بتایا ہے کہ چونکہ اردو ڈرامے

کی تاریخ بھی ادھوری ہے اور اس کے مطالعے کا طریق کار بھی پرانا ہے اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اردو کا پہلا ڈراما واقعی کونسا ہے ، «خورشید» ہے ، «شمشاد سوسن» ہے یا کوئی اور۔

ڈاکٹر اخلاق اثر اردو دنیا کے ایک جانے پہچانے ادیب اور فنکار ہیں۔ ان کے قلم سے اب تک «بال بھارتی» ریڈیو ڈراما کی تاریخ، مکاتیب احتشام «اقبال اور شیش محل» کے نام سے متعدد علمی، ادبی کتابیں نکل چکی ہیں۔ انہیں اردو کے تقریباً سبھی ادبی اور لسانی موضوعات سے دلچسپی ہے مگر ان کا خاص موضوع اردو ڈرامے کا مطالعہ ہے اور اپنے اس پسندیدہ موضوع پر وہ مضامین کی صورت میں مستقل طور پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں اور اردو ڈرامے کے نئے پہلوؤں اور نئے گوشوں کو ہمارے سامنے لاتے رہتے ہیں۔

«اردو ڈرامے کا مطالعہ» اردو ڈرامے سے ان کی اسی مستقل دلچسپی اور لگاؤ کا نتیجہ ہے اردو ڈرامے پر اب تک ایک دو نہیں سیکڑوں کتابیں اور مضامین شائع ہوچکے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ اردو ڈرامے کے مطالعے کو اپنے پورے پہلوؤں کے ساتھ بہت مرتب طریقے پر منطقی اور نتیجہ خیز انداز میں ایک ساتھ پیش کرنے کی کوشش کم ہی کسی نے کی ہے اس اعتبار سے زیر تبصرہ کتاب یقیناً اپنے موضوع کی ایک بڑی اہم اور کارآمد کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف یہ کہ اردو ڈرامے کے سارے اصناف اور ان کے مختلف فنی و ادبی پہلو اپنے تاریخی پس منظر کے ساتھ آگئے ہیں بلکہ اسٹیج ، فلم ، رڈیو اور ٹیلی ویژن کے عام ہوجانے کی وجہ سے آج ڈرامے نے جو رنگا رنگ روپ دھار رکھے ہیں ان کی جھلکیاں بھی ہمیں اس میں ایک ساتھ مل جاتی ہیں۔

کتاب صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے اور صحت املا کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔

● ● ●

اردو ڈرامے کا مطالعہ از ڈاکٹر اخلاق اثر
ناشر ریجنل کالج آف ایجوکیشن، بھوپال
قیمت : درج نہیں
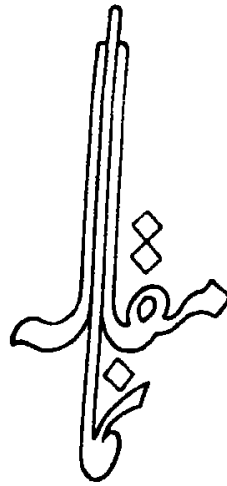
مرتبین

ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی

جمال خیر گل

ندیم نعمانی

مذہبیات

جمیل احمد نذیری مبارکپوری

نکاح، جہیز، ولیمہ، شریعت کے آئینہ میں

ماہنامہ البلاغ، بمبئی، جلد ۲۸ - شمارہ ۸
اگست ۱۹۷۸ء، ص ۲۱

اللہ نے رشتہ مناکحت کا حکم دیا۔ اس رشتہ کو مزید استحکام بخشنے کے لئے شوہر و بیوی کے الگ الگ دائرہ کار کا تعین کیا۔ دونوں کے حقوق مقرر کئے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا حق ادا کرنے کا حکم دیا۔ رشتہ مناکحت دو مختلف گھرانوں اور دو مختلف خاندانوں کے درمیان محبت و تعلق کے اضافے کا سبب ہوتا ہے۔ مضمون نگار نے نکاح، جہیز اور ولیمہ کے سلسلے میں پھیلی ہوئی عام غلط فہمی کا سد باب کرتے ہوئے ان کی تشریح کی ہے۔

دینا ناتھ مست

مذہبی کتابوں میں جانوروں کا ذکر

آج کل، دہلی اکتوبر، نومبر ۷۸ء
ص ۷۷ - ۸۶

ایک معلوماتی مضمون ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ہندو مذہب کی کتابوں، قرآن شریف اور بائبل میں کونسے جانوروں کا ذکر موجود ہے اور کہاں کہاں۔ کافی تحقیق کی گئی ہے۔

سید جلال الدین عمری

اسلام اور سامان تعیش

برہان، دہلی، جولائی ۷۸ء، ص ۶ - ۱۹
" 　اگست ۷۸ء، قسط ۲ ص ۷۰ تا ۸۶

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام نہ تو تعیش والی زندگی پسند کرتا ہے اور نہ ترک دنیا اور رہبانیت کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔

سید سلیمان ندوی

اسلام میں حکومت کی حیثیت اور اہمیت

معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۷۸ء
اکتوبر ۷۸ء، ص ۱۶۵ - ۱۸۲
ص ۲۴۵ - ۲۶۳

سیرۃ النبی جلد ہفتم کا ایک باب جس میں اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندوی

اسلامی ریاست کی اولین بنیاد (نظریہ خلافت)

معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۷۸ء
ص ۴۰۵ - ۴۱۸

اس مضمون میں حضرت آدم کو خلیفہ اللہ بتایا ہے اور یہ خلافت ان کے ورثے سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی ہے۔

سید سلیمان ندوی

سلطنت اور دین کا تعلق

معارف، اعظم گڑھ، نومبر ۷۸ء
ص ۳۲۵ - ۳۴۵

یہ بتایا ہے کہ دین اسلام سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے ۔

سید عزت النساء
شمائل النبی (عبدالصمد تبرین)
معارف ، اعظم گڑھ ، ستمبر ۷۸ ع
ص ۲۲۱ - ۲۲۵
عبدالصمد تبرین عہد مغلیہ کا ایک اعلیٰ الاصل شاعر تھا ۔ اس کی مثنوی شمائل النبی کا ذکر ہے جس میں آنحضرت کے سراپا اور اخلاق و عادات کو نہایت خوبی سے قلم بند کیا گیا ہے ۔

سید محمد ہاشم
مسجد قرطبہ - فکری وفنی حیثیت سے
معارف ، اعظم گڑھ ، اکتوبر ۷۸ ع
ص ۲۹۱ - ۳۰۲
مضمون نگار کا خیال ہے کہ مسجد قرطبہ کی فنی صناعی اور فکری تعمیر کو اقبال نے خود مسجد قرطبہ کی صناعی اور حرم سے ہم آہنگ کر دیا ہے

سید سفیر رضوی
اسلامی رواداری
ماہنامہ البلاغ بمبئی ، جلد ۲۸ - شمارہ ۱۱ ، نومبر ۱۹۷۸ ع ، ص ۲۹ تا ۳۴
اسلام دین فطرت ہے ۔ اسلئے اس نے اپنے متبعین کو غیر مبہم الفاظ میں رواداری اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ حکم کسی شرط کے بغیر ہے اسلام کا ہر پیرو اس بات کا پابند ہے کہ وہ بلا تخصیص رنگ ، نسل اور مذہب ہر شخص کے انسانی حقوق کا خیال رکھے ۔

شاہ نصر احمد پھلواری
امام الحرمین عبدالملک جوینی
معارف ، اعظم گڑھ ، اگست ۷۸
ص ۱۱۵ - ۱۳۲ ستمبر قسط (۲)
ص ۱۸۳ - ۱۹۸
امام الحرمین عبدالملک جوینی کے حالات زندگی ، علمی دینی کارنامے اور سفر کے حالات بیان کئے ہیں ۔

شعیب اعظمی
رومی ہندی شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی
معارف ، اعظم گڑھ ، اگست ۷۸ ،
ص ۱۳۳ - ۱۵۴
مشہور صوفی شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی کے حالات زندگی بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح مولانا روم سے متاثر تھے ۔

عبدالحفیظ چودھری
اسلامی حدود و تعزیرات کا مسئلہ
المعارف ، لاہور ، جولائی ۷۸ ع ص ۱۸ - ۲۷
معاشرے کی اصلاح پر اسلام نے بے حد زور دیا ہے اہٰذا اس ضمن میں اسلامی حدود تعزیرات کا نفاذ بھی وقت کا بنیادی تقاضا ہے ۔ اسلامی سزاؤں کے بارے میں ایک عام تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں وحشت ناک ہیں ہم اس مذہبی دور میں اس پر عمل نہیں کر سکتے ۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ صرف تہذیب و شائستگی کا دامن تھام لینے سے جرائم کا قلع قمع نہیں ہو سکتا ۔ سخت تعزیرات سے ہی معاشرے کی اصلاح کی جا سکتی ہے ۔ کتاب و سنت نے حدود و

تعزیرات کے نفاذ کو ضروری قرار دیا ہے۔
معاشرے کی اصلاح کا یہ بہت بڑا ذریعہ ہے۔

عبدالرحمن کیلانی

بچت اور سرمایہ کاری کا اسلامی نظریہ
المعارف لاہور، ستمبر ۱۹۷۸ء، ص ۲۵۔۳۱
اسلامی اقتصادیات کی روشنی میں غیر سودی بینک کے قیام اور کاروبار کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اور وہ لوگ جو سود کے حامی ہیں ان کے اعتراضات کے جواب میں بچت اور سود، انفرادی بچت اور قومی بچت اور اسلام نظریۂ بچت جیسے موضوعات کا تفصیلی اور مدلل جائزہ لیا گیا ہے ایک معلوماتی اور مفید مضمون ہے۔

شیخ محمود مہدی استانبول

انصاف کی پکار
(ترجمہ خالد کمال مبارکپوری)
ماہنامہ البلاغ بمبئی، جلد ۲۸، شمارہ ۱۰،
اکتوبر ۱۹۷۸، ص ۱۷۔۳۳
مسیحی علماء نے اسلام کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ترجمہ ہذا میں مغربی جرمنی کا واقعہ پیش کیا ہے جس میں ایک عیسائی دولہا اور دلہن نے اسلامی قوانین کی اہمیت پر بیان دیتے ہوئے ان پادریوں کے خیالات کی دھجیاں اڑادیں جنھوں نے بعد از ادائیگی رسوم انہیں نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ ہرگز ظلم و زیادتی نہ کرنا نہ ہی اس کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی کرنا نہ ہی اس کی تحقیر و تذلیل کرنا جیسا کہ مذہب اسلام عورتوں کے ساتھ تحقیر و تذلیل اور بدسلوک کا حکم دیتا ہے۔

جرمنی کے دارالسلطنت میں اس عجیب و غریب اور خطرناک بحث کا اس قدر چرچا ہوا کہ ایوان کمالس میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے جانے لگے۔ مقدس باپ تو ان دلائل اور براہین کو سن کر غش کھاکر زمین پر گرپڑا جو اسلام کی موافقت میں دولہا دلہن کی طرف سے دئیے گئے

ضیاء الدین اصلاحی

یہود اور قرآن مجید
معارف اعظم گڑھ، قسط نمبر ۲،
جولائی ۷۸، ص ۵۔۲۲
قسط نمبر ۳، اگست ۷۸ء، ص ۸۵۔۹۹
ان سلسلہ مضامین میں مضمون نگار نے زمانہ نبوت سے قبل کے یہودیوں کا ذکر کیا ہے اور آنحضرت کی بعثت کے بعد، یہودیوں نے بعثت کے بعد آپ کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا اور ان کو آخر میں اسکی سزا ملی۔

قاضی اطہر مبارکپوری

سلطان العلماء۔ امام عزالدین بن عبدالسلام
ماہنامہ البلاغ، بمبئی، جلد ۲۸، شمارہ ۱۰،
ستمبر ۱۹۷۸ء، ص ۲۹ - ۳۷
ساتویں صدی ہجری میں عالم اسلام موت و حیات کی کشمکش میں تھا علمی و دینی اعتبار سے مایوسی عام تھی مسلمانوں کا عمل اور فکری دائرہ مختلف عوامل کی وجہ سے تنگ تھا ان حالات میں سلطان العلماء امام

عزالدین بن عبدالسلام متوفی ۶۶۰ھ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

ماجد علی خاں

اسلام کا نظریہ اقتدار اعلی

برہان دہلی، ستمبر ۷۸ص ۱۳۴-۱۴۷ قسط اول

" اکتوبر ۷۸، ص ۲۱۰ - ۲۱۸ قسط دوم

" نومبر ۷۸، ص ۲۶۱-۲۷۰ قسط سوم

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی حکومت اپنی سیاسی اور قانونی حیثیت میں فی نفسہ تمام حکومتوں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور دینی بالادست حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کے اعتبار سے نہ صرف عصر حاضر بلکہ عصر قدیم کے بھی تمام اساسی نظریات علاحدہ اپنا ایک منفرد نظریہ رکھتی ہے اس سلسلے میں اساسی نقطہ نظر کی وضاحت سے قبل مغربی نظریات کا سرسری جائزہ بھی لیا گیا ہے

محمد بشیر

آثار شاہ اسمٰعیل شہید

برہان، دہلی، جولائی ۷۸ع ص ۲۰ - ۴۲

قسط اول

اکتوبر ۷۸، ص ۸۷ - ۱۰۷ قسط دوم

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور آپ کی مشہور تصانیف کا ذکر ہے۔

محمد حنیف ندوی

اصطلاحات حدیث

معارف، لاہور، ستمبر ۱۹۷۸ع، ص ۳ - ۱۶

حدیث، اس کی اصطلاحات اور اقسام پر بحث کی گئی ہے صحیح، حسن اور ضعیف حدیثوں کا فرق واضح کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حدیث بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ یا تو مقبول ہے جسے محدثین کے حلقوں میں پذیرائی حاصل ہے یا مردود ہے جسے ان حلقوں نے شرف قبول نہیں بخشا۔

محمد حنیف ندوی

علوم حدیث

ص ۳ - ۱۷

المعارف، لاہور، جولائی ۱۹۷۸ع

بتایا گیا ہے کہ علوم حدیث کون کون سے موضوعات کی روشنی میں سمجھے جاسکتے ہیں مثلاً علو اسناد محدث کا صادق ہونا۔ سند کی پہچان علم المراسیل یعنی مراسیل کے بارے میں پوری پوری واقفیت رکھنا۔ حدیث منقطع اور مسلسل کا علم حدیث مفعن اور حدیث معطل وغیرہ۔

اس کے بعد بحث کی ہے کہ اصح الاسانید کون کون ہیں؟

محمد صدر الحسن

جاپان میں اسلام

معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۷۸ع

ص ۲۲۶ - ۲۳۰

جاپان میں قائم شدہ مرکز اسلامی اس کے بنیادی مقاصد، دعوت و تبلیغ، خدمات و مطبوعات کا معجل جائزہ لیا ہے

محمد عبداللہ قریشی

سیرت عمر فاروق کی چند جھلکیاں

ماہنامہ البلاغ ، بمبئی ، جلد ۲۸ ۔ شمارہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۸ ع ، ص ۳۴ ۔ ۴۰ قسط اول و دوم ، نومبر ۱۹۷۹ ع، ص ۳۶ ۔ ۴۱ جلد ۲۸ شمارہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۸ ع ، ص ۳۶ ۔ ۴۱

مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ کی زندگی کے گوناگـــوں واقعات میں سے چند ایک کی جھلکیاں پیش کرتے ہوئے انکے فہم و تدبر، فراست بار خلافت، حسن سلوک ، رحم دلی اور کردار واطوار کو اجاگر کیا ہے۔

محمد عمیر الصدیق ندوی

امام مزنی

معارف ، اعظم گڑھ ، نومبر ۷۸ع، ص ۲۸۲ تا ۳۹۶ معارف ، اعظم گڑھ ، دسمبر ۷۸ ع ص ۴۴۴ تا ۴۵۷

امام شافعی کے ممتاز اصحاب اور ان کے فقہ کے نامور راویوں میں امام مزنی کا نام سر فہرست ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ان کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے ۔ اس مضمون میں ان کے حالات زندگی اور علمی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔

مفتی محمد شفیع

چہل حدیث

ماہنامہ البلاغ ، بمبئی ، جلد ۲۸ ۔ شمارہ ۸ اگست ۷۸ ع ، ص ۱۵ ۔ ۸ ۔ ۲۰

مفتی اعـظم پاکستان نے احادیث بخاری و مسلم سے نہایت صحیح اور قوی چالیس حدیثوں کو یکجا کیا ہے جن کے بارے میں رسول مقبول صل اللہ علیہ و سلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص دین کے کام کی چالیس حدیثیں سنا دیگا اور حفظ کریگا خدا تعالیٰ اس کو قیامت کے دن عالموں اور شہیدوں میں اٹھاوے گا اور فرمائے گا کہ جس دروازے سے چاہو جنت میں داخل ہوجاؤ۔

مفتی نسیم احمد

ہندوستـان میں علم حدیث ، انیسویں اور بیسویں صدی میں

برہان، دہلی، اکتوبر ۱۹۷۸،ص ۱۹۷۔ ۲۰۹

انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستـان میں علم حدیث کے درس و تدریس کا جائزہ لیاہے ۔

محمد نعیم صدیقی ندوی

المـــوفقات شاطی

معارف اعظم گڑھ ، جولائی ۷۸، ص۲۳-۳۸

ابو الساق شاطبی المتوفی ۷۹۰ھ جوحدیث وتفسیر فقہ و تصوف ، لغت و بلاغت اور اصول فقـہ میں کامل درک رکھتے تھے ان کے حـالات زندگی اور کارنامے بیان کرتے ہوئے ان کی اہم اسلامی قانون کی کتـاب « مـــوسوم بہ الموافقات » شاطی کا جائزہ لیا ہے

نثار احمد فاروقی

حضرت خواجہ معین الدین سنجری اجمیری

تاریخ کی روشنی میں

برہان ، دہلی ، دسمبر ۷۸ ع

ص ۳۲۵ ۔ ۳۳۶ قسط اول

تاریخ کی روشنی میں حضرت خواجہ معین الدین

سنجری اجمیری کے حالات زندگی کا بیان ہے

نجم الثاقب

قرآن مجید کی شانِ خطابت

ماہنامہ البلاغ ، بمبئی، جلد ۲۸ ، شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۷۸ع ، ص ۲۲ - ۳۲

قرآن مجید کا اسلوب معجز نما ہے ۔ مکی سورتوں کی مثال ان پہاڑی نالوں کی جن میں ہیجان ہوتا ہے جوش خروش ہوتا ہے خطابت کا انداز ہوتا ہے جس کا رخ تیزی سے بدلتا ہے ۔ مدنی سورتوں میں ایک قسم کا دھیما پن ہے ۔ ان کی مثال میدانی دریاؤں کی سی ہے جن کا پاٹ وسیع ہے اور ان میں سکون پیدا ہو گیا مکی سورتوں میں توحید معاذ آخرت کے مضامین ہیں مدنی سورتوں میں معاشرتی احکام ہیں ۔ قرآن کریم عقل کو بھی متاثر کرتا ہے ۔ جذبات کو بھی اپیل کرتا ہے حس سماعت کو بھی وحد میں لاتا ہے

نظام الدین اسیر اوردی

عقیدہ توحید اور اسکے عملی تقاضے

ماہنامہ البلاغ ، بمبئی ، جلد ۲۸ ، شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۷۸ ع ، ص ۱۳ - ۲۲ قسط اول

قسط ہذا میں توحیــــد کا منفــــی پہلو اور مشرکین مکہ کا ذکر کرتے ہــــوئے بتلایا ہے کہ توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور کس انسان کا دامن اس سے خالی ہے یا اسکے عملی تقاضوں سے اسکی زندگی دور ہے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مسلمان نہیں ہو سکتا ۔

ابراہیم اشک

اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر

شاعر ، بمبئی ، جلد ۶۹ ، شمارہ ۱۲ ، ۷۸ع

ص ۶۱-۶۶

« پہاڑ اور گلہری » « ماں کا خواب » « پرندے کی فریاد » « شکوہ جواب شکوہ » « بچہ اور شمـــــع » « رات اور شاعر » « شبنم اور ستارے » « ایک پرندہ اور جگنو » « خضر راہ » پیش نظر اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے ۔

ادب ، تنقیـــــد اور لسانیات

اسلام اعــــظمی

نظیر اور عصر جدید

آج کل ، جولائی ۱۹۷۸ ع ، ص ۲۳ - ۲۴

عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے جـــــدت طرازی ، ترقی پسند اور انفرادیت پسندی کی قدروقیمت کو پہچانا اور اسلئے معاصرین سے ہٹ کر شاعری کی ۔ آج جدید دور میں جب ہم ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہمیں اپنے دور کے شاعر نظر آتے ہیں ۔

اشتیاق حسین اظہر

مولانا حسرت موہانی کی ادبی خدمات

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ، جلد ۲۵ ، شمارہ ۸

نومبر ۱۹۷۸ ع ص ۱۹ - ۲۴

حسرت موہانی نے لکھنوی انداز میں رنگ دہلی کی آمیزش سے جدید غزل کو دو آتشہ بنا دیا سینکڑوں غیر معروف شعراء کے حالات ا

شاعری سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اساتذہ کے کلام کو تلف ہونے سے بچایا ۔ اردو زبان کے پانچ قدیم گلدستوں کا اردوئے معلیٰ میں باقاعدہ تعارف کرایا ۔ ۱۱ جلدوں میں انتخاب سخن کے نام سے ۹۰ شعراء ارباب سخن کی دو جلدوں میں سلاسل شعراء اردو ، اور فہرست شعرائے اردو « تذکرۃ الشعراء » نکات سخن میں کلام کے محاسن ، معائب شروکات پر بحث اور اردوئے معلیٰ نامی رسالے سے مسلسل ادبی خدمات انجام دیں ۔

اطہار عالم

اقبال اور غزل نگاری

ماہنامہ فروغ اردو ، لکھنؤ ، جلد ۲۵، شمارہ ۸ ، نومبر ۱۹۷۸ ع ، ص ۵ ـ ۹

اقبال کی غزلوں کا سب سے بڑا فن اور کمال تو یہی ہے کہ غزل کے رائج پیرایہ کو شانہ بشانہ ساتھ لیتے ہوئے بھی اپنے مخصوص پیغام کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے ۔ اقبال کی غزلوں میں (Synechdoche) (علم بلاغت کی ایک صفت جس میں کل کو جز اور جز کو کل میں پیش کیا جاتا ہے) تشبیہ ، بلندی تخیئل ، برجستگی الفاظ ، فلسفہ سہل منبع فطرت پرستی ، اشاریت اور آفاقیت اپنے عروج پر ہے ۔

امیر حسن عابدی

دیوان قبلان کا ایک اہم مخطوطہ

معارف ، اعظم گڑھ ، ستمبر ۷۸ ع ص ۲۱۵ ـ ۲۴۰

دیوان قبلان بیگ کے ایک قلمی نسخہ کی نشاندہی کی ہے جو کہ گورنمنٹ کے کتب خانہ کے مخطوطات (مدراس) میں محفوظ ہے جس میں بیشتر قصائد جہانگیر بادشاہ کی مدح میں ہیں ۔

انجم اعظمی

جدید عہد اور فن

ماہنامہ سب رس حیدرآباد جلد ۴۱ ، شمارہ ۷۵ ، جولائی ۱۹۷۸ ع ص ۳۷ ـ ۴۰

عہد جدید دراصل اس انسان کا عہد ہے جو اپنے مسائل خود اپنی مسلسل کاوش سے حل کر رہا ہے اور ان کا شعور رکھتا ہے ۔ وہ رفتہ رفتہ تضادات سے باہر نکل رہا ہے ۔ قدیم و جدید کے سارے سرمائے کو اپنی بقا کے لئے استعمال کر رہا ہے ۔ ما بعد الطبعیاتی سہاروں کو رد کر کے ایسے سینکڑوں سوالوں کا جواب تلاش کرتے ہوئے اس نے یہ بنیادی نقطہ پا لیا ہے اسے سیاسی ، معاشی ، جنسی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ طبقہ نسل رنگ خون اور مذہب کے تعصبات میں بانٹا جا سکتا ہے ۔ وہ ایک مکمل اکائی ہے جو اپنی بصیرت چاہتا ہے اور اس بصیرت کی ضمانت وہ متحرک فعال فن ہے جس کی بنیاد آج کے انسان کا تخیل ہے ۔

ایوب شاہد

غالب ـ دوہری شخصیت اور تطابق کا مسئلہ

ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ، جلد ۲۵ ـ شمارہ ۸ ، نومبر ۱۹۷۸ع ، ص ۲۵ ـ ۳۰

خطوط میں غالب زندگی کی تمام جزئیات کے

حوالے سے اُبھرتے ہیں۔ ان کی پریشانی گھریلو جھگڑے تعلقات دوست و احباب، مالی پریشانیاں ، قومی اور اجتماعی احساس کا اندازہ خطوط دیتے ہیں۔

غالب کی شاعری سے ان کی شخصیت کا جو ہیولیٰ ابھرتا ہے اس میں خودی انانیت بلند آہنگی، آزادہ روی ، رند مشربی اور ظرافت نمایاں ہے غالب کے یہاں بے حسی اور لاتعلقی کی یہ فضا واضح طور پر ان کی بٹی ہوئی شخصیت میں ناانطباق پذیری کی شاہدہی کرتی ہے

تارا چرن رستوگی

اقبال اور فکر مغرب

شاعر، بمبئی، جلد ۴۹ شمارہ ۱۲ ،۱۹۷۸ ص ۱۹-۲۲

اقبال نے اسلام کے قلعہ کی تعمیر اور اسلام کے مذہبی خیالات کی تشکیل نو کرنے میں مغرب کے فلاسفہ سے استفادہ کیا ان خیالات کی روشنی میں اقبال کے فکر و فن پر بحث کی گئی ہے۔

تنویر چشتی

حروف علت کا سقوط

ماہنامہ تحریک ، نئی دہلی، جلد ۲۶ ، شمارہ ۸ نومبر ۱۹۷۸ ع ، ص ۱۷ - ۱۹

حروف علت کے سقوط کے سلسلے میں چند سوالات اٹھا کر ہم عصر دانشوران عروض سے ان کے جوابات طلب کئے ہیں ۔ لیکن مضمون نگار ان کے جوابات سے مطمئن نہیں ہیں ۔ انہوں نے ان مسائل پر غور کرنے کی دعوت دی ہے تا کہ مسئلہ واضح ہو جائے ۔

جہاں آراء

قرۃالعین حیدر - ایک جائزہ

ماہنامہ سب رس حیدرآباد، جلد ۴۱ شمارہ ۷ جولائی ۱۹۷۸ ع، ص ۲۴ - ۲۶

قرۃالعین حیدر کے افسانوں کی سب سے بڑی ان کی تحریر کی رنگینی دلکشی اور کیفیات کا بیان اور ایک ایسی فضا کی تعمیر ہے جس میں رومان ہی رومان نظر آتا ہے ۔ انہوں نے اس دنیا کی ترجمانی کی ہے جو ہمارے لئے خاص وقعت نہیں رکھتی ان کے باوجود ہمیں اس میں ایک نیاپن اور دلچسپی ملتی ہے ۔ وہ آزاد تکنیک کی پابندی کرتی ہیں اس واسطے بعض اوقات ان کے یہاں خیالات بکھرے بکھرے نظر آتے ہیں ویسے وہ پلاٹ اور کردار کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتیں ان کے ہاں پلاٹ مبہم سا رہتا ہے ان خامیوں کے باوجود کچھ نہ کچھ تاثر قاری پر چھوڑ جاتی ہیں

حامد اللہ ندوی

بھٹکل کے نوائط کی زبان

برہان ، دہلی، ستمبر ۷۸ ع ، قسط اول اکتوبر ۷۸ع ،ص ۱۶۲ - ۱۶۴ قسط دوم ص ۲۱۹ ـ ۲۲۹

بھٹکل کے نوائط کی زبان " نوائطی" بتایا ہے اس کی قواعد سے بحث کی ہے اور اس زبان کی تدریج و ارتقاء کی سفارش کی ہے ۔

خوشحال زیدی

تحقیق کے لئے موضوع کا انتخاب

ماہنامہ سب رس، حیدر آباد، جلد ۴۱
شمارہ ۸، اگست ۱۹۷۸ ع، ص ۱۴ ـ ۱۸
تحقیق میں سب سے مشکل اور پہلا کام محقق کے لئے مناسب موضوع کے انتخاب کا ہے کیونکہ تحقیق کا مقصد محض اعداد و شمار جمع کرنا ہی نہیں بلکہ تجزیہ کر کے صحیح نتیجے پر پہنچنا ہوتا ہے۔

داؤد اشرف

ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارنامے

ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جلد ۴۱،
شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۷۸ع، ص ۱۰ ـ ۱۵
ڈاکٹر زور کا اہم اور پسندیدہ موضوع جس پر خود انہوں نے کام کیا اور کروایا دکنی ادب و زبان اور تہذیب تھا۔ یہ ان کی شعوری کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کی ترتیب و تدوین میر محمد مومن، تذکرہ اردو مخطوطات اور دکن کی ادبی یا تہذیبی تاریخ کے بارے میں جو کچھ قلمبند کیا ہے وہ اصول تحقیق کے اعتبار سے ایک مخصوص انفرادیت کا حامل ہے۔

دوست محمد شاکر

علم نحو اور اس کی ابتدا

المعارف لاہور، ستمبر ۷۸ ع، ص ۳۲ ـ ۳۵
علم نحو کی ابتداء عربوں کے عجمیوں کے ساتھ میل جول کو قرار دیا ہے بالخصوص بصرے اور کوفے کے اہل علم نے اس علم کی آبیاری کی اور اسے کمال تک پہنچایا گردش دوراں کے ساتھ ساتھ کوفہ اور بصرہ میں علم اور اہل علم کی وہ چہل پہل باقی نہ رہی تو بعد میں ایک ایسا دور آیا کہ بغداد علم کا مرکز قرار پایا۔

ذکاءالدین شایاں

شاعری میں زبان کا فطری اور شعوری استعمال

شاعر، بمبئی، جلد ۴۹ شمارہ ۷۸۷ ۱۹ع
ص ۴۷ ـ ۴۹
تخلیقی زبان اور کاروباری زبان کا فرق بتلاتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ شاعری کی زبان فطری نہیں بلکہ شعوری ہوتی ہے شاعر کا ذہن جب شعر گوئی کی طرف راغب ہوتا ہے تو وہ اپنی تخلیق کے لئے استعارات اور علائم کا انتخاب شروع کرتا ہے۔ اور اسی پہلے مقام سے شاعر زبان کی سادہ اور فطری روش سے ہٹ کر فکر و شعور کی دھوپ چھاؤں میں آجاتا ہے مختلف غزلوں اور نظموں کی مثالوں کے ذریعے اس حقیقت کے ثبوت میں دلائل پیش کی گئی ہیں۔

رشید قریشی

ویمنا اور اسکی شاعری

ماہنامہ سب رس، حیدر آباد، جلد ۴۱
شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۷۸ ع، ص ۲۷ ـ ۲۹
ویمنا تلگو شاعری کی صف "شتک" کا عظیم شاعر ہے ویمنا کا رنگ کہیں مصلحانہ کہیں عاشقانہ کہیں رندانہ اور کہیں عارفانہ ہے۔ لیکن جو رنگ ہر رنگ کے پردے میں رہ کر کوندتا ہے وہ فقیرانہ ہے۔ تلگو کا

پہلا عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے اس کے کلام میں یہ ندرت ہے کہ جو بھی تشبیہ اور استعارے استعمال کئے گئے ہیں وہ عام زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کا برجستہ اطلاق کلام کو اسقدر موثر اور دلنشیں بنادیتا ہے سننے، سمجھنے اور ماننے کا ردعمل ایک ہی وقت میں وقوع پذیر ہوجاتا ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی

جگر ۔ شاعر شراب و شباب

قومی راج، بمبئی

۱۰ اگست ۷۸ء، شمارہ ۱۵ ص ۳۳ اور شمارہ ۱۶، ص ۳۶

جگر مرادآبادی کے تغزل پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں شاعر شراب و شباب تھے کیونکہ فطرتاً وہ ایک رند شاہد باز تھے اور شاعرانہ مزاج نے انہیں حسن کو پرکھنے، سمجھنے اور پہچاننے کا ایک اعلیٰ وارفع ذوق عطا کیا تھا۔

زہرہ عرشی

چہار مقالہ کی تاریخی اہمیت

معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۷۸ء

ص ۶۱ ۔ ۶۷

نظامی عروضی سمرقندی کی کتاب «چہار مقالہ» کی تاریخی اہمیت بیان کرتے ہوئے اسے فارسی ادب میں موجودہ دور کی بہترین تصنیف قرار دیا ہے

سرور احمد ماہلی

رومانوی شاعری میں پرندے

آج کل، بمبئی، اکتوبر، نومبر ۷۸ء

ص ۹۰ ۔ ۹۲

اردو شاعری میں پرندے علامت کے طور پر کس طرح استعمال ہوئے ان کا تذکرہ ہے مثال کے طور پر اقبال کی شاعری میں کبوتر، عقاب، شاہین، بلبل اور طاؤس کا تذکرہ۔ اس کے علاوہ عنادل، شہباز، شپرک، چکور، کوئل قمری، طوطی، مرغ چمن، مور، پپیہا، شیاما وغیرہ ذکر عام طور پر اردو شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔

سلیمان اطہر جاوید

اقبال کے کلام میں اشاریت

شاعر، بمبئی، جلد ۶۹ شمارہ ۱۲، ۷۸ء

ص ۳۱ ۔ ۳۶

اقبال کی شاعری میں اشاریت پر بحث کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اقبال کے اشارات کا خصوصی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے بیشتر الفاظ کو جن کا اپنا مذہبی پس منظر ہے اور جو مذہبی تلمیحات کی حیثیت بھی رکھتے ہیں صرف مذہبی اشارات کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا ہے بلکہ ان کو معاشرتی اور تمدنی حیثیت بھی دے دی ہے۔

شبیہ علی کاظمی

اردو کے مختلف نام

ماہنامہ سب رس حیدرآباد، جلد ۴۲ شمارہ ۷ جولائی ۱۹۷۸ء، ص ۱۲ ۔ ۱۸

اردو کے مختلف نام ہندی، ہندوی، بھاکا، بھاشا نبی جی کی بھاشا، سلیمانی بولی ترکوں کی زبان ناگری، کھڑی بولی، زبان اورنگ آبادی، زبان گجراتی، دکھنی زبان، ریختہ (ریختی زبان ہندوستانی، زبان دہلوی، زبان پنجابی) اندوستان زبان مور، آردا، ہندوستانی انڈین ورناکیولہ اردو ہیں۔

شمس الرحمن فاروقی

اقبال کے حق میں ردعمل

ماہنامہ شب خون۔ الہ آباد، جلد ۱۲ شمارہ ۱۰۹
اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۷۸، ص ۴۳ ـ ۴۱

اقبال کو ترجمان حقیقت، لسان القوم حکیم الامت، معمار پاکستان، ہندوستانی قومیت کا پیغمبر انقلاب کی روح۔ فلسفہ اور علم کا مجموعہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے لیکن انہیں شاعر نہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اقبال کو غیر شاعر (یا اول آخر فلسفی اور بیچ میں شاعر) ماننا ہماری تنقید کا المیہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کا مطالعہ بحیثیت شاعر کیا جائے۔

طلحہ رضوی برق

کریما سعدی

معارف، اعظم گڑھ، ماہ اکتوبر ۷۸ ع
ص ۲۶۴ ـ ۲۷۹

یہ بتایا ہے کہ «کریما سعدی» ہر چند کہ کلیات سعدی میں شامل نہیں ہے اور جداگانہ کتابی شکل میں موجود ہے لیکن حقیقت میں یہ سعدی کا کلام ہے

عابدالنساء

سر سید کی اردو خدمات

ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جلد ۴۱، شمارہ ۷
جولائی ۷۸ ع، ص ۲۸ ـ ۳۰

سر سید نے اردو نثر کے حدود کو وسیع تر کر کے نہ صرف اردو زبان کی حفاظت کی بلکہ اسکو غیر معمولی ترقی دے کر اردو ادب کی نشو و نما میں نمایاں حصہ ادا کیا انہوں نے اردو نثر کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ قرار دیا فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کی رسم جاری کی اور ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقاید میں عقل، نیچر، تہذیب مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ادب میں نیا پن ہمہ گیری، مقصد، سنجیدگی اور ایک خاص قسم کی معنویت پیدا کی۔

عابد پشاوری

نسخۂ خوش خط و بسیار غلط

ششماہی نوائے ادب، بمبئی، جلد ۲۸،
شمارہ ۱ جولائی ۱۹۷۸ ص ۱ ـ ۴۸

ڈاکٹر عبدالحق کی تالیف کردہ کتاب «انتخاب حاتم دیوان قدیم» کو اختصار سے خامیوں کا جنگل ہے ان تسامحات کی جانب انتہائی دیدہ ریزی سے اشارے کئے ہیں جن سے مولف باسانی بچ سکتے تھے اگر وہ تربیت و تجربہ سے کماحقہ واقف

ہوئے اور ادبی دیانت داری سے کام لیتے ہوئے کتاب مرتب فرمائی ہے۔

عبدالسلام خاں رامپوری

اقبال اور اس عربی

برہان، دہلی، نومبر ۷۸

ص ۲۷۹ - ۲۸۹ قسط اول

دسمبر ۷۸، ص ۳۴۷ - ۳۵۰ قسط دوم

اس مضمون میں اقبال اور اس عربی کے بعض خیالات میں ہم آہنگی پائی جانے کی شہادتیں دی گئی ہیں۔

عبدالقوی فاروقی

دوسرے غالب: ابوالکلام آزاد

ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جلد ۴۱،

شمارہ ۹، ستمبر ۷۸ ص ۱۶ - ۲۴

غالب اور مولانا آزاد کے خانوادوں کے صوری اور معنوی امتیازات کا جائزہ لیجئے معاً انکے سماجی اور علمی وجاہت پر غور فرمائیں تو واضح طور پر محسوس ہوگا کہ درصل یہ دونوں خالق کی دو عظیم صفات جلال و جمال کے کلیتاً دو خارجی مظہر ہیں۔ غالب کے پیکر خیال اور نقش تصور کو مولانا نے اپنی سر گذشت کے احوال و واردات کے مرقع میں حس والہانہ انداز سے پیش کیا ہے اس سے اس بات کی توثیق ہو جاتی ہے کہ مولانا دوسرے غالب کہلانا اپنے لئے موجب افتخار سمجھتے تھے۔ الحاصل مولانا نے غالب کی نازک نمنائی روح کو نثر میں ڈھالنے کی جو شعوری کوشش کی ہے اس سے اردو نثر کو ایک باوقار انداز اور اس کے آہنگ و تخیل کو ایک نیا وژن Vision مل گیا ہے۔

عبدالمغنی

اختر اور ینوی بہ حیثیت نقاد

شاعر، بمبئی، جلد ۴۹ شمارہ ۱۵، ۷۸ء

ص ۲۵-۳۷

اختر اورینوی کی تنقیدی مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات بہت وسیع اور رنگا رنگ ہیں قدیم و جدید نثر و نظم اور نظریاتی و عملی ہر قسم کے ادبی مسائل پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔

عتیق جیلانی سالک

جدیدیت - ایک عصری تحریک

شاعر بمبئی، جلد ۴۹،

شمارہ ۷، ۷۸ء، ص ۵۴ - ۵۵

جدید اور جدیدیت کی اصطلاحوں اور ان کا فرق بتاتے ہوئے جدیدیت کے رجحان پر بحث کی گئی ہے۔ کہ جدید شاعری و افسانہ تخلیقی مزاج میں اپنے تجربات اور فرد کی داخلی کیفیات پر زور عصری سماجی آویزش کے مطالعے سے گریز کا نہیں بلکہ اس کوشش میں ناکامی اور احساس عجز کے اظہار کا دوسرا نام سمجھا گیا انسانی مسائل حیات کی طرح جدید ادب یا تجریدی ادب سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

علی جواد زیدی

چکبست کی قومی شاعری

ماہنامہ سب رس ، حیدرآباد ، جلد ۴۱ ،
شمارہ ۸ ، اگست ۷۸ء ، ص ۱۰ ۔ ۱۳ ۔
چکبست کو وطن سے والہانہ عشق ہے ۔ ان کی یہ محبت صرف جذباتی نہیں ہے بلکہ اس میں سماجی اور سیاسی شعور نمایاں ہے ۔ ان کا جذبہ محبت صرف نعرہ ترقی اور نصیحت گوئی پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ وہ جذبہ عمل کا طالب ہے ۔ وہ قربانیوں کی مانگ کرتا ہے چکبست کی قومی شاعری اپنی پیش رو قومی شاعری سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ یہ جوانی کی آواز ہے ۔ وہ نہ صرف اردو شاعروں میں بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے شعرا پر ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں ۔

فضل امام

دیوان درد اور خواجہ میر درد

شاعر ، بمبئی ، جلد ۴۹
شمارہ ۷ ، ۸ ، ۷۸ ء ، ص ۳۵ ۔ ۴۱
دیوان درد کے متعدد قلمی نسخوں کی دریافت پر بحث کرتے ہوئے درد کی زبان شاعری حسن ادا اور تصوف پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی خاص طور پر درد کی شاعری میں فلسفۂ تصوف پر بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا ہے خواجہ میر درد تنہا ایسا غزل گو شاعر ہے جس نے صرف اور محض عشق حقیقی سے اپنے جذبے کو گرمایا ہے ۔ لیکن وہ تیرا ناصح اور زاہد خشک نہیں نغمگی اور شعریت درد کی غزل گوئی کی بنیادی خصوصیات ہے ۔

فضیل جعفری ۔

میرے بھی صنم خانے

سماجی حقیقت نگاری کی ایک سمت

ماہنامہ شاعر ، بمبئی ، جلد ۴۹
شمارہ ۷ ، ۸ ، ۷۸ ء ، ص ۱۳ ۔ ۱۷
اردو فکشن کے جدید مغربی رجحانات کے اثرات کی روشنی میں قرۃالعین حیدر کے ناول میرے بھی صنم خانے پر ایک تنقیدی بحث کی گئی ہے ۔ جعفری صاحب قرۃ العین پر لگائے گئے اس الزام کی تردید کرتے ہیں کہ ان کی تحریر پر ورجینیا ولف کا اثر ہے ۔ نیز یہ کہ وہ شعور کی رو سے کام لیتی ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ قرۃ العین حیدر ان مغربی ناول نگاروں کے زیر اثر کہی جاسکتی ہیں جنہوں نے ناول کو دروں بینی ، متعلقہ کرداروں کے لاشعور کے مطالعے ، نفسیاتی پیچیدگیوں اور داخلی حقیقتوں کے اظہار کے لئے استعمال کیا " میرے بھی صنم خانے " میں قرۃ العین نے ایک منطقی اور سا اوقات وحشیانہ حدود تک پہنچ جانے والے نظام یعنی سماج کے مقابلے میں نجی اور ذاتی قدروں کو کھڑا کیا ہے اس طرح میرے بھی صنم خانے کا مطالعہ قرۃالعین کے مجموعی ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کی طرف پہلا قدم ہے ۔

کیول رام ملانی

سندھی شاعری کل اور آج

ماہنامہ تحریک ، نئی دہلی ، جلد ۲۶ ، شمارہ ۸
نومبر ۷۸ ء ص ۳۲ ۔ ۳۵ ۔

سندھی کی ابتدائی شاعری میں تصوف نمایاں ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹی سب سے اہم شاعر ہیں شاہ کا ریگستانی سنگیت ایک ماورائی خواب کو متشکل کردیتا ہے اور عادیت سے بہت اوپر اٹھالے جاتا ہے موجودہ دور میں شاعری کی تمام اصناف وائی کافی دوہا، غزل وغیرہ میں شاعری کا رنگ و آہنگ جداگانہ اور بالکل نیا ہے شیام کی ایاز اور شاعری کو نہ تصوف سے کوئی واسطہ ہے نہ روایتی شاعری کے دوسرے عناصر ہیں۔ سندھی کے جدید ترین شعرا نظم و نثر کے فرق کو نہیں مانتے۔ آج کا شاعر عوام کی مید شاعرانہ زندگی کا نمائندہ ہے۔

گیان چند

اردو کے آغاز کے نظریے

سہ ماہی ہندوستانی زبان، بمبئی، جلد ۹، شمارہ ۳-۴، جولائی اکتوبر ۷۷ ص ۱-۱۴

اردو کے آغاز کا طے کرنا ماہرین لسانیات کا کام ہے۔ زبان کا وجود قدیمی ہوسکتا ہے لیکن اس کا نام بہت بعد میں طے پاتا ہے۔ مندرجہ بالا اصول کو سامنے رکھ کر صاحب موصوف نے میر امن، محمد حسین آزاد، نصیرالدین ہاشمی، سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی جیسے زباندانوں لیکن لسانیات کے درک سے عاری اور ڈاکٹر زور، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری اور گریرسن جیسے تاریخی لسانیات پر نظر رکھنے والوں کی آراء بیان کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔ اول کھڑی بولی کا آغاز دوسرے کھڑی بولی میں عربی فارسی لفظوں کا شمول جس کا نام اردو ہوجاتا ہے۔

لئیق صلاح

فیض جاری

ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جلد ۴۱ شمارہ ۷، جولائی ۱۹۷۸ ع، ص ۲۰-۲۲

"فیض جاری" میر شمس الدین فیض کی منظوم لغت ہے۔ جس میں وہ اس طریقے پر کاربند ہیں کہ ہر شعر میں کسی لفظ کے عربی فارسی اور ہندی مترادفات بیان کئے جائیں۔ مضمون نگار نے مذکورہ بالا کتاب کے مختلف ایڈیشنوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے

مجید بیدار

فن ترجمہ کا ادبی جائزہ

ماہنامہ سب رس، حیدرآباد جلد ۴۱۔ شمارہ ۸ اگست ۱۹۷۸ ع، ص ۲۵-۲۷

اردو کا جدید اسلوب نثر در حقیقت تراجم کی دین ہے اردو کے ادبی مواد سے تراجم کے ذخیرے کو علیحدہ کر دیا جائے تو اسکی حیثیت بے ستون سائبان کی مانند ہوجائیگی دنیائے ادب میں اردو کی تقدیر اسی سبب ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس نے قوموں کی مختلف الخیال فکروں کو یکجہتی کا درس دیا تخلیق اور تراجم میں اگرچہ نمایاں فوق ہے لیکن ایک ابھرتی ہوئی قوم یا ترقی یافتہ تہذیب کے لئے تراجم کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے

مرزا خلیل بیگ

ادبی مطالعہ و تنقید اور لسانیات

سہ ماہی ہندوستانی زبان ، بمبئی، جلد ۹ شمارہ ۳ - ۴ جولائی اکتوبر ۱۹۷۷ ع ، ص ۱۵ - ۳۴

موجودہ صدی کے آغاز سے مطالعہ زبان کی نئی راہیں کھلیں ۔ لسانیاتی علم کے سائنسی و معروضاتی انداز فکر اختیار کرنے پر ادبی علوم میں تبدیلی آئی ادب و شاعری کے اسلوب کے لسانیاتی نقطہ نظر سے مطالعے کا نام «اسلوبیات» (Stylistics) لکھا گیا ۔ دیار یورپ میں اس فن نے کئی نئے موڑ اختیار کئے اور اردو میں بھی اس موضوع پر بکثرت لکھا گیا لیکن انداز فکر زیادہ تر ادبی رہا اس ضمن میں مسعود حسین خان ، گوپی چند نارنگ ، مغنی تبسم ، شمس الرحمٰن فاروقی عتیق احمد صدیقی، شمیم احمد اور مرزا خلیل بیگ کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو میں لسانیاتی نہج پر بہت کام کرنا باقی ہے ۔

منظر کاظمی

نثر کے جدید رجحانات

ماہنامہ شب خون، الہ آباد جلد ۱۲ شمارہ ۱۰۸ مئی ، جون ، جولائی ۷۸ع ص ۲۱ - ۳۲

نثر کوئی صنف نہیں ، اظہار کا ایک منظوم ذریعہ ہے ۔ نثر کی ایجاد ایک انسان کی دوسرے انسان سے ذہنی اور جسمانی قربت کا نتیجہ ہے ۔ نثر جنگل کے مقابلے میں شہر کی زبان ہے نثر جدید تقاضوں کی بنیاد پر بننے والے معاشرے کا وسیلہ اظہار ہے ۔ اس وسیلہ اظہار میں اپنے سے زیادہ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ ہندوستان کی فضا انشائیوں کے لئے سازگار نہیں طنز و مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لئے معاشی آسودگی ضروری ہے ڈرامہ پڑھنے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہوتی ہے ۔ ناول کا حال اچھا نہیں ۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کی پسپائی کے بعد انسانوں اور تنقید نے بلا شبہ نئی دنیا آباد کی ۔ یہاں بھی اپروچ ، انداز نظر اور افہام و تفہیم کے پس منظر میں تنقید کا سفر افسانوں کے مقابلے میں زیادہ فطری اور نسبتاً بالغ نظری کا ثبوت فراہم کرتا ہے جدید معاشرہ تمام سائنسی ترقیات اور صنعتی فروغ کی متعلقہ خصوصیات کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا اثر نثر میں زیادہ ہے ۔

ہریش کمار

ادب کی پرکھ اور قاری

آج کل دہلی ، اگست ۷۸ ، ص ۳۰ - ۲۹

ادب اور قاری کے باہمی سمجھوتے پر بحث کی گئی ہے کہ ادب کی پرکھ کے لئے سب سے اول چیز ہے ادبی رجحان کا پیدا ہونا، قبول کرنا یا رد کرنا ادب کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی قاری کے ذہن کو بیدار کرتی ہے اور تب وہ ادبی تخلیق کو اس کے خالق کے ذہنی عمل کے پس منظر میں دیکھنے لگتا ہے ۔ ادب کی پرکھ کے لئے قاری کا

سیدار ذہن ، ادب پسند، باریک بین ہونا
اتی ضروری ہے ۔

بت سلطانہ
اردو قصیدہ نگاری میں مومن کی اہلیت
اعر بمبئی ، جلد۴۹ شمارہ ۱۰ ۷۸ء،
ص ۵۶-۵۸
ومن کے قصیدوں کی فنی خوبیوں پر بحث
ی گئی ہے مومن کے قصائد ایک بلند
رجہ رکھتے ہیں ان کی علمی لیاقت اور
ور شاعرانہ بلند بخوبی ظاہر ہوتی ہے

وحید اشرف
مثنوی اسرار خودی پر ایک نظر
معارف ، اعظم گڈھ ، ماہ اگست ۷۸ ،
ص ۱۰۰ - ۱۱۴
اقبال کی مشہور مثنوی «اسرار خودی»
کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

وقار احمد رضوی
فکر اقبال کے چند پہلو
برہان، دہلی ، دسمبر ۷۸ ص ۳۵۱ - ۳۶۴
فکر اقبال کے چند پہلوؤں اور ان کی شاعری
کے تاریخی پس منظر اور فلسفہ وفکر کا
کا اظہار کیا ہے ۔

شخصیات

اقبال مسعود
ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی شاعری
آج کل، ستمبر ۷۸ ع ص ۲۵ - ۴۰
غالبیات کے ماہر بجنوری نہ صرف ایک
اچھے تنقید نگار تھے بلکہ شاعر بھی تھے

اس مضمون میں ان کے اسلوب کی دلکشی
اور زبان کی سادگی کو مد نظر رکھتے
ہوئے ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ
لیا گیا ہے

جمیلہ شوکت
محمود بن عمر زمخشری
المعارف، لاہور جولائی ۷۸ ، ص ۲۸ - ۴۸
مشہور معتزلی عالم محمود بن زمخشری ۴۶۷ھ
میں زمخشری میں پیدا ہوئے ۔ بخارا میں
تحصیل علم کی یہاں تک کہ علم معانی وبیان
میں امام تسلیم کیے گئے ۔ مختلف موضوعات
پر متعدد کتابیں تالیف کیں ۔ جن میں ان کی
تفسیر « الکشاف » کو خاص اہمیت حاصل
ہے ۔ ۵۳۸ ھ میں جرجانیہ میں انتقال فرمایا ۔

حبیب الرحمن
مولانا محمد شبلی کے ایک استاد
مولانا محمد فیض اللہ مئوی
معارف ، اعظم گڈھ ، اکتوبر ۷۸ ،
ص ۳۰۳ - ۳۱۲
علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے ایک باکمال
استاد مولانا فیض اللہ کے حالات زندگی اور
علمی و دینی مشاغل بیان کئے ہیں ۔

خلیل اللہ خان
مولانا عبدالماجد دریا بادی - چند تاثرات
قومی راج ، بمبئی، ۱۰ ستمبر ۷۸ ، شمارہ ۱۷
ص ۲۲ - ۲۳
مولانا عبدالماجد دریا بادی علم وادب اور
تصوف کی دنیا کا ایک درخشاں ستارہ

تھے ۔ مضمون نگار نے ان کی زندگی سے وابستہ چند یادگار لمحات کو تاثرات کی شکل میں پیش کیا ہے ۔

ریاض الرحمٰن خاں شیروانی

خطیب بغدادی اور ان کے بعض مخطوطات

معارف ،اعظم گڑھ ، نومبر ۷۸ ع

ص ۳۷۴ ۔ ۳۸۱

معارف اعظم گڑھ ، دسمبر ۷۸ ع

ص ۴۱۹ ۔ ۴۳۶

خطیب بغدادی کے مختصر حالات زندگی اور ان کے بعض اہم مخطوطات کا ذکر کیا ہے ۔

سید محمود

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

شاعر بمبئی ، شمارہ ۱۵ ، ۱۹۷۸ ع ،

ص ۱۹ ۔ ۲۱

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ڈرامے کے ضمن میں ان کے کارناموں کا ایک تنقیدی و تعریفی جائزہ لیا گیا ہے

ضیاء الدین اصلاحی

یاد خلیل

معارف ، اعظم گڑھ ، جولائی ۷۸ع

ص ۶۸۔۷۳

«وفیات» کے عنوان کے تحت خلیل الرحمان اعظمی کی زندگی اور اہم شعری و ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے

ضیاء الدین انصاری

سر سید بہ حیثیت شاعر

آج کل دہلی ، اگست ۱۹۷۸ ع ص ۳۱ ۔ ۳۴

سر سید عام طور پر اپنی منفرد نثر نگاری کے لئے مشہور ہیں لیکن اس مضمون میں ان کی شاعرانہ حیثیت واضح کی گئی ہے اور ان کی اردو اور فارسی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

عبدالغفار انصاری

میر غلام علی آزاد بلگرامی

برہان دہلی ، نومبر ۷۸ ع ، ص ۲۹۰ ۔ ۲۹۵

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات زندگی واقعات کا ذکر ہے ۔

عتیق صدیقی

ڈاکٹر سید حسین

آج کل دہلی ، اگست ۷۸ ع ، ص ۱۶ ۔ ۱۸

اردو کے مشہور صحافی ، روزنامہ انڈی پنڈنٹ کے ایڈیٹر ، تحریک آزادی کے ایک سرگرم کارکن ڈاکٹر سید حسین کی سیاسی و صحافتی زندگی کا ایک تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے

عطا کاکوی

بسمل عظیم آبادی

آج کل ، دہلی ، ستمبر ۷۸ ع ،ص ۵۶

بسمل عظیم آبادی ان بدقسمت شاعروں میں سے تھے جن کا یہ شعر تو ایک زمانے سے زبان زدِ خاص و عام ہے

سر فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

لیکن وہ گوشۂ گمنامی ہی میں ہے اور ان کی موت پر عطا کاکوی نے یہ مضمون تحریر کیا ہے

عظیم الشان صدیقی
انتظار حسین - فکر و فن
آج کل دہلی، جولائی ۷۸، ص ۹ - ۱۴
انتظار حسین نے اردو افسانہ نگاری میں اپنا جو منفرد مقام قائم کیا ہے اس کا ایک تنقیدی جائزہ لیا گیا اور پاکستان سے قبل اور بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں، ان دونوں میں کیا فرق ہے اس کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے

قمر علی قمر
فائز دہلوی اور ان کی شاعری
شاعر بمبئی، جلد ۴۹ شمار ۱۰، ۷۸ع،
ص ۴۵ - ۴۸
صدر الدین محمد خاں فائز کے حالات زندگی، تصانیف اور شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ خاص طور پر ان کے متعدد مثنویوں کا ذکر ہے قصیدوں پر بھی تبصرہ ہے اول غزل میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔

محمد عظیم فیروز آبادی
اختر شیرانی
شاعر بمبئی، جلد ۴۹ شمارہ ۹، ۱۹۷۸ع،
ص ۴۹ - ۲۸
اختر شیرانی کی زندگی کے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

منصور عالم
قاضی عبدالودود - بہ حیثیت محقق
آج کل دہلی، ستمبر ۷۸، ص ۱۱ - ۱۶
اردو تنقید و تحقیق میں قاضی عبدالودود کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ قاضی عبدالودود کی تحقیق ان کی تنقید کی شکل میں زیادہ ابھری ہے۔ وہ دوسروں کی تحقیقات کا جائزہ لیتے ہیں اور کہیں کوئی کمی پاتے ہیں تو اس کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں

منصور نعمانی ندوی
حافظ نماری کی تصانیف
معارف، اعظم گڑھ، ماہ اکتوبر ۷۸ع
ص ۲۸۰ - ۲۹۰
اس مضمون میں حافظ نمازی کی تصنیفات کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے

متفرقات

ارشد اعظمی
تذکرۃ الحساب تراب علی لکھنوی
برہان، دہلی، نومبر ۷۸ع، ص ۲۷۱ - ۲۷۸
تیرھویں صدی کی مایہ ناز علمی شخصیت اور عصری صلاحیت کے مالک صاحب درس و تدریس اور متعدد کتابوں کے مصنف تراب علی لکھنوی کے حالات زندگی بیان کئے ہیں

امتیاز علی خاں عرشی
تصور زماں و مکاں کی بحث سے متعلق اقبال کا ماخذ - عراقی کا ثنوی
ماہنامہ تحریک، نئی دہلی، جلد ۲۶، شمارہ ۹ دسمبر ۷۸ع، ص ۱۵ - ۲
فاضل مضمون نگار نے اپنے وسعت مطالعے

کی بناء پر یہ فرمایا ہے کہ علامہ اقبال نے تصور زماں ومکاں کے سلسلے میں عراقی کے جس رسالے کا حوالہ دیا ہے اس کا نام « غایۃ الامکان فی درایۃ الزماں » ہے لیکن عراقی کے کسی تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا رضا لائبریری کے فن تصوف فارسی میں اس نام کا ایک رسالہ موجود ہے جس میں زماں ومکاں سے متعلق علامہ کی نقل کردہ باتیں جوں کی توں موجود ہے۔

ملا جامی نے نفحات الانس میں غایۃ الامکان فی معرفۃ الزماں والمکان نام بتایا ہے یہی نام کشف الظنون میں اختیار کیا ہے حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں صاحب الرسالہ کا نام شیخ محمود الاشنوی بتایا ہے۔

انیس اشفاق

جدید افسانے میں ترسیل کا مسئلہ

شب خون، الہ آباد، جلد۱۲

شمارہ ۱۰۸، مئی، جون، جولائی، ۷۸ع

ص۵۵ - ۵۸

نئی تخلیقی زبان اپنی معنوی اکائیوں کے جس شعوری، تحت الشعوری یا لاشعوری عمل سے گذر رہی ہے اس میں ترسیل نظام و ربط ہوتے ہوئے بھی عام طور سے غیر واضح اور غیر مبہم سا محسوس ہوتا ہے ایک قاری جب تک رمز شناسی کا عادی نہیں ہوگا ترسیل کا مسئلہ برقرار رہے گا۔ ترسیل کے لئے ضروری ہے کہ افسانے کا علاقی نظام قاری کے ذہنی اور فکری نظام سے ہم آہنگ ہو یا اسے ہم آہنگ بنانے کی قوت رکھتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ علامتی نظام فیشن کے طور پر نہیں بلکہ اپنی شعوری اور لاشعوری سچائیوں کی جامع، مثبت، موثر اور موزوں استعاراتی اکائیوں سے بنایا گیا ہو

ریاض الدین احمد

تخلیق آدم کے مراحل

معارف اعظم گڈھ، ستمبر ۷۸

ص ۱۹۹ - ۲۱۴

تخلیق آدم کے مختلف مراحل کا جائزہ قرآن کریم و سائنسی علوم کی روشنی میں کیا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

لاہور کے علمی تحائف

معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۷۸،

ص ۴۸ - ۶۰

ماہ نو کا اقبال نمبر۔ ثقافت سہ ماہی کا اقبال نمبر، پاکستان مصور کا اقبال نمبر، پاکستان پکٹوریل کا اقبال نمبر۔ ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ کا اقبال نمبر ماہنامہ محفل کا اقبال نمبر، نہر و مردم کا اقبال نمبر ان سب کا ذکر کیا ہے۔

سید محبوب رضوی

مثنوی فروغ

برہان، دہلی، جولائی ۷۸ع ص ۴۳ - ۵۶

« مثنوی فروغ » دارالعلوم دیوبند کی ایک قدیم منظوم تاریخ ہے یہ مثنوی دارالعلوم دیوبند اور اکابر دارالعلوم کے ابتدائی حالات

کا الخیب مرقع ہے اور چشم دید شہادت ہونے کی وجہ سے مستند ماخذ اور ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

شبیر احمد خان غوری

راجہ جے سنگھ کی رصد گاہیں

معارف، اعظم گڑھ، نومبر ۷۸ ع

ص ۳۳۶ - ۳۷۳

مشہور فاضل علم الہیئت جی . آر . کے کی مشہور کتاب (The Astronomical Observations of Jai Singh) کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

شہاب مالیر کوٹلوی

ایک اہم تحریر

ششماہی نوائے ادب " بمبئی، جلد ۲۸ شمارہ ۱ جولائی ۱۹۷۸ع ص ۶۲

ادارے نے مولانا شہاب کوٹلوی کی ایک اہم تحریر شائع کی ہے جس میں انہوں نے اپنے ان اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے جن سے انہوں نے علم دین حاصل کیا۔

صفدر علی بیگ

ہندوستان کی آزادی کی تحریک

ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جلد ۴۱، شمارہ ۸ اگست ۱۹۷۸ ع ص ۴ - ۸

ہندوستان میں سیاسی جدوجہد کے لئے سب سے پہلے جو چیز ضروری تھی وہ اتحاد و اتفاق، حب الوطنی اور ایثار و قربانی کا جذبہ تھا۔ ایسا جذبہ خصوصیت کے ساتھ شعر و ادب کے ذریعہ آسانی سے عام ہو سکتا تھا۔ اردو کے شعرا نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اس زمانے کی تمام عوامی اور سیاسی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں شعرائے اردو کبھی پیچھے نہیں رہے

فکری سلطانپوری

عشق و عقل

ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ، جلد ۲۵، شمارہ ۸ نومبر ۷۸، ص ۱۰ - ۱۸

عشق و عقل کی نظریاتی بحث میں مولانا جلال الدین رومی، نظامی گنجوی، علامہ اقبال، فیضی، غالب، ورڈس ورتھ اور جوش ملیح آبادی کی آراء و بیان کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ اول الذکر تین شعراء نے عشق کو برتر ثابت کیا ہے اور باقیوں نے عقل کو برتر کہا ہے۔

Edited by Dr. Nizamuddin S. Gorekar,
Director, Anjuman - i - Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Shri A. M. Patka
General Secretary Anjman -i- Islam, Bombay 400 001
and Printed by him from Adabi Printing Press,
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400 008

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب ، بمبئی

رجسٹریشن نمبر ۵۰-۳۲۰۰۹

Registration No. 32009/50

مقام اشاعت : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نوعیت اشاعت : ششماہی

نام پرنٹر : جناب عبدالمجید پالکا بی، کام (آنرز)

قومیت : ہندوستانی

پتـــہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پبلشر
قومیت
پتـــہ
} ایضاً

نام ایڈیٹر : ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ

قومیت : ہندوستانی

پتـــہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پتہ مالک رسالہ : ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

● ● ● ●

Annual Subscription

Inland : Rs. 10 00 ● Foreign : Shillings 20

All remittances & correspondence be made to

Dr. N. S. Gorekar

Director

Anjuman-i-Islam Urdu Research Institute

92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

NAWA-E-ADAB

BIANNUAL

ANJUMAN-I-ISLAM

URDU RESEARCH INSTITUTE

92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

نوائے ادب

ششماہی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲۔ دادابھائی نوروجی روڈ

بمبئی ۱

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

(بمبئی یونیورسٹی سے ملحق)

اغراض و مقاصد

۱ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام کرنا
۲ اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والے طلبہ کی اعانت کرنا
۳ تحقیقاتی کام کرنے والے اداروں اور جامعوں سے تعاون کرنا
۴ ایک جامع کتب خانہ اور دارالمطالعہ کا قیام کرنا
۵ مختلف کتب خانوں کے اردو کے مخطوطات کی فہرست کو ترتیب دینا
۶ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت کرنا
۷ اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی مجلہ کا اجراء کرنا
۸ اردو کے فروغ کے سلسلہ میں ہر امکانی کوشش کرنا

نوائے ادب بمبئی

خصوصیات

۱ اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲ گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی بالخصوص اشاعت
۳ اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴ اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت
۵ اردو و دیگر کتب پر تبصرے

•

ترسیل مضامین و خط و کتابت کا پتہ
ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر

ڈائرکٹر

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱

نوائے ادب ممبئی

ششماہی

مدیر
نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۲۹
شمارہ ۲

اکتوبر ۱۹۷۹ء

مندرجات

انجمن اسلام کی مجلس عاملہ

صدر

جناب معین الدین حارث

●

نائب صدر	نائب صدر	نائب صدر
جناب مصطفیٰ فقیہ	محترمہ ہمائے پیر بھائی	جناب عزیز احمد بھائی

جنرل سیکرٹری	خازن اعزازی
جناب عبدالمجید پالکا	جناب عبداللہ فقیہ

اراکین

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا	ڈاکٹر عبدالکریم نائیک
(چیرمن : سیکنڈری بوائز بورڈ)	(چیرمن : سوشیل ویلفر بورڈ)
جناب مامون لقمانی	محترمہ زلیخا مرچنٹ
(چیرمن : ہائر ایجوکیشن بورڈ)	(چیرمن : سیکنڈری گرلز بورڈ)
جناب فیض جسدن والا	جناب عبدالستار عمر
(چیرمن . ٹیکنکل ایجوکیشن بورڈ)	(چیرمن : پراپرٹی و ریپیر بورڈ)
جناب عبدالقادر حافظکا	محترمہ زرینہ کریم بھائی

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

(چیرمن : کلچرل و جنرل بورڈ)

● ●

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کمیٹی

چیرمن

جناب مصطفیٰ فقیہ

●

سیکرٹری

ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر

●

اراکین

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا ، جناب عبدالمجید پالکا ، پروفیسر عبدالقادر قاضی

● ●

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسٹاف

ڈائرکٹر : نظام الدین ایس گوریکر

ریسرچ آفسر : فرید شیخ

لائبریرین : ندیم نعمانی

پروفیسر سید محمد ہاشم
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

معراج العاشقین کی تحقیق

تحقیق پر قلم اٹھانا بجائے خود اہم بات ہے اور روایتوں سے انحراف کرنا تنقید کے تیروں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ "معراج العاشقین" کے بارے میں ایک مدت تک یہ بات مشہور رہی ہے کہ یہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز متوفی ۸۲۱ھ کی تصنیف ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے جو دہلی سے منتقل ہوکر دکن میں قیام پذیر ہوگئے تھے، انہوں نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ انہیں میں تصوف کے موضوع سے متعلق ایک رسالہ "معراج العاشقین" کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ لسانیات کے علما تو اس کی بنیاد پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے چلے آئے تھے کئی برس تک اس رسالہ کے متن کو شائع کرکے اردو کے قدیم ترین نثری نمونے کی حیثیت سے نصاب میں شامل کرکے پڑھایا بھی گیا۔ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے اسے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ اس کی کمیابی کی صورت میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اسے دوبارہ شائع کیا انہوں نے بھی چند لسانی شواہد پیش کرکے اسے بندہ نواز کی تصنیف ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اسے شائع کیا۔ مولوی عبدالحق و ڈاکٹر نارنگ کی تائید کرتے ہوئے انہوں نے اس کو گیسو دراز ہی کی تصنیف بتایا پروفیسر نذیر احمد نے بھی اسی مصنف کی تائید میں یہ رسالہ بڑی محنت سے مرتب کیا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہ کرسکے۔

دراصل یہ مسئلہ تحقیق کا تھا مولوی عبدالحق بلا شبہ پختہ شعور، گہرے مشاہدے، اعلیٰ بصیرت اور بے انتہا علمی ذوق کے حامل تھے اور اردو کی شمع کے پروانے تھے لیکن بنیادی اور اصولی طور پر وہ محقق نہ تھے باوجود اس کے مولوی عبدالحق نے اردو کی بہت زیادہ خدمت کی ہے انہیں تحقیق سے

بہت دلچسپی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں نوادر کے ایک بہت بڑے سرمایہ کو بے علمی کے دھندلکوں سے نکال کر اہل زبان کے سامنے لا کر ڈھیر لگا دیا۔ معراج العاشقین بھی اسی حرمن کا گل سرسبد ہے یہ ایک ایسے نسخے کی نقل ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ۹۰۶ھ میں لکھا گیا۔ اصل نسخہ کے مالک ڈاکٹر محمد قاسم ہیں ایک نسخہ مولوی صاحب کا ذاتی تھا جس سے مقابلہ کر کے انھوں نے یہ متن پیش کیا «عشق نامہ» نامی ایک رسالے میں «معراج العاشقین» مصنفہ بندہ نواز گیسو دراز کا حوالہ دیکھ کر مولوی صاحب نے اس کتاب کا نام، سنہ تصنیف اور مصنف کا تعین کردیا۔

پروفیسر مسعود رضوی ادیب اور پروفیسر مسعود حسین خاں نے بھی لسانیات سے متعلق اپنی بحث میں اس کو بندہ نواز کی تصنیف بتایا ہے۔ ملکہ مسعود حسین خاں صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

«اردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں سب سے مستند نقش حضرت گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے جو ۱۳۱۲ع اور ۱۴۲۲ع کے درمیان کی تصنیف ہے حضرت گیسو دراز کی زبان پر دکنی کا اطلاق بہ مشکل ہو سکتا ہے۔ پندرہ سال عمر سے اسی سال کی عمر تک کا زمانہ انھوں نے دہلی میں بیتا تھا۔ ان کے خاندان کا تعلق بھی دہلی سے تھا ان کے والد شاہ راجو قتال حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ دکن گئے تھے اس وقت حضرت گیسو دراز کی عمر پانچ سال کی تھی ان واقعات کی سند پر ہم حضرت گیسو دراز کی زبان کے متعلق یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ وہ چودھویں صدی عیسوی کی زبان دہلوی کی نشاندہی کرتی ہے۔»[1]

لیکن ۱۹۶۸ع میں ڈاکٹر حفیظ قتیل (عثمانیہ یونیورسٹی) نے نہایت محنت و کاوش سے ثابت کیا ہے کہ یہ رسالہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز (آٹھویں صدی ہجری) کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کا زمانہ، تصنیف گیارہویں صدی کے اواخر یا بارہویں صدی کے اوایل کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مصنف محمد مخدوم حسینی نامی ایک شخص تھے۔ کاتبوں نے محض حسینی پر نظر کر کے غلطی سے اس کو حضرت بندہ نواز کے نام سے منسوب کردیا ڈاکٹر حفیظ قتیل

---

۱ مقدمہ تاریخ زبان اردو ۱۳۹

نے اپنے نتائج تحقیق کو «معراج العاشقین کا مصنف» نامی رسالہ کے ذریعہ چھاپ کر شائع کیا۔ اس رسالہ کے شروع میں انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دکنی مخطوطات کے ذخائر میں خواجہ صاحب سے منسوب جو رسائل ملتے ہیں ، ان میں بیشتر وہ ہیں جن کا انتساب غلط ہے ۔ یہ رسالے نظم و نثر دونوں میں ہیں لیکن ان کی زبان اور اسلوب سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ رسالے آٹھویں صدی کی تصنیف نہیں ہیں۔ ان میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ گیارہویں صدی کے اواخر میں دکن میں رائج تھی۔ معراج العاشقین بھی انہیں تصانیف میں سے ایک ہے۔

یہ بات اس طرح اور واضح ہوسکے گی کہ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ بندہ نواز لقب سے مشہور تھے جو آٹھویں اور نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آخری حصہ تقریباً ربع صدی دکن میں گذارا ہے۔ ان کا نام سید محمد حسینی (اصلی نام محمد تھا ، حسینی سید ہونے کی وجہ سے محمد سے قبل سید اور بعد میں حسینی لگایا) ،کنیت ابو الفتح اور القاب صدرالدین گیسو دراز ، بندہ نواز ، عاشق شہباز تھے عام طور سے لوگ ان کو القاب سے کم اور حضرت ، حضرت مخدوم یا مخدوم سے زیادہ یاد کیا کرتے تھے ۔ وفات کے بعد بھی مخدوم کا لفظ جاری رہا ۔ رفتہ رفتہ لوگ اسے جزو نام سمجھنے لگے اور جہاں کہیں محمد حسینی، مخدوم محمد حسینی یا مخدوم حسینی کی کوئی ترکیب نظر آئی ، اسے بندہ نواز کا نام سمجھ لیا گیا۔

دکن میں ایک اور بزرگ مخدوم شاہ حسینی بارہویں صدی میں گذرے ہیں۔ وہ ایک خاص متنوع ذہن کے مالک اور کثیرالتعداد تصانیف کے مصنف تھے۔ ان کی اکثر تصانیف خصوصاً مقصود بالذکر معراج العاشقین بھی نام میں مخدوم اور حسینی کے الفاظ کی موجودگی کی وجہ سے حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب ہوگئیں جبکہ زبان و بیان ہی نہیں ، تصوف سے متعلق خیالات کے پیش نظر بھی دونوں (یعنی بندہ نواز کے عہد اور معراج العاشقین کے عہد) میں تقریباً تین صدیوں کا فرق ہے ۔ غرض ناموں میں ان دو لفظوں نے تصانیف کے انتساب میں بڑا دھوکا دیا ہے اس نوعیت کے غلط انتساب کی ایک مثال خالق باری بھی ہے ، جس کو حافظ محمود شیرانی نے حضرت امیر خسرو کے بجائے سولھویں صدی عیسوی کے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف ثابت کرکے تحقیق کی ایک نئی شاہراہ قائم کی کم و بیش شیرانی ہی کے نقش قدم پر چل کر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے معراج العاشقین کی تحقیق کی انھوں نے مولوی عبدالحق کی

رتب کردہ متن کو اپنی تحقیق کے لئے بنیاد بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو نسخہ مولوی عبدالحق کے پیش نظر تھا اس پر نہ تو اس رسالہ کا کوئی نام لکھا ہوا تھا اور نہ اس کے مصنف کا۔ مولوی صاحب نے دوسرے ماخذ سے یہ دونوں نام حاصل کئے ہیں۔ مولوی صاحب کا ایک اہم ماخذ وہ نسخہ تھا جو ڈاکٹر محمد قاسم کی ملکیت تھا اور ۹۰۶ھ کا مکتوبہ بتایا گیا ہے۔ اس کے حوالہ میں مولوی عبدالحق نے رسالہ کا نام قوسین میں (معراج العاشقین) لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کا کہنا ہے کہ قوسین میں نام لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس سے یہ خیال کرنا درست معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب خود بھی اس نام کی طرف سے مشکوک و مشتبہ ہیں۔ انہوں نے اس نسخہ کا کوئی حلیہ اور کیفیت بھی بیان نہیں کی۔ جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ کس بنیاد پر اسے خواجہ صاحب کی تصنیف بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر قتیل کا یہ اعتراض بھی درست ہے کہ اگر ڈاکٹر محمد قاسم کا نسخہ بالفرض ۹۰۶ھ کا لکھا ہوا ہو تو بھی یہ نتیجہ کس طرح نکالا جاسکتا ہے کہ یہ بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایک رسالہ "عشق نامہ" مصنفہ محمد عبداللہ کا حوالہ دیا ہے کہ اس میں خواجہ صاحب کی تصانیف کے تحت معراج العاشقین اور ہدایت نامہ کا ذکر ہے۔ غالباً یہی چیز اس قیاس کی بنیاد ہے کہ یہ ذکو رسالہ معراج العاشقین بندہ نواز کی تصنیف ہے۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے عشق نامہ نہیں دیکھا۔ اس کا اعتراف انہوں نے اپنی مذکورہ تحقیق میں کرلیا ہے۔ اس لئے اس سے متعلق ان کی رائے میں بہت زیادہ وزن نہیں ہے پھر بھی ان کا یہ خیال بیجا نہیں معلوم ہوتا کہ عشق نامہ میں جس رسالہ کا ذکر ہے وہ فارسی میں ہوگا اگر ہندوی میں ہوتا تو مصنف اس کی وضاحت ضرور کرتا کیونکہ قدیم تصانیف مثلاً خیرالمجالس وغیرہ میں ہندوی کا اگر ایک لفظ آیا ہے تو اس کی بھی صراحت کی گئی ہے۔ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ ایک مکمل تصنیف اس زبان میں ہو اور اس کی زبان کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

زمانے کی تعین اور سنہ کی تصدیق کے لئے داخلی شہادتوں کی اہمیت بھی مسلم ہے چنانچہ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے رسالہ معراج العاشقین کے متن، ماخذ، موضوع اور زبان و بیان وغیرہ سے بھی مفصل بحث کی ہے۔

متن کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ مولوی عبدالحق کو بالخصوص تصوف سے دلچسپی نہ تھی اس لئے انہوں نے اس کی معنویت پر کماحقہ غور نہیں کیا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے بتایا ہے کہ اس رسالہ کا تصوف خانوادہ امینیہ کا تصوف ہے

جو عام تصوف سے مختلف ہے اور مشکل بھی۔ مولوی عبدالحق کو اس کی عبارات سمجھنے میں بھی دقت پیش آئی ہوگی مخطوطہ کے املا کی خرابی اور مسخ شدہ عبارت کا شکوہ مولوی صاحب نے خود بھی کیا ہے چنانچہ قتیل صاحب کا کہنا ہے کہ فی الواقع مولوی صاحب اس کی عبارت کو نہیں سمجھ سکے۔ شروع کی عبارت جس طرح انھوں نے شائع کی ہے۔ بے ربط اور مہمل ہے۔ اکثر جگہ الفاظ، تراکیب اور جملے بھی بے ربط ہیں ہر جملے میں « نہ » کا اضافہ ہے جو غلط ہے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب نے ہر جملہ کے مبتدا کے بعد خط فاصل لگاکر خبر کو دوسرے جملے سے ملا دیا ہے وغیرہ۔ ڈاکٹر قتیل کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب نے اس کو ۹۰۶ھ کی نقل ہونے کے سبب اس کی زبان کو قدیم مان لیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جملوں کی بے ربطی اور اس مخصوص تصوف اور اس کی اصطلاحوں سے عدم واقفیت کی بناء پر انھیں اس کی زبان قدیم تر معلوم ہوتی ہے چنانچہ مثالیں دے کر ڈاکٹر صاحب نے یہ بات واضح کی ہے کہ جہاں زبان صاف ہے وہاں قدامت کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

مولوی عبدالحق کے شائع کردہ رسالہ میں پانچ عناصر اور ان کے گنوں کا مخصوص تصوف پیش کیا گیا ہے۔ یہ مخصوص بیجاپوری تصوف ہے اور اس سے متعلق دوسرے رسائل بھی موجود ہیں۔ یہ رسائل کئی اعتبار سے یکسانیت رکھتے ہیں مسائل کی ترتیب کے ساتھ ساتھ اصطلاحات، الفاظ اور اسالیب میں بھی ان میں یکسانیت موجود ہے ایسے مماثل رسالوں کے قلمی ذخیرے میں مخدوم شاہ حسینی ملکانوری کے تین رسائل شامل ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ان رسالوں سے تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے رسالہ کا صرف ایک نسخہ ملا ہے جس کا نام تلاوۃ الوجود حقیقت المعــراج ہے۔ اس میں ۳۵ ابواب ہیں دوسرے رسالے کے ان کو دس نسخے ایسے ملے جن پر نام درج ہے۔ ان میں اہم ترین تلاوۃ الوجود حــقیقت المعراج، تلاوۃ الـوجـود - حقیقت المعراج - وجـودالمعــراج معراج العاشقین اور وجود المعراج العاشقین ہیں۔ اس رسالہ میں ۱۳ ابواب ہیں۔ تیسرا رسالہ بہت مختصر ہے، اس کے تین نام تلاوۃ الوجود، تلاوۃ الوجود مراۃ السالکین اور سوال نامہ ہیں۔ اس تیسرے رسالہ کو زیر بحث موضــوع سے کوئی خاص مناسبت نہیں ہے اس لئے اس سے بحث نہیں کی گئی۔ پہلے اور دوسرے رسالہ کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ پہلا بہ لحاظ زمانہ اقدم ہے۔ اس کے آخــری حصہ کو ۲۳ویں باب سے علیحدہ کرکے اس میں قدرے ترمیم کے

ساتھ ایک علحیدہ رسالہ کی صورت دے دی گی اور وہی یہ دوسرا رسالہ ہے جس میں پانچ تن اور پانچ عناصر ہیں جو خانوادۂ امینیہ کا تصوف ہے

پہلے رسالہ کے آغاز میں ایک مختصر فارسی تمہید میں مصنف نے اپنے نام اور وطن کی وضاحت کی ہے:

«از نصیب فقیر حقیر مخدوم شاہ حسینی رہنما خانوادۂ چشت و اہل بہشت وطن در دکن صوبہ دارالمظفر بیجاپور محل رائچور پرگنہ ساکن قصبہ بلکانور . . . »

دوسرے اور مذکورہ تیسرے رسالے میں مصنف کا نام صرف مخدوم شاہ حسینی لکھا ہے. یہ تفصیل صرف اسی نسخہ میں دی گی ہے یہ داخلی سند بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے. اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہےکہ رسالے کے آخر میں مصنف نے اپنے فرزند کو نام لےکر بھی مخاطب کیا ہے مصنف اور اس کے فرزند کے نام کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے یہ رسالہ بہت صحت کے ساتھ لکھا گیا ہے اس کی کمیابی کی وجہ سے اس کی نقل درنقل کم ہوتی ہے نقل درنقل میں غلطیوں کی جو بہتات ہوجاتی ہے اس میں اس کا بھی امکان کم ہے. دوسرا نسخہ کثرت سے نقل ہوتا رہا جس کی وجہ ڈاکٹر حفیظ قتیل کے قول کے مطابق یہ ہےکہ پہلے نسخے سے مخصوص بیجاپوری تصوف کو علیحدہ کرکے بعض ضروری اضافوں کے ساتھ اس کو ایک مستقل رسالہ کی حیثیت دیدی گی اس نو ترتیب رسالہ کی مقبولیت کے سبب اس کی نقل در نقل ہوتی رہیں اور بنیادی رسالہ کی طرف عام طور سے توجہ نہ ہوئی.

ایک مسئلہ یہ بھی ہےکہ دوسرے رسالے کو پہلے سے علیحدہ کرنے والا کون شخص ہے خود مصنف یا کوئی دوسرا اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر قتیل نے لکھا ہےکہ دوسرے رسالے کے جس قدر نسخے ملے ہیں ان سب پر مصنف کا نام یا تو مخدوم شاہ حسینی لکھا ہے یا حضرت مخدوم سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز ایک نسخہ پر نام حیات اللہ بھی ملتا ہے لیکن دراصل یہ نام کتاب کے اوپر لکھا ہے جو اس بات کی دلالت کرتا ہےکہ شخص مذکورہ مالک کتاب ہے، مصنف نہیں. اس طرح یہ دو ہی نام مصنف کی حیثیت سے رہ جاتے ہیں.

پہلے اور دوسرے رسالے کے تقابلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہےکہ دوسرے کی حیثیت تالیف کی ہے جو پہلے رسالے سے ماخوذ ہے اس لئے کہ کہیں تو من

وعن پہلے رسالہ کی ہی عبارت لی گئی ہے۔ اور کہیں حسب ضرورت اضافے بھی کئے گئے ہیں اور تالیف جس سلیقہ سے کی گئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرا رسالہ پہلے رسالہ کے مصنف ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ دوسرے رسالہ کے اضافوں کی عبارتوں کا طرز فکر، طرز استدلال، زبان اور اسلوب بیان وہی ہے جو پہلے رسالہ کا ہے۔

مولوی عبدالحق کا رسالہ جسے انہوں نے معراج العاشقین کہا ہے، دوسرے رسالہ تلاوۃ الوجود سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے رسالہ کے تیئسویں باب سے دوسرا رسالہ شروع ہوتا ہے۔ معراج العاشقین میں بحث کی ترتیب وہی ہے جو دوسرے کی ہے۔ معراج العاشقین میں بعض عبارتیں ایسی ہیں جو دوسرے میں ہیں پہلے میں نہیں، بعض الفاظ جس طرح دوسرے رسالہ میں ہیں اسی طرح معراج العاشقین میں بھی ہیں پہلے میں قدرے فرق پایا جاتا ہے جو اس بات کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے کہ معراج العاشقین کا تعلق دوسرے سے ہی ہے۔ مثلاً پہلے رسالہ میں ایک جگہ آئینہ آیا ہے، دوسرے میں اس مقام پر آرسی ہے۔ معراج العاشقین میں بھی آرسی ہے۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ معراج العاشقین کی پوری عبارت دوسرے میں ہے، پہلے میں نہیں اس طرح کے تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معراج العاشقین کا تعلق دوسرے رسالہ سے ہے اس کے بعد دونوں کے تعلق کی نوعیت سے بحث کرکے ڈاکٹر قتیل نے یہ ثابت کیا ہے کہ تلاوۃ الوجود کو معراج العاشقین کی شرح نہیں کہا جاسکتا کیونکہ دوسرا رسالہ معراج العاشقین کی کسی عبارت یا مسئلہ کی تشریح نہیں کرتا البتہ ان کے خیال کے مطابق معراج العاشقین تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے اور اس خلاصہ کی عبارت بہت بے ترتیب، مبہم اور بے ربط ہے خلاصہ نگار بیجاپوری فلسفۂ تصوف میں ان لوازم کی اہمیت اور ترتیب کا اندازہ بھی نہیں کرسکا ہے بعض باتوں کو اگر خلاصہ نگار کی جدت کہا جائے تو یہ جدت بھی اس کی بد ذوقی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

غرض معراج العاشقین زبان و مطالب دونوں اعتبار سے ناقص اور مہمل ہے۔ اس کو محض اس بنا پرکہ اس کے ایک نسخے پر کسی قدیم سنہ کا اندراج ہے، خواجہ بندہ نواز کے نام سے منسوب کرنا خواجہ صاحب کے علم و اسلوب بیان سے ناواقفیت کی دلیل ہے خواجہ صاحب کی زبان صاف ستھری اور رواں تھی۔

معراج العاشقین کے نسخوں کے بارے میں ڈاکٹر قتیل نے لکھا ہے کہ اب تک معراج العاشقین نام کے صرف چار نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے پہلے

دو مذکورہ دوسرے رسالہ تلاوۃ الوجود کے نسخے ہیں، تیسرا وہ ہے جسے مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین کہا ہے اور چوتھے میں ابتدائی حصہ کچھ مختلف ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک رسالہ ہے جس کے آغاز میں اس کا نام وجود المعراج اور آخر میں وجود المعراج العاشقین لکھا ہے۔ ساتھ ہی کچھ شبہ کے ساتھ مصنف کے نام کے سلسلے میں اس طرح کی عبارت لکھی ہے

«ایں رسالہ وجود المعراج العاشقین تصنیف حضرت سید محمد صدرالدین ابوالفتاح حسینی بندہ نواز بلند پرواز عاشق شہباز الملقب بہ گیسو دراز .... خبر یافتہ»

مطبوعہ معراج العاشقین کے متن کے آغاز یا اختتام کی عبارت میں مصنف کے نام کی صراحت نہیں ہے مزید یہ کہ عثمانیہ والے نسخہ کے کاتب نے اس کتاب کے مصنف کا نام وثوق کے ساتھ بندہ نواز نہیں بتایا بلکہ «خبر یافتہ» کے الفاظ ملا کر شبہ کا اظہار کردیا۔

معراج العاشقین کے مسئلہ کے تاریخی پہلو سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر قتیل نے لکھا ہے کہ جو شواہد معراج العاشقین کے بندہ نواز کی تصنیف ہونے کی تردید کرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت اس رسالہ کے مضامین و مطالب کی ہے۔ انہوں نے بہ دلایل یہ بات ثابت کی ہے کہ حضرت امین الدین اعلا (جن کی وفات ۱۰۸۵ھ میں ہوئی) نے عام روش سے ہٹ کر تصوف کے ایک نئے دبستان کی تشکیل کی تھی۔ اس تصوف کی جو تفصیل حضرت نے بیان کی وہ سب تلاوۃ الوجود کی اس خلاصہ معراج العاشقین میں موجود ہے معراج العاشقین میں حضرت جانم کی مستعملہ اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ وجود کے پانچ مراتب بھی بیان ہوئے ہیں اس میں واقعہ معراج کی تمثیلی تفصیلات حضرت امین الدین اعلا کی جدت فکر اور ان کے خلفا کی جولانی طبع کا نتیجہ ہے غرض معراج العاشقین کے مضامین یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس میں حضرت امین الدین اعلا کی تعلیمات سے نہ صرف استفادہ کیا گیا ہے بلکہ بعض اضافے بھی ہیں اس صورت میں اس رسالہ کو یقیناً حضرت امین کی وفات (۱۰۸۵ھ) کے بعد کی تصنیف ہونا چاہیے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ حضرت بندہ نواز کی تمام تصانیف میں عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ ڈاکٹر قتیل کے خیال کے مطابق اسی عشقیہ مزاج کی وجہ سے خواجہ صاحب کے تصوف کی

حیثیت ایک جذبہ کی ہے نہ کہ فلسفہ کی۔ وہ فلسفہ کی موشگافیوں میں الجھنا پسند نہیں کرتے اس کے برخلاف معراج العاشقین میں خالص اور خشک فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی اس رسالہ کو خواجہ صاحب سے کچھ نسبت نہیں۔

متن کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔ زبان، الفاظ اور املا کے ارتقا کی تاریخ کا علم ہوجائے تو کسی مخطوطہ کی قدامت کا اندازہ لگانا قدرے آسان ہوتا ہے۔ کسی مخطوطے کی زبان و بیان سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ زبان، الفاظ اور املا اس زمانے میں رائج تھے یا نہیں، اگر نہیں تو کس زمانے میں ان کی کیا حیثیت تھی اس سلسلے میں ڈاکٹر قتیل نے سب سے پہلے یہ اعتراف کیا ہے کہ معراج العاشقین کی زبان بہت الجھی ہوئی اور مبہم ہے۔ تاہم موجودہ متن میں اس کی صوتی اور صرفی شکلیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ یہ گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر اور بارہویں صدی کے اوائل کی دکنی نثر ہے۔ ۱۰۷۵ھ اور ۱۱۱۵ھ تک جو تصانیف وجود میں آئیں ان کے سلسلے کی یہ آخری کڑی معلوم ہوتی ہے۔

معراج العاشقین سے قبل تک حرف ربط "سے" کی جو شکلیں ملتی ہیں ان کی ترتیب اس طرح ہے۔ ستھیں، ستھے، تھیں، ستیں، سیتیں، سیتی، ستے، تے، معراج العاشقین کے معاصرین کے یہاں 'تھے' اور 'سوں' استعمال ہوا ہے۔ معراج العاشقین میں یہ حرف ربط اپنی ترقی یافتہ شکل 'تے' اور 'سوں' میں ملتا ہے۔ تے کے مقابلے میں سوں کا استعمال بکثرت ہے صرف ایک جگہ ستی ملتا ہے۔

حرف ربط 'میں' معراج العاشقین سے قبل کہیں نہیں ملتا۔ میرانجی اور میراں یعقوب 'میں' کے ساتھ 'منے' بھی استعمال کرتے تھے اس حرف کے معراج العاشقین میں مل جانے سے اس کی قدامت مشتبہ ہوگی چونکہ یہ بہت بعد میں رائج ہوا۔ اس سے قبل ماہاں 'مہا' ماہے اور مہیں وغیرہ بولتے تھے یہ صورتیں اورنگ زیب کے عہد تک بھی رہی ہیں 'میں' کا استعمال ان سب کے بعد کیا گیا۔

معراج العاشقین سے پہلے بعض چیزوں کا املا دوسری طرح سے ملتا تھا اس میں تے (ترقی یافتہ) طریقہ پر ملتا ہے۔ مثلاً صفت عددی دونھوں۔ تینھوں کی جگہ دونوں تینوں مجھ اور مجیں کی جگہ مجھے، اسی طرح انن کی جگہ ان، ضمیر موصولہ فاعلی جنہ یا جیے کی جگہ 'جو' اور کہیں کہیں 'جسے' بھی ملتا ہے۔

حـــرف اضافت کیوا، کیری کی جگہ کا، کی، نے، کا استعمال تو دکنی میں متروک رہا ہے گیارہویں صدی کے نصف آخر میں کہیں کہیں مل جاتا ہے، اسی وجہ سے معراج العاشقین میں یہ بہت کم ملتا ہے اپرال کی جگہ اوپر، فعل ماضی کیتا کی جگہ ،کیا، علامت مستقبل ،سی، گیارہویں صدی میں بکثرت استعمال ہوا ہے، اس رسالہ میں ،سی، کا استعمال نہیں ہے بلکہ ،گا، لگاکر مستقبل بنایا گیا ہے. فعل ناقص ،اہے، اتھے کی جگہ ،ہے، ،تھے، وغیرہ.

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے بھی ماہرین لسانیات کی عام روش کے مطابق ان الفاظ اور حروف کی تصدیق کے لئے سندیں بہت ہی کم پیش کی ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں. جب تک سند کے دریعہ کسی لفظ کی تردید یا تصدیق نہ کی جائے، وہ کلی طور پر معتبر نہیں سمجھی جاسکتی اس کے برعکس ،خالق باری، میں پروفیسر شیرانی نے اپنی بات کے ثبوت کے لئے سبھی الفاظ کی سند پیش کی ہے.

مذکورہ بالا بیان میں بعض دلائل ایسے ہیں جو معراج العاشقین کی قدامت کو مشتبہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں مثلاً ،نے، کا استعمـال شمالی ہند کی سب سے پہلی تصنیـف چندایں میں مل جاتا ہے راجین بمعنی راجا ہے البتہ اس کا جداگانہ استعمال نہیں ہوا ہے. اسی طرح حرف اضافت ،کے، کا استعمـال کبیر کے یہاں بھی ہوا ہے.

گروگووند دونوں کھڑے کاکے لاگوں پائیں

غرض بعض تو دلائل کی کمزوری کی وجہ سے اور بعض سندوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے الفاظ و املا کے ذریعہ قتیل نے جو مباحث اٹھائے ہیں اس میں ابھی بہت زیادہ ترقی کی گنجائش ہے اور اس پہلو پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے.

الفاظ کی خصوصی بحث کے بعد اس عہد کے لسانی رجحانات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں اور دسویں صدی کی دکنی میں سنسکرت کے تتسم (خالص) لفظوں کا استعمال عام ہے. جانم کے رسالہ کلمۃ الحقایق پر بھی اس کا پورا اثر ہے. زبان کی ترقی کے ساتھ یہ رجحان بھی کم ہوتا گیا اور اس کی جگہ فارسی عربی الفاظ کا رواج شروع ہوگیا ہے یہ تبدیلی تقریباً ایک صدی پر محیط ہے. معراج العاشقین میں فارسی عربی الفاظ کا بکثرت استعمال یہ بات سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے کہ یہ رسالہ کلمۃ الحقایق سے تقریباً ایک صدی بعد کی تصنیف ہے

فارسی کے مرکب افعال کا بڑھتا ہوا رجحان جو میر اور سودا کے زمانے تک چلا آیا ہے، اس رسالہ میں موجود ہے مثلاً خـــبر کرنا (خبر کردن)،

پاک ہونا (پاک شدن) قبول کرنا (قبول کردن) وغیرہ۔ اس کے علاوہ گیارہویں صدی کا روز مرہ اور محاورہ بھی معراج العاشقین میں ملتا ہے۔ مثلاً دعا منگنا، دور پڑھنا، گمان پڑا، محاوروں میں محبت ماننا، بیت باندنا، طاعت ماننا، خبر رکھنا وغیرہ۔

ڈاکٹر قتیل نے زبان و بیان کی بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں ایک مسئلہ اور اٹھایا ہے۔ وہ یہ کہ یہ رسالہ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے، تو ظاہر ہے جانم کا رسالہ کلمۃ الحقایق اردو نثر کا پہلا مستند رسالہ قرار پاتا ہے۔ پہلا رسالہ ہونے کی وجہ سے اس میں ہر جگہ عجز بیانی عیاں ہے۔ عبارت اور جملے میں فارسی کی بہتات، ہر جگہ فارسی کا غلبہ ہے جبکہ ان کے بیٹے حضرت امین الدین اعلا کا نثری رسالہ کلمۃ الاسرار خالص دکنی زبان میں ہے۔ اس میں پہلا سا عجز بیان بھی نہیں ہے۔ یعنی اولین رسالہ کے مصنف کے سامنے چونکہ کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ اس لئے اس زبان میں عجز بیانی کا ہونا ضروری سی بات ہے۔ حضرت امین کے سامنے نمونہ موجود تھا اس لئے انہوں نے اپنا رسالہ بہتر زبان میں لکھ لیا۔ اگر معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہوتی تو اس میں بھی ہر جگہ یہ عجز بیان موجود ہوتا۔ کیونکہ یہ جانم کی پیدائش سے قبل ہی وفات پاچکے تھے لیکن اس تصنیف کی عبارت بالکل صاف، واضح اور خالص دکنی ہے، کہیں کوئی سقم نہیں ہے، اس میں عبارت کی بے ربطی اور جو غلطیاں ہیں، اس کے ذمہ دار کم سواد کاتب اور اس کی نقل در نقل ہونا ہے۔ جہاں عبارت درست ہے وہاں کلمۃ الحقایق کی عبارت سے مقابلہ کرکے اندازہ ہوجاتا ہے کہ معراج العاشقین تو کہیں بعد کی تصنیف ہے، دونوں میں تقریباً ایک صدی کا فرق ہے۔ حضرت امین کے رسالے سے ہی اردو کا نثری آہنگ معلوم ہوجاتا ہے۔ زبان کے ارتقا کے ساتھ جملوں کی ترکیب درست اور عبارت مربوط ہوتی گئی ہے۔ معراج العاشقین میں جملوں کی صحیح نحوی ترکیب، عبارت کا اصل ربط و تسلسل اسلوب بیان کی وضاحت اور روانی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ یہ رسالہ کلمۃ الحقایق کے بہت بعد میں وجود میں آیا۔

صوتی خصوصیات بھی کسی متن کے زمانے کے تعین میں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں اس لحاظ سے بھی یہ رسالہ گیارہویں اور بارہویں صدی کی دکنی تصانیف کی صف میں آتا ہے

معراج العاشقین میں جو رجحانات واضح طور پر نظر آتے ہیں ان میں سب سے پہلے تخفیف کا عمل ہے۔ اس میں الفاظ کو مخفف یا مختصر کردیا جاتا ہے مثلاً ناک کو نک، مانگنا کو منگنا، بھیجنا کو بھجنا، آسمان کو اسمان وغیرہ۔

تسہیل کا میلان کچھ زیادہ ہے۔ جگہ کو جاگہ، مٹی کو ماٹی، موحد کو مواحد، کچھ کو کوچ۔ تشدید کا میلان زبان کی قدامت کی علامت ہے۔ اس کی مثال کے لئے اسے، پچھانا وغیرہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

انفیابے کا عمل کم ملتا ہے۔ دنیا کو دیاں، رہےگا کو رہینگا بیچ کو بینچ، وغیرہ امر کا اثر جانم اور امین پر زیادہ ہے اگر صرف اس لحاظ سے بھی مطالعہ کیا جائے تو بھی یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ حضرت جانم کے ایک صدی بعد کا رسالہ ہے۔ بائے زائدہ مثلاً بدبوئی وغیرہ، ہائے مخلوط کا حذف باندھنا کو باندنا، تمہاری کو تماری اور ہاتھ کو ہات، ہائے مخلوط کا استعمال ملتا بھی ہے اور یہ حذف کے مقابلے میں زیادہ ہے مثلاً چھپانا، بھیجے جھوٹا وغیرہ۔ ہائے ملفوظہ کہیں مستعمل ہے اور کہیں نہیں بھی کہاں کو کاں، وہاں کو وہاں ہی ہے پونچے اور پہنچے دونوں طرح سے ملتا ہے، اس طرح تھنڈ اور اھنڈ وغیرہ یہ سبھی صوری اور صوتی قرائن یہ بتاتے ہیں کہ معراج العاشقین بارہویں صدی ہجری (جانم کے رسالہ کلمۃ الحقایق کے تقریباً ایک صدی بعد) کی تصنیف ہے۔

اتنی بات کی تصدیق ہوجانے کے بعد ایک مسئلہ یہ آتا ہے کہ آخر اس کتاب کو بندہ نواز کے نام سے منسوب کیوں کیا گیا! اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے پہلے (الف) دوسرے (ب) اور تیسرے (ج) تینوں رسالوں کے سرناموں، اوج، آغاز، اختتام اور ترقیموں وغیرہ کا جائزہ لیا ہے۔ رسالہ الف کے سرورق پر رسالہ کا نام تلاوۃ الوجود حقیقت المعراج المحبوب، مصنف کا نام مخدوم شاہ حسینی خانوادۂ چشت، وطن قصبہ ملکاپور، بیجاپور دکن لکھا ہے رسالہ (ب) اور (ج) کے اکثر نسخوں میں بندہ نواز کا نام اور چند نسخوں میں مخدوم شاہ حسینی کا نام لکھا ہے۔

معراج العاشقین کے تین نسخے ملے ہیں ان میں سے ایک میں من تصنیف عبدالحسینی بندہ نواز گیسو دراز بلند پرواز، دوسرے میں تصنیف سید صدرالدین ابوالفتاح حسینی بندہ نواز بلند پرواز عاشق، شہباز المقلب گیسو دراز.. خبریافتہ» لکھا ہے۔ معراج العاشقین کے دو نسخے بندہ نواز سے منسوب ہیں تیسرے پر مصنف کا نام نہیں صرف رسالہ الف میں مصنف کا نام خود کا تحریر کردہ ہے۔

غرض چوبیس نسخوں میں سے آٹھ پر مخدوم شاہ حسینی اور چھ پر بندہ نواز کے القاب و آداب میں لفظ مخدوم استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ لفظ مخدوم احتراماً نہیں معلوم ہوتا۔ رسالہ (ب) کے نسخہ نمبر ۵ میں حضرت مخدوم حسینیؒ بندہ نواز گیسو دراز ہے۔ خــــواجہ صاحب کا نام مخدوم حسینی نہیں ہے۔ دراصل مخدوم سے دھوکا کھاکر بندہ نواز بڑھا دیا گیا ہے۔ (ج) کے تینوں رسالوں میں سید محمد مخدوم بندہ نواز گیسو دراز ہے۔

دراصل مخدوم، کلمۂ احترام ہے جو نام کے بعد نہیں بلکہ حضرت یا جناب کی طرح نام سے پہلے آتا ہے۔ جیسے مخدوم سید محمد حسینی سید محمد کے بعد اگر مخدوم ہو تو یہ جزو نام ہوگا۔ اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سید محمد مخدوم کوئی اور شخص ہے، کاتب نے سید محمد اور مخدوم کے الفاظ میں غلط فہمی سے بندہ نواز کا نام سمجھ کر گیسو دراز بڑھا دیا ہے۔

خواجہ بندہ نواز کے ساتھ ان کے معاصرین (سیر محمدی میں) مخدوم کا لفظ احتراماً استعمال کرتے ہیں ان کے بعد ان کے مرید حضرات، بیٹے اور پوتے پھر سبھی لوگ بندگی مخدوم، حضرت مخدوم یا کسی نہ کسی طرح مخدوم لگالیتے تھے جو آج تک جاری ہے کاتبوں نے اس مخدوم کو جزو نام سمجھ کر ان کے دیگر القاب بھی ساتھ لگادیے۔ معراج العاشقین اور وہ رسائل جن سے یہ اخذ کیا گیا ہے ان میں مصنف (مخدوم شاہ حسینی) نے جگہ جگہ اپنے کو مخدوم کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ خواجہ صاحب کا یہ نام نہیں انھوں نے اپنی تصانیف میں ہر جگہ خودکو 'محمد حسینی' کے نام سے مخاطب کیا ہے اس طرح مخدوم شاہ حسینی کے رسائل اور ان کے خلاصے خــــواجہ صاحب کے نام سے منسوب ہوگئے یہ انتساب جہاں ایک طرف مخدوم کی بناء پر غلط ہوا ہے وہیں دوسری طرف خواجہ صاحب کے نام کے اجزا سے بھی اکثر دھوکا ہوا ہے خواجہ صاحب کا نام محمد ہے نسباً سادات حسینی کی وجہ سے سید محمد حسینی قرار پایا۔ کنیت ابوالفتح، القاب صدرالدین، ولی الاکبر الصادق، بندہ نواز، گیسو دراز، شیخ کے دئیے ہوئے خطاب عاشق شہباز، بلند پرواز سرفراز، خاکسار عالم نواز کلمات احترام ہیں سلسلہ خواجگان چشت سے تعلق ہونے کی وجہ سے خواجہ لگا دیا گیا اس طرح نام کے اکثر اجزاء سے کاتبوں کو دھوکا ہوا ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ زمانے میں لوگ بزرگان دین کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھنا باعث برکت سمجھتے رہے ہیں چنانچہ خواجہ صاحب کے نام کے اجزا سے اکثر نام ان کے معتقدین کے بچــــوں کے رکھے گئے اس کی بہت سی

مثالیں موجود ہیں۔ یہ بجے بڑے ہوکر صاحب قلم بزرگ و صوفی ہوئے۔ ان اہل قلم صوفیا کی تمام تصانیف نثر و نظم کو کاتبوں نے دھوکا کھاکر خواجہ صاحب کے نام سے منسوب کردیا۔

معراج العاشقین کو خواجہ صاحب کی تصنیف ہونے کی تردید کرنے اور مخدوم شاہ حسینی کی تائید کرنے کے سلسلے میں ایک اور نہایت قوی اندرونی شہادت ملی ہے وہ یہ کہ تلاوۃ الوجود (ب) اور (الف) کے اکثر نسخوں میں مصنف مخدوم اپنے پیر کا نام پیراللہ بتاتے ہیں، اس سلسلے میں دو اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے خواجہ بندہ نواز کے انتساب کی بالکلیہ تردید ہوجاتی ہے۔ نتیجتاً تلاوۃالوجود کا خلاصہ ہونے کی وجہ سے معراج العاشقین کے خواجہ صاحب کے انتساب کی بھی تردید ہوجاتی ہے۔

یہاں تک تحقیق مکمل کرلینے کے بعد یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے کہ مخدوم شاہ حسینی کون شخص ہے رسالہ (الف) اور (ج) میں مصنف سے متعلق مواد کم ملتا ہے تاہم کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں رسالہ (الف) میں مصنف کا نام واضح طور پر مخدوم شاہ حسینی چشتی قصبہ بلکانوری مل جاتا ہے الف، ب، اور ج کے اکثر رسائل میں مخدوم شاہ حسینی، محمد مخدوم شاہ حسینی اور سید محمد مخدوم شاہ حسینی بتایا گیا ہے جس سے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کا نام « مخدوم شاہ حسینی » ہے « سید اور محمد زاید ہوسکتے ہیں مخدوم شاہ حسینی نے اپنے نام کے ساتھ رسالہ الف میں اور بعض جگہ (ب) اور (ج) میں بوی رہما کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا بھی کوئی واضح ثبوت نہیں کہ یہ مصنف ہی نے لکھا ہے، نہ معلوم کہاں سے آگیا۔ اسے تخلص اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اس نے مخدوم تخلص اختیار کیا ہے۔

مصنف کا وطن جو رسالہ الف میں مذکور ہے وہ بلکا نور، پرگنہ کوتال، محل ضلع رائچور، صوبہ بیجا پور ہے۔

مخدوم شاہ حسینی نے اپنی تصانیف میں اپنے پیر کا نام پیراللہ بتایا ہے (سہو کتابت کی وجہ سے کہیں کہیں پیراللہ بھی ہوگیا ہے) یہ پیراللہ میراں جی خدا نما کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مخدوم کے پوتے عزیزاللہ شاہ حسینی کے دو شجرے ملتے ہیں دونوں میں مخدوم کے پیر کا نام پیراللہ ہے۔ اس شہادت سے مزید ثبوت ملتا ہے کہ یہ مخدوم شاہ حسینی ہی کی تصنیف ہے کیونکہ مخدوم کے شیخ پیراللہ تھے جو میراں جی

خدا نما کے خلیفہ تھے۔ میراں جی کا سنہ وفات ۱۰۷۰ھ ہے۔ اگرچہ مخدوم شاہ حسینی کا اصل سنہ وفات کا علم نہیں ہے لیکن اس اعتبار سے ان کا زمانہ اواخر گیارہویں صدی اور اوائل بارہویں صدی قرار پاتا ہے۔

مخدوم شاہ حسینی شاعر بھی تھے، وہ چند اشعار تلاوۃ الوجود میں مندرج ہیں، ان کے علاوہ دوسری جگہ بھی ان کا کلام ملتا ہے۔

سب سے آخری لیکن سب سے کمزور بحث نسخہ مکتوبہ ۹۰۶ھ کی تردید کے سلسلے میں کی گئی ہے تحقیق کا معاملہ ریاضی کا سا ہوتا ہے۔ یہاں گاڑی قیاسات کے ذریعہ منزل تک پہنچ سکتی۔ یہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر محمد قاسم کا مذکورہ ۹۰۶ھ کا نسخہ ڈاکٹر قتیل کی نظر سے نہیں گذرا اس مسئلہ پر قیاس سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کا احساس خود مصنف کو بھی ہے اور اس نے اعتراف کیا ہے «میں سنہ کی غلطی کی تاویل اور توجیہ کررہا ہوں» اور اس کا کمزور جواز اس طرح پیدا کیا ہے کہ جب یہ رسالہ گیارہویں اور بارہویں صدی کے مصنف کا ثابت ہوچکا تو اس طرح کے قیاس کرلینا زیادہ نامناسب بھی نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مولوی عبدالحق نے ڈاکٹر محمد قاسم کے نسخے کے ترقیمے کی عبارت درج کی ہے جس میں سن کتابت ۹۰۶ھ لکھی ہے مولوی صاحب بھی اس بات پر مصر نہیں ہیں کہ ۹۰۶ھ کی مکتوبہ ہونے کی وجہ سے یہ بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے۔ بقول خود مولوی عبدالحق، ان کی نہ سہی ان کے کسی معاصر کی ہوگی لیکن یہ لازمی بات ہے کہ یہ ۹۰۶ھ سے قبل ہی کی تصنیف ہے۔ بحث یہ ہے کہ جب یہ طے ہوچکا کہ یہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ گیارہویں صدی کے اختتام اور بارہویں صدی کے آغاز کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ معراج العاشقین تلاوۃ الوجود (ب) کا خلاصہ ہے۔ تلاوۃ الوجود (ب) تلاوۃ الوجود (الف) سے اخذ کیا گیا ہے، ان دونوں تصانیف کے مصنف مخدوم ہیں، ان دونوں کتابوں میں خانوادۂ امینیہ کا اتحادی تصوف بیان کیا گیا ہے جس کا ۹۰۶ھ میں تو وجود بھی نہیں تھا، لہٰذا یہ رسالہ اس وقت لکھا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر قتیل نے ہندسوں سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک خیال تو یہ پیش کیا ہے کہ یہ ۹۰۶ والا نسخہ ایسے نسخہ کی نقل ہوگا جس پر صرف ۶ لکھا تھا کیونکہ ایسی شہادتیں مل جاتی ہیں جہاں صدی کا اندراج نہیں کیا گیا ہے اور اس سے سنین میں غلطی کے بھی شواہد پیش کئے ہیں اور کیونکہ اس وقت تک یہ رسالہ بندہ نواز سے منسوب تھا اس لئے

صدی کا از خود اضافہ کرکے کاتب نے ۹۰٦ خود لکھ دیا ۔ یا اسی طرح کا دوسرا ، قیاس خود مصنف کی زبانی سنیے :

" کاتب محمد نصیر نے معراج العاشقین کے جس نسخے سے نقل کیا ہے اس نسخہ پر سنہ صرف ۹٦ ھ ہوگا ۔ کتابت میں سنہ کے نون کا نقطہ ٦ اور ۹ کے درمیان آگیا ہوگا جیسے ۹۰٦ ۔ محمد نصیر نے اس کو ۹۰٦ پڑھا اور اس کو ہندسوں کے علاوہ عبارت میں بھی لکھ دیا ۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو سنہ ۱۰۹٦ ہوگا اس لئے کہ محمد نصیر نے اس نسخہ کی نقل ۱۱۷٦ ھ میں کی ہے "

اس کے علاوہ کسی ہندسے کی غلطی ہونے کی وجہ سے ۹۰٦ لکھ دیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے اور مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہونے کی وجہ سے ۹۰٦ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی ۔

مذکورہ بالا مباحث کی بنیاد کا خلاصہ یہ ہے کہ معراج العاشقین ایک دکنی رسالہ ہے ۔

۱ جس کا موضوع خانوادۂ امینیہ کا وہ تصوف ہے جو ۱۰۷۵ھ کے بعد قابل تقلید بن سکا کیونکہ اس کے بانی حضرت امین الدین اعلا تھے جن کی وفات ۱۰۸۵ھ میں ہوئی

۲ اس کی زبان و بیان گیارہویں صدی کے آخری ربع سے قبل کی نہیں ہے

۳ مصنف مخدوم شاہ حسینی کے پیر کا نام پیراللہ رسالہ میں موجود ہے ۔ اور تاریخی اعتبار سے پیر اللہ کا عہد برہان الدین جانم کے خلیفہ ہونے کی وجہ سے گیارہویں صدی کا آخری زمانہ ہے ۔

۴ معراج العاشقین کا مصنف مخدوم شاہ حسینی ہے جو دیگر کئی تصانیف کا بھی مصنف ہے ۔ حضرت بندہ نواز کے نام کے ساتھ احتراماً مخدوم لگایا جاتا تھا یہ اس قدر ترقی کر گیا کہ بعد میں ان کا جزو نام سمجھ لیا گیا اور مخدوم شاہ حسینی کے اکثر رسائل ان کے نام سے منسوب ہوگئے ۔

۵ کسی بھی کتاب کے لئے اس کے متن کا موضوع ہی خاص اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس موضوع کا مخصوص تصوف گیارہویں صدی میں شروع ہوا بندہ نواز کا سال وفات ۸۲۱ ہے لہٰذا ان کے زمانے میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

مولوی عبدالحق نے جس نسخہ کی بنیاد پر اس کو بندہ نواز کی تصنیف بتایا ہے، ڈاکٹر قتیل اس کی آسانی سے تردید نہیں کرسکے ہیں، اس سلسلے میں ابھی مزید تحقیق درکار ہے اور پہلا کام یہ ہے کہ ۹۰۶ھ والے نسخہ کی تردید قوی دلائل کے ساتھ کی جاسکے۔ دوسرے یہ کہ یقینی طور پر اب بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انہیں مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے، ممکن ہے مزید تحقیق اس کو غلط ثابت کردے اور اس کے بعد کے زمانے کی یہ تصنیف طے پائے۔

بہرحال یہ ایک اہم کارنامہ ہے جس کی خاطر خواہ تحسین نہیں ہوئی نہ ہی اس پر کوئی بھرپور تبصرہ شائع ہوا۔ ڈاکٹر انصاراللہ نظر کا ایک تبصرہ اور ایک مختصر مضمون ڈاکٹر گیان چند جین کا "ہماری زبان" میں اس سلسلے میں شائع ہوئے اور بس۔ یہ موضوع محض محققین کے لئے ہی غور طلب نہیں تھا بلکہ مقتدر علمائے لسانیات کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ اس سلسلے میں اتفاق یا اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔ یہ تحقیق اردو میں ایک اہم اضافہ ہے۔

● ● ●

سپاس گذار ہیں ہم

● ان اہل قلم حضرات کے جن کے مقالے نواب ادب کے لئے بغرض اشاعت موصول ہوتے رہے ہیں

● ● ان ناشرین کرام کے جن کے ادارے کی نو مطبوعات کی دو جلدیں نواے ادب میں برائے تبصرہ دستیاب ہوتی رہی ہیں اور

● ● ● ان اردو۔ نواز احباب کے جن کے توسط سے ادبی اور تعلیمی ادارے اور لائبریریاں نواے ادب کی خریداری منظور کرتے رہے ہیں۔

(مدیر)

ڈاکٹر خورشید خمرا صدیقی
شعبہ اردو
جموں یونیورسٹی

ترقی کے اسلاف

اسدالدولہ رستم الملک میرزا محمد تقی خاں ترقی کے مورث اعلیٰ سید شمس الدین جو اکیس واسطوں سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (ساتویں امام) کی اولاد میں تھے نجف اشرف میں رہتے تھے اور صاحب علم تھے شاہ اسمٰعیل صفوی نے انہیں بلاکر قاضی القضاۃ کیا۔ اور نیشا پور میں بہت سی املاک و جاگیر عطا کی۔ ان کے کئی بیٹے تھے سب سے بڑا بیٹا سید محمد جعفر تھا سید محمد جعفر کے دو بیٹے تھے ایک سید محمد امین دوسرے سید محمد۔ سید محمد امین کے ایک بیوی سے دو بیٹے تھے میر محمد نصیر اور میر محمد یوسف[1] ملکر مولوی ولی اللہ[2] نے میرزا نصیر اور میرزا یوسف کو سید محمد کا بیٹا بتایا ہے لیکن سید کمال الدین حیدر نے میر محمد نصیر کو میر محمد یوسف کا چچا زاد بھائی بتایا ہے۔[3]

سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں میر محمد نصیر اور میر محمد یوسف شاہ عباس ثانی بادشاہ ایران کے یہاں ملازم تھے۔ ایران کے بادشاہوں کا یہ قاعدہ تھا کہ سفر اور شکار میں سلطنت کے امرا و اراکین لشکر کے آگے چلا کرتے تھے۔ ایک دن بادشاہ ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ ایک شیر نکلا اور ان پر حملہ کیا۔ بادشاہ گھوڑے سے گر گئے۔ میر محمد یوسف گھوڑا دوڑا کر کود پڑے اور شیر کو پیش قبض سے مار ڈالا بادشاہ نے زرہ پہن رکھا تھا اس لیے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ بادشاہ اس کام سے بہت زیادہ خوش ہوئے اور ان کو اپنا وزیر

---

۱ نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ حصہ اول ص-۱۳ اور سید محمد غلام علی خاں عماد السعادت
۲ مفتی مولوی ولی اللہ۔ تاریخ فرخ آباد ص ۲۲
۳ سید کمال الدین حیدر، سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۱۹

بتانا چاہا لیکن انھوں نے منظور نہ کیا اور عـــرض کیا کہ میں سید ہوں مجھ سے سیاست نہ ہوسکے گی اور اس کے بغیر سلطنت کا انتظام کرنا ممکن نہیں اسی لیے میں اس عہدے سے معافی چاہتا ہوں مگر میری یہ آرزو ہے کہ میرے بھائی میر محمد نصیر کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے اس کی شادی رضا قلی بیگ وزیر کی بیٹی سے کرادی جائے۔ وزیر قوم قزلباش سے تھا۔ بادشاہ کے کہنے پر وزیر نے اس شرط پر اس رشتے کو قـــبول کیا کہ اگر اس کے بیٹی پیدا ہو تو اس کی قوم کے آدمی سے منسوب ہو اور یہ رسم ہمیشہ قایم رہے۔ بادشاہ نے قبول کیا اور میر محمد یوسف کو نیشا پور میں بہت سی جاگیر کا مالک بنادیا۔

میر محمد یوسف کی شادی محمد شفیع خاں بیگ پسر محمد قلی خاں بیگ ثانی کی سب سے چھوٹی بیٹی سے ہوئی تھی۔[۱] نجـــم الغنی خاں نے افضل التواریخ کے حـــوالے سے لکھـا ہے کہ یہ موضع نجف گڑھ میں خیمے کی چوب کے صـدمے سے ہلاک ہوئی۔ اس سے چـار بیٹے پـــیدا ہوئے تھے۔ (۱) سید محمـد خـاں (۲) میرزا شاہ میر خاں (۳) میرزا امیر خاں (۴) میرزا جعفر[۲]۔

مـیر محمد یوسف کے ایک بیٹی تھی جس کی شادی میر محمد نصیر کے بیٹے میر محمد امین سے ہوئی تھی میـر محمد یوسف کے املاک بہت تھی اس لیے میر محمد امین کو خانہ داماد کیا یہی میر محمد امین ہیں جو آگے چل کر نواب سعادت خاں برہان الملک کے خطاب سے مشہور ہوئے[۳]

میر محمد نصیر کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے کا نام میر محمد باقر اور چھوٹے کا نام میر محمد امین تھا۔ میر محمد کی ایک بہن ان سے بڑی اور ایک چھوٹی تھی۔ مولوی مفتی ولی اللہ[۴] نے تاریخ فرخ آباد میں صرف دو بیٹوں میرزا محمد باقر اور میر محمد امین کا ذکر کیا ہے۔ جب میر محمد نصیر کی اولاد جوان ہوئی تو ان کی بیوی نے ان سے کہا کہ محمد قلی خاں بیگ میری ماں کا بھتیجا نسل بادشاہان

---

۱ سید کمال الدین حیدر، سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۲۱ اور نـــجم الغنی خاں، تاریخ اودھ جلد اول ص ۹۱

۲ نجم الغنی خـاں، تاریخ اودھ جـلد اول ص ۹۱ (مصنف نے مرزا لکھـا ہے جب کہ میرزا ہونا چاہیے تھا۔)

۳ نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ جلد اول ص۱۵ اور سوانحات سلاطین اودھ حصہ اودھ ص ۲۰

۴ تاریخ فرخ آباد ص۲۲

ترکمان سے ہے اس کے بڑے بیٹے جعفرخاں بیگ کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کی شادی کرکے اپنے اس وعدے کو پورا کرو جو میرے باپ سے کیا تھا انھوں نے جواب دیا کہ میں اس شرط سے اپنی بیٹی جعفرخاں بیگ خلف محمد قلی خاں بیگ کو دے سکتا ہوں کہ محمد قلی خاں بیگ اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے میر محمد باقر سے کردے ۔ محمد قلی خاں بیگ نے یہ شرط منظور کرلی اور دونوں شادیاں ہوگئیں ۔ جعفرخاں بیگ کے نطفے سے اس لڑکی کے دو لڑکے پیدا ہوئے ۔ بڑے بیٹے کا نام مرزا محسن اور چھوٹے بیٹے کا نام مرزا محمد مقیم تھا مرزا محسن چار سال کے اور مرزا مقیم چھ مہینے کے تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا ۔ مرزا محمد مقیم کو ان کی خالہ نے اپنا دودھ پلاکر پالا تھا اور یہ دونوں بھائی اپنی خالہ کے گھر جوان ہوئے تھے[1] مرزا محسن نے آگے چل کر عزت الدولہ کا خطاب پایا ۔ مرزا محسن کی شادی ان کے چچا محمد شفیع خاں بیگ کی بیٹی سے ہوئی تھی جس سے ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں ، بڑے بیٹے کا نام جعفر قلی خاں عرف مرزا بزرگ تھا اور چھوٹے بیٹے کا نام محمد قلی خاں عرف مرزاکوچک تھا اور انھیں آغا بابا بھی کہتے تھے[2] نجم الغنی خاں مفتاح التواریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مرزا محسن کے نکاح میں نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ کی بہن بھی آئی تھی[3] مرزا محسن کا انتقال ۲۹ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ شب چہارشنبہ کو عارضۂ ہیضہ میں ہوا تھا ۔ مرزا مقیم کو ان کے ماموں سعادت خاں برہان الملک نے نیشاپور سے ہندوستان بلاکر ان کی شادی اپنی سب سے بڑی بیٹی صدرجہاں بیگم سے کردی تھی ان کو محمد شاہ کی طرف سے ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا ۔ یہی صفدر جنگ شجاع الدولہ کے باپ تھے ۔

میر محمد یوسف کے بیٹے میر شاہ میر کی شادی میر محمد نصیر کی چھوٹی بیٹی یعنی سعادت خاں برہان الملک کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی ۔ محمد شاہ میر کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں ۔ بڑے بیٹے کا نام مرزا محمد یوسف اور چھوٹے کا نام نصیرالدین حیدر خاں بیگ ہوا[4]۔

میر محمد نصیر اپنے بیٹے میر محمد باقر کے ساتھ بہادر شاہ بن اورنگ زیب عالمگیر کے عہد[5] میں ۱۱۱۸ھ میں ہندوستان کے لیے دریا کے راستے سے بذریعہ

---

۱ سید کمال الدین حیدر ، سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۲۱ ۲ نجم الغنی خاں ، تاریخ اودھ جلد اول ص ۹ ۳ ایضاً ص ۹۴ ۴ گور سہائے ، تاریخ اودھ (قلمی) ص ۱۹
۵ مفتی ولی اللہ ، تاریخ فرخ آباد ص ۴۲ لیکن سید کمال الدین حیدر نے سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۲۰ پر فرخ سیر کا عہد لکھا ہے ۔

جہاز روانہ ہوئے ۔ جہاز بنگالے پہنچا۔ میر محمد نصیر نے عظیم آباد میں قیام کیا۔ شجاع الدولہ ناظم بنگالہ ان کی خبر گیری اور پرورش کرنے لگا۔ اسی عرصے میں میر محمد باقر کی دوسری شادی ہوئی اور ان کے ایک بیٹا نثار محمد خاں پیدا ہوا جو اپنے چچا تو اب برہان الملک کے عہد حکومت و ریاست میں شیر جنگ کے خطاب سے مشہور ہوا۔ اور عہد محمد شاہ میں صفدر جنگ کی طرف سے کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ کچھ عرصے بعد میر محمد نصیر کا انتقال ہوگیا میر محمد امین جو ابھی تک اپنے وطن میں تھے باپ اور بھائی سے ملنے کے لیے ۱۱۲۰ھ میں وطن کو چھوڑکر ہندوستان آئے[1] عظیم آباد پہنچنے پر پتہ چلا کہ والد کا انتقال ہوچکا ہے سید کمال الدین حیدر[2] نے سوانحات سلاطین اودھ میں محمد باقر کے ہندوستان آنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کو ایک دن ان کی بیوی نے کسی بات پر طعنہ دیا تھا جو ان کو ناگوار گذرا اور وہ ہندوستان چلے آئے ۔ لیکن اس واقعہ کا ذکر کسی اورکتاب میں نہیں ملتا علاوہ نجم الغنی خاں کی تاریخ اودھ[3] کے جو اسی سے نقل کیا گیا ہے ۔ اسی سلسلے میں اور ایک واقعہ بھی کمال الدین حیدر[4] اور نجم الغنی خاں[5] نے نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ میر محمد امین نے نیشا پور میں کچھ ٹھیکہ لیا تھا اس میں نقصان ہوا میرزا یوسف کورکی والدہ کا زیور فروخت کرکے اس کو ادا کیا اور اس سے شرمندہ ہوکر ہندوستان آئے ۔ کچھ عرصے بعد دونوں بھائی دہلی کے لیے روانہ ہوگئے کچھ عرصے بعد میر محمد امین گجرات کے نواب سر بلند خاں مبارز الملک کی سرکار میں خیمہ نصب کرانے پر مامور ہوئے ۔ اتفاق سے ایک دن خیمہ ایسی جگہ پر نصب کرادیا جہاں بارش ہونے پر سارا پانی خیمے میں آگیا اور نواب نے پوری رات پریشان رہ کر گذاری ۔ نواب ان پر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تمھارے دماغ میں ہوئے ہفت ہزاری[6] پائی جاتی ہے ۔ انھوں نے یہ نوکری چھوڑدی اور دہلی چلے آئے ۔ یہاں پر شاہزادوں کی جاگیر کا ٹھیکہ لینا شروع کیا اور اپنی دیانت داری سے جو حاصل ہوتا تھا اس میں سے بھی چہارم شاہزادوں کو دیا کرتے تھے ۔ جب ان کی دیانت داری اور

---

۱ مفتی ولی اللہ ۔ تاریخ فرخ آباد ص ۲۲ ۲ سوانحات سلاطین اودھ۔ جلد اول ص ۱۹

۳ نجم الغنی خاں تاریخ اودھ۔ جلد اول ص ۱۶ ۴ سوانحات سلاطین اودھ۔ جلد اول ص ۱۹

۵ نجم الغنی خاں تاریخ اودھ۔ جلد اول ص ۱۶ ۶ مفتی ولی اللہ ، تاریخ فرخ آباد ص ۲۲ پر پنج ہزاری لکھا ہے مگر غلام علی خاں ۔ عماد السعادت ص ۵ اور کمال الدین حیدر سوانحات سلاطین اودھ۔ ص ۲۰ پر ہفت ہزاری لکھا ہے ۔

ایمانداری کے چرچے ہوئے تو نوبت حضور شاہی تک پہنچی جب فرخ سیر ولد عظیم الشان بن شاہ عالم بہادر شاہ ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوئے تو محمد جعفر المخاطب بہ تقرب خاں خانساماں کو ابتدائے جلوس فرخ سیری میں کرورگیری گنج کی خدمت تفویض ہوئی تو اس کی نیابت میں میر محمد امین مقرر ہوئے[1]۔

محمد امین نے رائے رتن چند دیوان اعظم قطب الملک عبداللہ خاں سے دوستی کرلی۔ اس نے ۱۱۲۸ھ (۱۷۱۵ع) میں ہنڈون بیانہ متعلق صوبہ اکبر آباد کی فوج داری کی سند دلادی[2] اس علاقہ کی آمدنی اٹھارہ لاکھ روپے سالانہ تھی[3]۔ محمد امین نے اس علاقے کا بڑی عمدگی سے انتظام کیا اس وجہ سے منصب میں ترقی ہوئی اور سعادت خاں برہان الملک کا خطاب ملا انہیں دنوں نواب محمد تقی خاں صوبہ دار اکبر آباد کی بیٹی سے شادی کی نجم الغنی خاں[4] نے لکھا ہے کہ اس سے پہلے ان کی دو شادیاں اور ہوچکی تھیں ایک سید طالب محمد خاں آصف جاہی کی بیٹی سے اور دوسری ایک شریف خاندانی بیٹی سے جس خاندان سے اشرف علی خاں تھے لیکن بیاہ کے بعد یہ عورت لاولد مرچکی تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ اس موقع پر برہان الملک کی اس شادی کا ذکر نجم الغنی صاحب نے نہیں کیا جو میر محمد یوسف کی بیٹی سے ہوئی تھی اور جس کا ذکر انہوں نے تاریخ اودھ جلد اول کے صفحہ ۱۵ پر کیا ہے۔ مولوی مفتی ولی اللہ[5] نے صرف ایک بیوی خانم صاحبہ کا ذکر کیا ہے۔ عماد السعادت[6] اور سوانحات سلاطین اودھ[7] میں بھی نواب محمد تقی خاں صوبہ دار کی دختر سے شادی کے قبل دو اور شادیوں کا ذکر ہے۔ جیسا کہ نجم الغنی نے کیا ہے۔ شیخ تصدق[8] حسین نے ان کی شادیوں کی تفصیل اس طرح لکھی ہے۔

ہندوستان آکر برہان الملک نے تین عقد کیے۔ پہلی شادی نواب کلب علی خاں کی بیٹی سے کی جو دہلی کے ایک معزز باشندے اور شاہی عہدے دار بھی تھے۔ یہ بیوی شادی کے بعد ہی چل بسی مگر اس مناکحت سے میر محمد امین نے بہت اثر اور شہرت حاصل کی۔

۱، ۲ نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ جلد اول ص ۱۷ ۳ مفتی ولی اللہ، تاریخ فرخ آباد (قلمی) ص ۲۲ پر بفتاد لکھ لکھا ہے۔ ۴ تاریخ اودھ جلد اول ص ۱۸

۵ مفتی ولی اللہ، تاریخ فرخ آباد (قلمی) ص ۲۲ ۶ عماد السعادت ص ۵

۷ سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۳۲ ۸ بیگمات اودھ ص ۱۵ تا ۱۶

دوسری شادی سید طالب محمد خاں آصف جاہ کی دختر سے کی ان بیوی سے چار لڑکیاں صدر جہاں بیگم ، ہنیکا بیگم ہما بیگم ، محمدی بیگم اور ایک لڑکا پیدا ہوا جو سن طفولیت ہی میں چیچک کی نذر ہوگیا۔ برہان الملک نے صرف صدر جہاں اور ہنیکا بیگم کی شادیاں اپنی حیات میں کیں باقی لڑکیوں کی شادیاں ان کے بعد ان کے جانشیں اور داماد نواب صفدر جنگ نے کیں۔

تیسرا عقد بزمانہ ٹھیکہ ہنڈوں و بیانہ نواب محمد تقی خاں صوبہ دار اکبرآبادی کی دختر سے کیا۔ اس شادی میں برہان الملک کو جہیز میں ایک کنیز بھی ملی جس کا نام خدیجہ خانم تھا۔ بیوی تو شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد ملک عدم کو سدھار گئیں مگر خدیجہ خانم نواب کے تصرف میں آئیں اور ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام صدرالنساء رکھا گیا۔

مگر نجم الغنی خاں[1] ان کی اولاد کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:
« نواب سعادت خاں برہان الملک کے ہندوستان میں ایک بیٹا او پانچ بیٹیاں ہوئیں بڑی بیٹی صدر جہاں بیگم دوسری نور جہاں بیگم تیسری ہما بیگم عرف بندی بیگم چوتھی محمدی بیگم پانچویں آمنہ بیگم اور بیٹا برہان الملک کے بعد حالت طفلی میں مرگیا ان میں سے صدر جہاں بیگم زوجہ نواب صفدر جنگ خانم صاحبہ بنت نواب محمد تقی خاں صوبہ دار اکبر آباد کے بطن سے تھیں اور باقی چار بیٹیاں بی بی صاحبہ سے تھیں

گور سہائے[2] نے ہنیکا بیگم کو نواب محمد تقی خاں صوبے دار کی بیٹی کے بطن سے بتایا ہے۔

سیدکمال الدین حیدر[3] کا کہنا ہے کہ میر محمد امین کے ہندوستان میں آجانے اور صاحب منصب و مرتبہ ہوجانے کے بعد میر محمد باقر ہندوستان آئے لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اس سے پہلے اس کی شہادت کسی بھی تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتی۔ میر محمد امین برہان الملک کی وفات سرطان کے مرض سے ۱۰۵۱ھ میں ہوئی۔ اور ان کے بھائی سیادت خاں کی وفات ۱۱۴۴ ع میں ہوئی تھی۔

میر شاہ میر کا بڑا بیٹا میرزا محمد یوسف بڑا زبردست تھا۔ تمام ایران میں اس جیسا کوئی دوسرا نہ تھا اسی وجہ سے نادر شاہ نے دھوکے سے گرفتار

---

۱ تاریخ اودھ۔ جلد اول ص ۸۳ تا ۸۴ ۲ تاریخ اودھ (قلمی) ص ۹
۳ سوانحات سلاطین اودھ۔ جلد اول ص ۲۰

کرکے اندھا کرادیا تھا اسی لئے یہ میرزا محمد یوسف کورکے نام سے مشہور ہیں
اسی واقعہ کو منشی رام سہائے تمنا' نے اس طرح نقل کیا ہے ۔

"ایک روز نادر شاہ بادشاہ ایران شکار میں جنگل آیا ایک درخت سایہ دار نظر پڑا کچھ دیر درخت کے نیچے آرام کیا۔ وقت روانگی یہ الفاظ زبان پر لایا کہ افسوس یہ درخت ساتھ نہیں چل سکتا کہ اثنائے راہ میں شدت گرما سے امن ہوتی میرزا صاحب نے کوہکن خاراشگاف سے شجر رشک طوبیٰ کو بیخ و بن سے کندہ کرکے عصاوار ہاتھ میں لے لیا اور فرق مبارک بادشاہ وقت پر مثل چتر مبارک سایہ کناں تادر دولت آئے نادر شاہ کو حیرت ہوئی اور میرزا صاحب کی اس طاقت کی طرف سے بےجا تصور ذہن میں آیا خوف و اندیشہ سے بہ مکرو دغا میل گرم آنکھوں میں پھروا کے نابینا کردیا "

میرزا محمد یوسف کی شادی جعفر خاں بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا محمد شفیع کی سب سے چھوٹی بیٹی سے ہوئی تھی جن سے تین لڑکے ہوئے بڑا بیٹا سید محمد خاں دوسرا شاہ میر خاں اور تیسرا میرزا محمد امین خاں میرزا محمد یوسف کی دوسری شادی مرزا محمد باقر کی بیٹی سے ہوئی تھی اور ان سے دو بیٹے میرزا جعفر اور میرزا غیاث الدین محمد خاں تھے جو روضۂ حضرت امام رضا علیہ السلام کے فراش خانہ کے داروغہ تھے ۔

میر شاہ میر کے دوسرے بیٹے نصیر الدین حیدر خاں بیگ کی شادی نواب برہان الملک کی دوسری بیٹی سے ہوئی تھی جب نواب برہان الملک کی بیٹی نور جہاں بیگم عرف ہنیگا بیگم دس برس کی تھیں تو برہان الملک نے اپنی بہن کو مع ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر خاں بیگ کے بلاکر نصیر الدین حیدر کی شادی ہنیگا بیگم سے کردی تھی ۔

میر شاہ میر پسر محمد یوسف کی بڑی بیٹی عرف بی بی کلاں کی شادی نواب محمد قلی خاں عرف مرزا کوچک بن مرزا محسن سے ہوئی تھی اور اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام میرزا جعفر تھا ۔ محمد قلی خاں اپنے چچا صفدر جنگ کی طرف سے الہ آباد کے ناظم تھے اور شجاع الدولہ کے ہاتھ سے مارے گئے تھے ۔ پہلے ان کی شادی برہان الملک کی بیٹی محمدی بیگم سے ہوئی تھی جس کے بطن سے ایک بیٹی بدھن صاحبہ ہوئی جس کا بیاہ زین العابدین پسر مرزا بزرگ بن

---

۱ افضل التواریخ حصہ دوم احسن التواریخ ص ۲۳۱ تا ۲۳۲

مرزا محسن کے ساتھ ہوا۔ محمدی بیگم کی وفات کے بعد محمد قلی خاں نے بی بی کلاں سے شادی کی تھی[1] محمد قلی خاں کو آغا بابا بھی کہتے تھے۔

میر شاہ میر کی چھوٹی بیٹی چھوٹی بی بی کے نام سے مشہور تھیں۔ چھوٹی بی بی کی شادی مرزا محسن کے بڑے بیٹے جعفر قلی خاں عرف مرزا بزرگ سے ہوئی تھی ان کے ایک بیٹا ہوا جس کا نام مرزا شفیع خاں تھا۔ جب مرزا شفیع خاں نیشاپور سے ہندوستان میں آئے تو نواب شجاع الدولہ نے ان کو اپنی سپاہ میں رسالہ دار کردیا اور برہان الملک کی بیٹی آمنہ بیگم کی لڑکی سے ان کی نسبت ہوئی لیکن دلہن کی رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا اور مرزا شفیع خاں دہلی چلے گئے۔ نجف خاں ذوالفقار الدولہ کے انتقال کے بعد دلی کے امیر الامرا ہوئے محمد بیگ خاں ہمدانی نے دغا سے مار ڈالا۔ مرزا بزرگ کے ایک بیٹا کسی دوسری بیوی سے بھی تھا اس کا نام زین العابدین خاں تھا۔ جو عمر میں مرزا شفیع سے بڑا تھا[2] زین العابدین خاں کی شادی محمد قلی خاں کی بیٹی مڈھی بیگم سے ہوئی تھی۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

عمادالسعادت[3] اور تاریخ اودھ[4] میں لکھا ہے کہ سید محمد خاں پسر کلاں میرزا محمد یوسف کور کی شادی نواب برہان الملک کی چھوٹی بیٹی آمنہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں نجم الغنی صاحب کو دھوکا ہوا لکھتے ہیں[5]

«پانچویں بیٹی آمنہ بیگم کا بیاہ سید محمد خاں سے ہوا جیسا کہ قیصر التواریخ میں ہے اگر یہ وہی سید محمد خاں ہے جو نواب کا بھتیجا ہے تو ہما بیگم کے انتقال کے بعد آمنہ بیگم اس کے نکاح میں آئی ہوگی اور اگر کوئی دوسرا شخص ہے تو خیر کاتبوں کی غلطی سے نام بدل گیا ہے»

آمنہ بیگم کے ایک بیٹی شمس النسا بیگم ہوئی جو تو کل صاحبہ کے نام سے مشہور تھی اور مرزا جعفر نواب محمد قلی خاں کے بیٹے سے بیاہی گئی تھی جو نواب محمد خاں کی پھوپی کے بطن سے تھے۔ اس سے اولاد نہ ہوئی مگر سردار مرزا سیدو کے بیٹے کو پیدائش کے وقت اپنی فرزندی میں لے لیا تھا کہ میرے بعد وارث ہوگا مگر یہ تھوڑے دن بعد مرگیا۔ مرزا جعفر کے دوسری بیوی سے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں میرزا محمد یوسف کے دوسرے بیٹے شاہ میر خاں کی

---

۱ نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ جلد اول ص ۹۳ تا ۹۴   ۲ ایضاً   ۳ عمادالسعادت ص ۲۹
۴ تاریخ اودھ از گود سہائے (قلمی) ورق ۹ ب   ۵ سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۲۳

شادی اپنے چچا نصیر الدین حیدر خاں بیگ کی لڑکی سے ہوئی. ان کی بیوی کے لڑکے کی پیدائش کے بعد انتقال ہوگیا اور وہ خود بادشاہ کے ساتھ نواب نجف خاں کی لڑائی میں مارا گیا نواب برہان الملک کی تیسری بیٹی ہما بیگم کی شادی نواب کے بھتیجے سید محمد خاں سے ہوئی تھی جو اپنے باپ سیادت خاں کے خطاب کے ساتھ مخاطب تھے[1]

میرزا محمد یوسف کے تیسرے بیٹے میرزا محمد امین خاں کی شادی چچا نصیر الدین حیدر خاں بیگ کی چھوٹی بیٹی یعنی نواب برہان الملک کی نواسی انجم النساء بیگم مشہور بہ کھپتو بیگم سے ہوئی. سید کمال الدین حیدر[2] نے سوانحات سلاطین اودھ میں میرزا محمد امین کی موت کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے «جب مرزا محمد شفیع خاں امیر الامرا ہوئے ان کی بد مزاجی سے حتے سردار اور افسر فوج میں تھے ناراض بیلل و حایت آرو ہوکر راہ عاقبت ڈھونڈنے لگے از آنجملہ محمد از حرامی محمد بیگ خاں ہمدانی سے حب بظاہر صلح و آشتی ٹھہری نواح اکبر آباد میں لشکر طرفین صفوف آراستہ ہوکر کھڑا ہوا ایک طرف سے مرزا محمد شفیع خاں اجل گرفتہ دوسری جانب سے محمد بیگ خاں ہاتھی پر سوار وسط میدان میں پہونچے محمد بیگ خاں مولا تھا مرزا صاحب دولے محمد بیگ خاں نے دست معانقہ بڑھاکر اپنی طرف کھینچا اسمٰعیل بیگ خاں ان کا بھانجا خواصی میں تھا مرزا کے پشت میں کٹار مارکر تمام کردیا ان کے منھ سے فقط اتنی بات نکلی اے قرمساق آخر دغا کی تونے» محمد بیگ نے دونوں ہاتھوں سے بیعت کی اور اپنی طرف کھینچ لیے محمد شفیع خاں زمین پر گرپڑے ان کے خواص میں میرزا محمد امین خاں باپ میرزا محمد تقی خاں کے تھے. جب محمد شفیع خاں کی سواری کے ڈنکے کی آواز سنی جلد ہاتھی پر سوار حوضہ ہندوستانی میں اضطراب سے ان کی پگڑی الجھ کر گرپڑی. لوگوں نے کہا یہ شگون بد ہوا آپ نہ جائیے نہ مانا. جب میدان وغا میں پہنچے چاہا کہ ہاتھی پر کھڑے ہوکر محمد بیگ کو تلوار ماریں اس نے دفعتاً اپنے ہاتھی کو بٹھا دیا. یہ جھونک میں تلوار کے گرپڑے. محمد بیگ نے اپنے ہاتھوں سے کچلوا دیا. مشکل سے لاش ملی. اکبر آباد میں دفن ہوئے. زبانی میر محمد سید علی خاں رسالدار»

میرزا محمد امین کے کھپتو بیگم سے جو اولاد ہوئی اس کے بارے میں مختلف آرا ہیں سید کمال الدین حیدر[3] نے لکھا ہے کہ چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں بڑا

۱ نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ جلد اول ص ۸۳ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ص ۲۶

بیٹا میرزا محمد نصیر خاں، میرزا محمد تقی خاں (یہی میرزا محمد تقی خاں آگے چل کر شاعر ہوئے اور ترقی تخلص اختیار کیا) ان سے چھوٹی بہن قدسیہ بیگم اور چھوٹے بھائی میرزا علی نقی عرف میرزا حجو اور ان سب سے چھوٹی بہن سات برس کی ہوکر مرگئی ان میں سب سے چھوٹا بھائی میرزا محمد یوسف عرف میرزا ابو سترہ برس[1] کے سن بہ سبب اپنی شہ سواری کے گھوڑے سے گرکر مرگیا تھا۔ ان کی ماں کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ محمد فیض بخش[2] نے چار بیٹوں اور ایک بیٹی کا ذکر کیا ہے۔ سید غلام علی خاں[3] نے صرف چار بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔

وضاحت کے لیے میرزا محمد تقی خاں کا شجرۂ نسب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

میرزا محمد تقی ـ بن محمد امین ـ بن میرزا محمد یوسف ـ بن میرزا شاہ میر خاں بن میر محمد یوسف ـ بن سید محمد امین ـ بن سید محمد جعفر ـ بن قاصی میر شمس الدین شہید نجفی[4] ـ بن سید محمد ـ بن سید غیاث الدین محمد ـ بن سید علی[5] بن سید سراج الدین علی ـ بن سید اسحاق بن سید محمد ـ بن سید یحیی بن سید غیاث الدین محمد ـ بن سید محمد ثانی[6] ـ بن سید موسیٰ ـ بن سید قاسم ـ بن سید علی ثانی ـ بن سید جعفر ـ بن سید حسین المقدم[7] ـ بن سید عبد الحیی ـ بن سید عمر ـ بن سید ادارۃ م ـ بن سید عبدالقادر ـ بن سید تاج الدین ـ بن سید فخر الدین[8] ـ بن سید زید[9] ـ بن موسیٰ کاظم علیہ السلام۔

---

۱ ایضاً ص ۲٦ پر سولہ برس کا سن لکھا ہے اور دوسری مذکورہ کتب میں سترہ برس کا سن لکھا ہے۔

۲ فیض بخش۔ تاریخ فرخ بخش ورق ۳۵٦ الف (قلمی)

۳ سید غلام علی خاں، عمادالسعادت ص ۲۹

۴ سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۱۳ پر نخفی لکھا ہے۔

۵ کتاب مذکور میں یہ نام نہیں۔ وزیر نامہ ص ۲۷ اور عمادالسعادت ص ۳۰ پر یہ نام ہے۔

٦ وزیر نامہ اور عمادالسعادت میں یہ نام ہے اور سوانحات سلاطین اودھ میں نہیں۔

۷ وزیر نامہ اور عمادالسعادت میں اسی طرح ہے سوانحات سلاطین اودھ جلد اول میں حسینی المخدوم لکھا ہے

۸ وزیر نامہ عمادالسعادت میں محیی الدین ہے۔

۹ وزیر نامہ اور عماد السعادت اور سوانحات سلاطین اودھ میں زاہد یا شہید لکھا ہے اور فخر الدین اور زائد میں سید علی کا واسطہ ہے۔

نوٹ :ـ نجم الغنی خاں تاریخ اودھ جلد اول ص ۱۲، ۱۳ مذکورہ نام اسی طرح ہیں

ترقی کا شجرۂ نسب
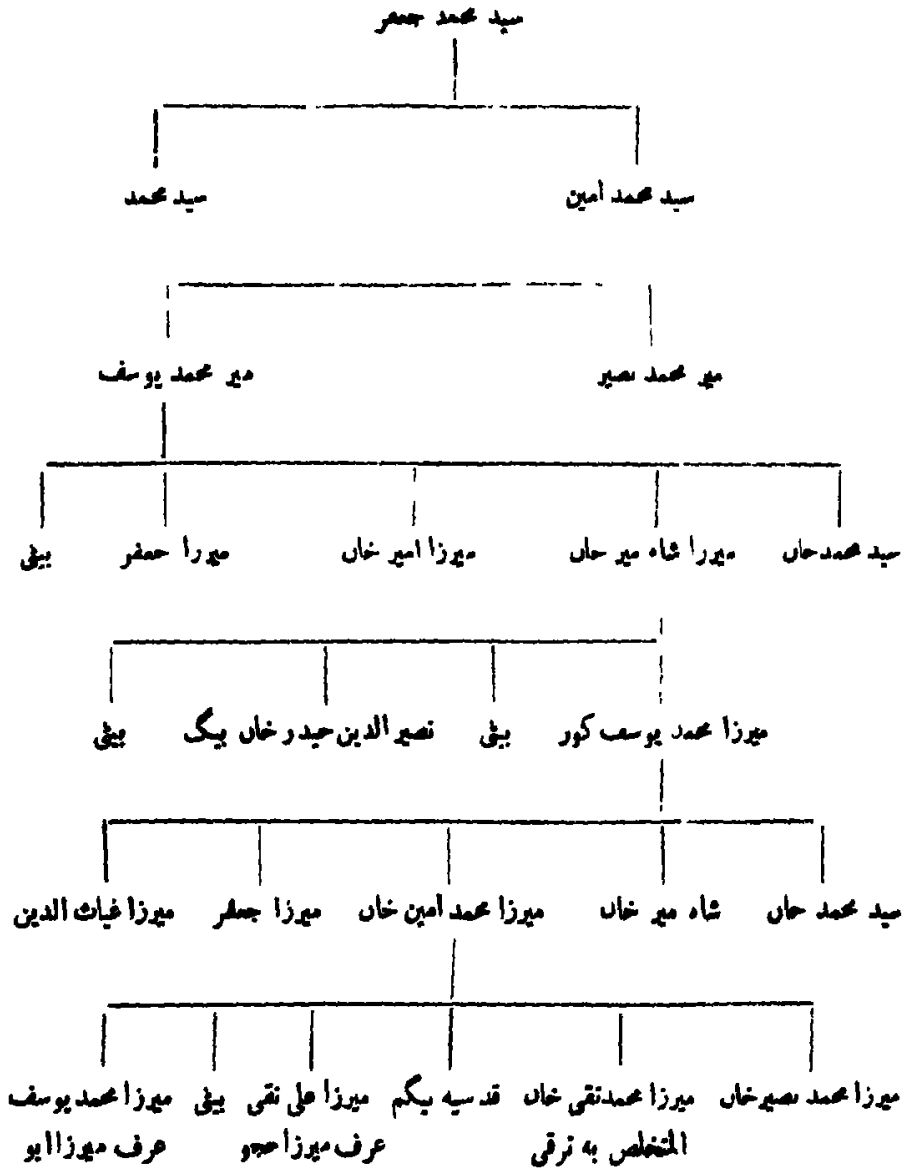
محترمہ شاکرہ صاحبہ
معاون لائبریرین ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اردو میں فہرست سازی کے مـاخذ

اردو میں فـــہرست سازی کے طریقوں پر پہلے پہل مغربی ملکوں ہی میں تحقیق شروع کی گئی اور اس کے لئے ضابطے بھی بنائے گئے۔ اس کی ایک مثال پیش نظر ضـابطہ بھی ہے جو پشاور یونیورسٹی کے لائبریرین عبدالصبوح قاسمی کی اس تحقیق کا نتیجہ ہے جو انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں انجام دی۔ اس یونیورسٹی میں صاحب موصوف نے اردو، پشتو اور پنجابی میں فہرست سازی کے موضوع پر کام کیا اور نتیجے کو ایک ضابطہ کی شکل میں مرتب کیا جو۔
A Code for Cataloguing Materials (Published in Urdu, Pushto and Punjabi)
کے نام سے ۱۹٦۷ء میں شایع ہوا۔

عبدالصبوح قاسمی صـاحب پشاور یونیورسٹی کی جـانب سے اس موضوع پر تحقیق کرنے کے لئے کولمبیا یونیورسٹی بھیجے گئے تھے جہاں انھوں نے لائبریری آف کانگریس واشنگٹن میں اپنے موضوع کے لئے مواد حاصل کیا اور وسیع بنیادوں پر پروفیسر مارس ایف ٹابر Maurice F Tauber کی نگرانی میں عبدالصبوح قاسمی صاحب نے اپنے کام کا آغاز کیا۔

مقالہ حسب ذیل نو بابوں پر مشتمل ہے :

پہلا باب : پیش لفظ

دوسرا باب : موجودہ صورت حال

تیسرا باب : ٹرانس لٹریشن (Transliteration)

چوتھا باب : ٹرانس لٹریشن کے طریقے

پانچواں باب : ناموں کی تحلیل

چھٹا باب : ناموں کا اندراج ، موجودہ طریقہ
ساتواں باب : اندراج کے طریقے
آٹھواں باب : وضاحتی فہرست
نواں باب : خلاصہ ، اختتام

صاحب موصوف نے ہندوستان و پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کی بڑی تعداد اور ان کے تنوع کو پیش کرتے ہوئے ان دونوں ملکوں کی سرکاری اور منظورکردہ زبانوں کا سرسری تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پاکستان کی چار زبانیں سندھی ، اردو ، پشتو اور پنجابی ایسی ہیں جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ اور بیشتر لائبریریوں میں ان زبانوں کی کتابیں موجود ہیں چونکہ صاحب تالیف سندھی سے واقف نہیں ہیں اسی لئے انھوں نے بقیہ تینوں زبانوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا جنہیں وہ بخوبی جانتے ہیں۔

قاسمی صاحب نے ان مسئلوں کو گنایا ہے جوکسی بھی لائبریری کے سامنے آتے ہیں یعنی کتابوں کی اشاعت میں اضافہ کے ساتھ ان زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست سازی کی ضرورت ، مختلف وجوہ سے مغربی ملکوں کی لائبریریوں میں کتابوں کا تیز رفتار اضافہ ، مغربی زبانوں میں لکھے گئے فہرست سازی کے ضابطوں کا ادھوراپن ان کی خود مغربی زبانوں کے مسئلوں کو حل کرنے میں ناکامی ، اینگلو ۔ امریکی ضابطوں کا بذات خود نامکمل ہونا نیز فارسی اور عربی زبانوں کے لئے لکھے گئے ناصر شریفی اور محمود شنیق کے ضابطوں کی اردو کے مسئلوں سے تھوڑی سی عدم مطابقت ان مسائل کے پیش نظر عبدالصبوح قاسمی صاحب نے ایک علیحدہ ضابطہ ان زبانوں کے لئے مرتب کرنے کا تہیہ کرلیا۔

مقالہ کے آغاز میں امریکن طریقۂ تحقیق کے مطابق قاسمی صاحب نے تین عنوانات قائم کئے ہیں :

۱ مسئلہ کی تفصیل (Statement of Problems)
۲ قیاس (Assumption)
۳ مفروضہ (Hypotheses)

ان تینوں مرحلوں کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں

۱ مسئلہ کی تفصیل (Statement of Problems) کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں ۔
۲ صاحب تالیف (شخصی یا اجتماعی) کے نام کو برتنے کا طریقہ

۳ عنوان یا سرخی کی شناخت اور وضاحتی بیان

۴ اردو ٹرانس لٹریشن (Transliteration) رومن رسم الخط میں ان زبان کی لکھاوٹ

عبدالصبوح قاسمی صاحب ان مسئلوں کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے نام دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے ناموں سے مختلف ہیں اگرچہ رنگناتھن جی اس مسئلہ سے واقف تھے تاہم ان کے پیش کردہ حل ان زبانوں کے فہرست سازی میں پوری مدد نہیں کرتے اسی طرح پاکستان کے ایس ایم جعفر، اے سعید، فضل الٰہی اور انیس خورشید کے مضامین بھی تشفی بخش نہیں کہے جاسکتے کیونکہ ان حضرات نے پشتو اور پنجابی ناموں پر غـــور نہیں کیا تھا حالانکہ ان ناموں کی بھی اپنی خصوصیات ہیں۔

۲ عنوان کی شناخت اور فہرست میں وضاحتی بیان کے اندراج کا مسئلہ کوئی مشکل مسئلہ تو نہیں ہے۔ تاہم اب تک کسی نے بھی اس پر اظہار خیـال نہیں کیا ہے۔

۳ تیسرے مسئلے اردو ٹرانس لٹریشن کے بارے میں انیس خورشید نے بحث کی ہے مگر وہ عربی، فارسی اور پشتو ٹرانس لٹریشن کے بارے میں خاموش ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس حد تک فہرست سازی کے موجودہ طریقے، اردو، پنجابی اور پشتو کی کتابوں اور دوسرے مواد کی فہرست سازی کے لئے باقاعدہ معیـار بن سکتے ہیں۔

۲ قیاس Assumption : تحقیق کے دوسرے مرحـــلے یعنی « قیـاس کو عبدالصبوح صاحب یوں ترتیب دیتے ہیں۔ ان کے خیـال میں : « عالمی تمدن کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ایک ملک کا ادب کسی بھی دوسرے ملک کے خـواہش مند فرد کی پہنچ میں رہے۔ کتب خانے اس ادبی ذخیرے کو مرتب حالت میں محفوظ رکھنے کی اہم ایجنسیاں ہیں اس مـــواد کو مرتب کرنے کے لئے مناسب ببلوگرافیوں یا فہرستوں کی تیاری ناگزیر ہے۔

مسئلہ اور قیـاس کو پیش کردینے کے بعد عبدالصبوح قاسمی اس مفروضہ تک پہنچتے ہیں کہ مذکورہ تینوں زبانوں کے لئے نہ کوئی علیحدہ ضابطۂ فہرست سازی موجود ہے اور نہ ایسے اصول موجود ہیں جنہیں ضابطہ کہا جاسکے۔ اسی طرح وضاحتی اندراج کے لئے بھی منضبط طریقے موجود نہیں ہیں۔

ان مفروضوں کی روشنی میں اپنے تحقیقی مقالے کو پیش کرتے ہوئے اس کی تکمیل کا منصوبہ بناتے ہیں جو حسب ذیل ہے :

۱ مفروضوں کی جانچ

۲ ضابطہ کی ترتیب

۳ ہندوستانی ، پاکستانی ، انگریزی ، فرانسیسی ، جرمنی اور عربی ضابطوں کا تجزیہ

۴ مطبوعہ فہرستوں کی تحلیل

منصوبہ کے پیش نظر حسب ذیل لائبریریوں کی فہرستوں اور کتابی اساسہ کی جانچ کو ضروری سمجھا گیا ۔

امــریکہ اور کینڈا کی وہ لائبریریاں جنہیں PLO 480 کے تحت ان تینوں زبانوں کی کتابوں کے مکمل سیٹ فراہم کئے جارہے ہیں یعنی :

لائبریری آف کانگریس ، برکلے ، لاس انجلز ، کیلی فورنیا ، شکاگو ، کولمبیا ، کارنل ، ایڈیوک یونیورسٹیوں کی لائبریریاں ، لائبریری آف دی انسٹی ٹیـــوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ، مک گل یونیورسٹی ، مانٹریال یونیورسٹی ، پاکستان میں کراچی ، سندھ ، پنجاب ، پشاور اور بنگلا دیش میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریریاں ، پنجاب پبلک لائبریری ، ہندوستان میں علی گڑھ ، عثمانیہ اور دہلی یونیورسٹی کی لائبریریاں

اسی طرح ۳۰ سوال مند امریکی لائبریریوں کو اور نو باہر کی لائبریریوں کو بھیجے گئے ۔ امریکہ کی ۲۸ لائبریریوں نے جوابات روانہ کئے ۔

امریکی لائبریریوں کو سامنے رکھ کر ان کا معائنہ کیا گیا اور مشاہدہ میں آنے والے حالات کی تفصیل اسباب میں دی گئی ہے ساتھ ہی ایسے تحقیقی طریق عمل کی وضاحت کی گئی ہے مختلف ماخذوں سے پچیس سو مصنفوں کے نام جمع کئے گئے ۔ ان ناموں کو ان کے اندراجی عنصر کے مطابق زمروں میں بانٹا گیا پھر مختلف لائبریریوں کو رائے دہی کے لئے بھیجا گیا پھر آخر میں جوابوں کو تحلیل کر کے ضابطہ مرتب کیا گیا ۔

تیسرے اور چوتھے باب میں نقل تلفظ (Transliteration) کے بارے میں مختلف ماخذوں سے جمع کئے ہوئے مواد کی تفصیل دی گئی ہے ۔ پہلے موجودہ طریقوں کی تحلیل کی گئی ہے پھر تینوں زبانوں کے لئے نقل تلفظ کیسے ہــو اس بارے میں سفارش پیش کی گئی ہیں ۔

پانچویں باب میں زیر بحث زبانوں میں مروجہ طریقہ کی تحلیل کی گئی ہے ۔ اس کے لئے وہ ناصر شریفی کا تتبع کرتے ہوئے انہیں کے طریقہ تحلیل کو اپناتے ہیں وہ یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ موجودہ مقالہ میں صرف اردو ، پنجابی اور پشتو

کے مسلمان مصنفوں سے بحث کی جائے گی۔ جس میں مسلمان افغان پشتو مصنفین بھی شامل رہینگے۔

اس کے بعد عبدالصبوح صاحب بتاتے ہیں کہ مغرب کے مختلف ضابطوں میں اسلامی ناموں کی تحلیل مختلف عنوان جیسے مسلم نام، عصمڈن نام، ایرانی نام وغیرہ کے ذیل میں کی گئی ہے۔ عموماً سب کے نتیجے یکساں ہیں۔ ان ضابطوں میں اسلامی ناموں کے حسب ذیل عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے۔

نام (اسم)، تخلص، کنیت، خطاب لقب۔ ویسے ہر عنصر مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے اور ان کی ترتیب میں کوئی یکسانیت نہیں ہے اور اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

چھٹے باب کا عنوان ہے۔ ناموں کا اندراج اور موجودہ طریقے۔ اسی باب میں مصنف ناموں کے اندراج اور موجودہ طریقوں کی تفصیل بتاتے ہیں۔

ان کے خیال میں فہرست میں ناموں کے اندراج میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے یکساں طریق کار کی پابندی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ گذشتہ سالہا سال میں مغرب میں مغربی زبانوں میں فہرست سازی کے لئے بڑی محنتوں سے کوڈ بنائے گئے پھر بھی مسائل جوں کے توں برقرار رہے۔

آگے مصنف حسب ذیل عنوان پر اظہار خیال کرتے ہیں:

مسلم نام، ہندوستان میں مسلمانوں کے نام، زیر بحث زبانوں کے علاقے میں مسلم نام۔ تاہم ان سبھی عنوانوں کے تحت تقریباً وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جو اس سے پہلے کے بابوں میں کہہ دی گئی ہیں۔

اس کے بعد ان معلومات کو اکھٹا کیا گیا ہے جو سوال سد کے جواب میں وصول ہوئے تھے ان کے مطابق یونائٹیڈ اسٹیٹس میں لائبریریوں کی اکثریت (ان میں سے جنھوں نے سوال بند کا جواب دیا ہے) اے ایل اے ضابطہ کی پیروی کرتی ہے

ہندوستان کے منتخبہ تین لائبریریوں میں سے ایک (دہلی) رنگناتھن کے ضابطہ پر عمل کرتی ہے۔ بقیہ دو لائبریریاں اپنے طریقے پر کار بند ہیں جو غالباً تحریر میں نہیں لائے گئے ہیں

پاکستان کی پانچوں منتخبہ لائبریریاں اپنے اپنے طریقوں پر کار بد ہیں جو مطبوعہ نہیں ہیں تاہم انھوں نے اپنے اپنے طریقہ کار کے باب میں تحریری تفصیل بہم پہنچائی

برطانوی لائبریریاں ابھی تک (مقالہ لکھے جانے تک) اپنے پرانے روایاتی طریقوں پر عمل کررہی ہیں۔ ان لائبریریوں نے طریقہ کار کو تحریری شکل میں فراہم کیا

امریکی لائبریریوں کا مصنف نے بذات خود معاینہ کیا اور سوال نامہ کے جوابوں کی جانچ پڑتال کی۔ امریکہ سے باہر کی لائبریریوں کے صرف جوابات پر اکتفا کرلیا گیا معاینہ نہیں کیا جاسکا۔

ساتویں باب کو طریقہ کار کے لئے مختص کیا گیا ہے اور اس کے دو حصے کئے گئے ہیں۔

فہرست سازی کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ پیرس ۱۹۶۱ء کے رہنما اصولوں پر مبنی ناصر شریفی کے مرتب کردہ اصولوں کے تذکرہ سے اسی باب کو شروع کیا گیا ہے یہ اصول حسب ذیل ہیں۔

۱ ذاتی نام کا اندراج اس عنصر یا اس جز کے تحت کیا جائے گا جس سے اس فرد کا نام ادب یا حوالے کی کتابوں میں درج کیا جاتا ہے یا پھر نام کے سب سے زیادہ نمایاں عنصر (جز) میں درج کیا جائے گا۔

۲ ایک ہی فرد کے نام کو فہرست میں ہمیشہ ایک ہی عنصر (جز) کے تحت درج کیا جائے گا۔

(۳) دو مختلف افراد کا فہرست میں کبھی بھی یکساں سرخی کے تحت اندراج نہ کیا جائے گا۔

عبدالصبوح قاسمی صاحب نے ناصر شریفی کے مندرجہ اصولوں پر مبنی اپنے مجوزہ اصول پیش کئے ہیں۔ جن کا زیر بحث تینوں زبانوں کی فہرست سازی پر انطباق کیا جاسکتا ہے۔

فرد کے نام کا اندراج اسی فرد کے نام کے اس عنصر (جز) کے تحت کیا جائے گا۔ جس سے وہ فرد عام طور سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

اس مناسب جز (عنصر) کا تعین حوالے کی کتابوں کی مدد سے کیا جائے گا پھر بھی فہرست ساز کو ان محولات (ریفرنس سورسز: Reference Sources) کے مستند ہونے کے بارے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ عبدالصبوح قاسمی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان زبانوں کے جدید مصنفین کے نام محولات میں نہیں ملتے۔ ایک تو یہ کہ ان تینوں زبانوں میں حوالے کی کتابوں کی تعداد ہی

بہت کم ہے دوسرے ان میں سے بہت سی کتابوں کو قابل بھروسہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ کسی ایک عنصر (جز Element) کا انتخاب مستقلاً کرلیا جائے جس کے ذیل میں اس فرد کا نام ہمیشہ لکھا جاتا رہے۔

اس باب کے حصہ ب میں نام کے دوسرے حصوں (عناصر) یعنی تخلص ، نام ، آبائی نام ، لقب ، نسبت وغیرہ کے بارے میں قاعدے بنائے گئے ہیں۔

اس کے بعد عبدالصبوح قاسمی نے اپنے ضابطہ کے قاعدے پیش کئے ہیں یعنی نام ، تخلص ، آبائی نام ، لقب ، نسبت وغیرہ کے اندراج کے لئے قاعدے پیش کیے ہیں۔

ایک ہی فرد کے نام کے مختلف اجزا کے اندراج کے بارے میں قاعدوں کے بعد مختلف قسم کے شخصی ناموں کے اندراج کے قاعدے پیش کیے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

خواتین کے نام: اس کے لئے عبدالصبوح قاسمی امریکی نسخہ لکھتے ہیں۔ جدید ترین نام کے تحت کسی خاتون مصنف کا نام درج کیا جائے۔ تاریخ ، امریکی قاعدے کے مطابق مصنف نام کے ساتھ قوسین میں اس کی تاریخ پیدائش اور وفات (مرحوم مصنف ہو تو) دی جاتی ہے عبدالصبوح قاسمی لکھتے ہیں ان زبانوں کے مصنفین کی تاریخ پیدائش ملنی مشکل ہے اس لئے قریبی زمانہ لکھ دینا کافی ہوگا۔

ادارے : اداروں کا نام لکھنے کے لئے مصنف کی سفارش ہے۔ اے ایل۔ اے کے قاعدے کو ہی اپنانا چاہیے۔ مثلاً اردو اکیڈمی کو رومن رسم الخط میں Urdu Akademy نہ کہ Urdu Academy لکھیں گے

بے نام کلاسک (ادب عالیہ) زیر بحث تینوں زبانیں جدید زبانیں ہیں اور ان میں بہت کم کلاسک موجود ہیں اس لئے یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

آٹھویں باب میں فہرست کے وضاحتی حصہ کے لکھنے کے طریقہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے لئے بھی مصنف اے ایل اے کے سفارش کردہ قاعدوں کو اپناتے ہیں۔ فارسی میں فہرست سازی کے لئے ناصر شریفی نے بھی ان ہی طریقوں کو اپنانے کی سفارش کی ہے کیونکہ بقول عبدالصبوح قاسمی مذکورہ تینوں زبانوں کا رسم الخط وہی ہے جو فارسی کا ہے اس لئے ان کے لئے بھی فارسی میں اپنایا گیا طریقہ اپنا لینا چاہیے۔ خود لائبریری آف کانگریس میں یہ سب زبانیں عربی زبان کے گروپ میں شامل کی جاتی ہیں اور یہی طریقہ موقعہ کے لحاظ سے موزوں ہے۔ اس طریقہ کے مطابق فہرست میں پہلے مصنف کا نام رومن رسم الخط میں لکھا جاتا ہے پھر بقیہ تفصیل یعنی کتاب کا نام ، مصنف کا نام وغیرہ اسی

زبان میں ، اسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے جوکہ کتاب کے سرورق پر چھپا ہوتا ہے ۔ تاریخیں مغربی اعداد میں لکھی جاتی ہیں کولیشن Collation انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے ۔ مصنف کا خیال ہے ۔ اس طریقہ کو اپنانے سے ایک زبان کو غیر ضروری طور پر دوسری زبان میں منتقل کرنے کی زحمت بچ جاتی ہے جانی پہچانی زبان کو اجنبی حروف میں لکھنے کی مشکل حل ہوجاتی ہے اور عربی رسم الخط میں لکھی گی تمام زبانوں کی کتابوں کی فہرست ساری میں یکسانیت پیدا ہوسکتی ہے

آگے عبدالصبوح قاسمی فہرست کے وضاحتی حصہ کے اجزا (عناصر) کا ذکر کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں ۔

۱ کتاب کا نام مع مصنف ، ایڈیٹر ، مترجم وغیرہ کے نام

۲ اشاعت (ایڈیشن) کی تفصیل

۳ ترقیمہ (Imprint)

۴ صفحات وغیرہ کی تفصیل کولیشن (Collation)

۵ کتابی سلسلے کی تفصیل(Series)

۶ نوٹس جو اشاعتی خصوصیات کو بیان کرتے ہیں (Notes) جن کا کتاب پڑھنے والے کے علم میں لایا جانا ضروری ہے ۔

مصنف کی سفارش ہے ۔ ان اجرا کی ترتیب اے. ایل. اے کے قواعد کے مطابق ہونی چاہیے ۔ ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ مندرجہ بالا تفصیل کے ہر جز کا کس طرح فہرست میں اندراج کیا جائے ۔

ہر جز کے اندراج کےلئے اصل کتابوں کے ناموں سے مثالیں دی گی ہیں ۔ جملہ آٹھ کتابوں کو لےکر (جن میں چھ اردو کی اور ایک ایک پشتو اور پنجابی کی ہیں) وضاحت کی گی ہیں ۔ اس وضاحتی بیان کے مختلف اجرا کا کس طـــرح اندراج کیا جائے ۔

نواں باب خـــلاصہ اور اختتامیہ پر مشتمل ہے ۔ اختتامیہ میں آیندہ تحقیق کےلئے حسب ذیل چار سفارشیں کی گی ہیں ۔

۱ مصنف یہ امید کرتے ہیں ۔ آیندہ مذکورہ تینوں زبانوں کے علاوہ اس رسم الخط میں لکھی جانے والی دو اور زبانوں یعنی بلوچی اور سندھی کا مشترکہ نقل تلفظ (Transliteration) کا ضابطہ اور فہرست سازی کا ضابطہ تیار کیا جائے گا ۔ ۲ بنگالی مسلمان ناموں کی غیر زبانوں میں لکھنے کےلئے نقل تلفظ اور فہرست سازی کا

ضابطہ بن جائے گا۔ ۳ اب تک قومیتوں کی بنیاد پر مسلمان ناموں کے اندراج کے ضابطے بنائے گئے ہیں۔ بہتر ہوگا ایک لچک دار ضابطہ بنایا جائے جو ہر قوم کے مسلم ناموں پر منطبق ہوسکے۔

۴ کتابیاتی حوالات (Bibliographical Reference Sources) کی بھی مذکورہ زبانوں میں بے حد کمی ہے ، ایک مبسوط سوانحی لغت کی ترتیب تو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

مقالہ یا کتاب کا متن یہاں پر ختم ہوجاتا ہے اس کے بعد حسب ذیل چھ تتمے شامل کئے گئے ہیں۔

۱) سادہ ناموں کی فہرست جو دو جزوی ناموں کے اجزا بن سکتے ہیں۔

۲) عام ناموں (اسم عام) کی فہرست جو دو جزوی ناموں کا دوسرا جز بنتے ہیں۔

۳ اللہ کے نام اور ایسے نام جو ال سابقہ کے ساتھ دو جزوی ناموں کا دوسرا جز بنتے ہیں۔

۴ (الف) القابوں کی فہرست　(ب) خطابوں کی فہرست

۵ نسبتوں کی فہرست

۶ ابجدی اعداد کی فہرست

آخر میں مک گل یونیورسٹی کے میمو کی نقل ہے اور پھر لائبریری آف کانگریس کے پانچ کارڈوں کی بطور نمونہ نقل ہے۔

یہاں پر کتاب ختم ہوجاتی ہے۔

عبدالصبوح قاسمی قابل مبارکباد ہیں جنہوں نے وقت کی ایک بے حد اہم اور دیرینہ ضرورت کا احساس کیا اور اس موضوع کو اپنے ریسرچ کا موضوع بنایا، انگریزی زبان میں اردو فہرست سازی کا پہلا کوڈ تیار کیا اس کے لئے مغربی ممالک کے تیار کردہ ضابطوں کی جانچ پڑتال میں بڑی محنت سے کام کیا اور ایک ایسا نقش اول تیار کیا جو بقول ان ہی کے مزید تحقیق و ترتیب کا طالب ہے۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ کہ انہوں نے اس غیر ملکی زبانوں میں ضابطوں کو اور مثالوں کو ڈھونڈا جہاں کچھ بھی ہو ان زبانوں کا پورا ادب اور مواد سامنے نہیں آسکتا اور موضوع کے بہت سے گوشے جن سے وہ ان زبانوں کے علاقوں میں ربط پیدا کرسکتے ہیں وہاں ان کے سامنے نہیں آسکے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی کئی لائبریریوں کو سوال نامہ

روانہ کئے اور ان سے مشورہ کیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برصغیر کی جن لائبریریوں کا انہوں نے انتخاب کیا ان کی مثال « خم کے سر پہ خشت کلیسا » والی ہے ا جن کے لئے پیروی مغربی مایہ افتخار ہے. ان لائبریریوں سے نئے حقایق اور نئے تجربوں کی آواز نہیں آسکتی، سرکاری اداروں سے ماہر بھی سوچنے اور کام کرنے والے سوچنے اور کام کرنے رہتے ہیں جو عبدالصبوح قاسمی کو زیادہ بہتر رائے اور مشورہ دے سکتے تھے. جیسے جامعہ ملیہ دہلی ندوۃ العلما لکھنؤ حیدری کتب خانہ حیدرآباد جہاں اس موضوع کے تعلق سے کچھ نہ کچھ تجربہ کئے گئے مگر مصنف کا ان سے ربط قائم نہیں ہوسکا.

دوسری بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ امریکی لائبریریوں سے وصول ہونے والے سوال ہدکے جوابوں کو سامنے رکھ کر جب مصنف نے ان لائبریریوں کا معاینہ کیا تو صورت کچھ کی کچھ نکلی. وہ ملک جس کی لائبریریوں کے اعلیٰ معیار کو بے حد سراہا جاتا ہے وہاں مشرقی موضوعوں اور مشرقی زبانوں کے مصنفین کے ناموں کو جس طرح برتا جارہا ہے وہ سب کا سب تو بہت کچھ پڑھے لکھوں کی جہالت کا آئینہ دار ہے چنانچہ کئی لائبریریوں نے سوال ہد کے جواب میں تو لکھا کہ ان کے ہاں A L A ضابطہ رائج ہے جب سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ A.L.A نہیں کچھ اور ہی چیز ہے ایک امریکی لائبریری کا اسٹاف اس بات سے بھی ناواقف نکلا کہ ان کے ہاں لائبریری آف کانگریس کے کارڈ وصول ہورہے ہیں. اسی طرح لراس لٹریشن کے بھی متنوع طریقے اپنائے گئے تھے اور اکثر لائبریریوں میں مشرقی زبانوں کی فہرست سازی کے لئے A.L.A ضابطہ کو غیر تشفی بخش بتایا گیا

عبدالصبوح قاسمی نے اپنی تحقیق کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی ہے کہ اس موضوع پر کیا گیا کام ان زبانوں کی فہرست سازکی پوری طرح مدد نہیں کرتا. مصنفوں کے ناموں کے بارے میں جو کام ہوا ہے وہ ناکافی ہے دوسرا مسئلہ عنوان کی شناخت اور وضاحتی حصہ پر تو کسی نے بھی کام نہیں کیا ہے

عبدالصبوح قاسمی نے اسی بنیاد پر ان مسائل کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ایک قابل ڈائرکٹر کے زیر نگرانی کام کیا. اس میں ان کو کتنی کامیابی حاصل ہوئی. اس کا اندازہ ان کے مقالہ سے لگایا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی تحقیق ایک نقش اول ہے ان کا پیش کردہ مواد ناصر شریفی کے پیش کردہ مواد سے کہیں کم ہے اور انہوں نے جو حل پیش کئے ہیں وہ بھی پوری طرح زبانوں کے فہرست ساز کی مدد نہیں کرتے.

ٹرانس لٹریشن (نقل تلفظ) کےلئے انہوں نے دو باب مختص کئے ہیں۔ یہ مسئلہ دراصل مغربی ملکوں میں مذکورہ زبانوں کے لائبریریوں کا مسئلہ ہے اردو، پشتو اور پنجابی کی اس لائبریری کا مسئلہ نہیں ہے جو اپنی بھی زبان میں، اپنے ہی رسم الخط میں اپنے ملک والوں کےلئے فہرست سازی کررہا ہے۔ اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ کتاب مغربی لائبریریوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

پانچوں بابوں میں ناموں کی تحلیل کی گئی ہے۔ اسی کو پڑھ کر ایسا جان پڑتا ہے کہ عبدالصبوح صاحب پچیس سو ناموں کے انبار میں کھوگئے ہیں۔ اس موضوع پر بھی ناصر شریفی نے زیادہ وضاحت اور تفصیل سے لکھا ہے۔

ان زبانوں کے مسلم ناموں کی ساخت کے بارے میں مصنف جو کچھ لکھتے ہیں اسے مفصل نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے خیال میں اسم یا نام صرف حسب ذیل چھ طریقوں سے بنایا جاتا ہے۔

۱ (الف) یک حروی نام جو ایک ہی لفظ پر مشتمل ہوتا ہے جیسے احمد،
(ب) دو جزوی نام، جس میں دو لفظ مل کر ایک نام بناتے ہیں ہر لفظ ایک ذاتی نام ہوتا ہے جو مل کر ایک نام بناتے ہیں جیسے محمد علی، محمد شفیع، عباس حسینی

۲ دو اسم عام مل کر ایک ذاتی نام بناتے ہیں جیسے امر شاہ، گل باچا ممتار مفتی

۳ دو جزوی نام جس میں سے پہلا حصہ اسم عام اور دوسرا ذاتی نام پر مشتمل ہوتا ہے۔ درمیان میں اضافت موجود تو ہوتی ہے گو اس کو پڑھا نہیں جاتا جیسے غلام حسین، نور محمد

۴ ایسا مرکب نام جس میں دوسرے جزو سے پہلے عربی حرف ال آتا ہے عبدالرحمٰن، ضیاء الدین

۵ دو عام نام جن کے درمیان اضافت ہوتی ہے۔ مگر اس اضافت کو نہ تو لکھا جاتا ہے نہ پڑھا جاتا ہے جیسے خان زماں، نور جہاں، اس تقسیم کو کہاں تک مکمل کہا جاسکتا ہے ؟

خطاب کے بارے میں بھی عبدالصبوح قاسمی زیادہ واضح نہیں ہیں وہ خطاب کی تعریف یوں کرتے ہیں:

An honorific compound which in Arabic names are usually constructed by adding the common noun (Din) introduced by (al) ال to a word preceeding it The خطاب was originally an honorific title conferred on scholars, generally by Muslim rulers.

اس تعریف کا پہلا حصہ تو صرف خطاب کی ساخت کو ظاہر کرتا ہے دوسرا حصہ جزوی ہے. کیونکہ مسلم حکمران علما کے علاوہ دوسرے ماہرین اور امرا کو بھی خطابوں سے نوازا کرتے تھے. دوسرے ملکوں میں بھی یہ طریقہ رائج تھا. انگریزوں نے بھی اپنے دور حکومت میں ہندوستانی شاہیرکو نہ صرف انگریزی بلکہ عربی فارسی خطاب بھی دئے جیسے شمس العلما، خاں بہادر

عبدالصبوح قاسمی نے ستارہ قائد اعظم کو خطابوں میں شامل کیا ہے لیکن ہندوستان کی حد تک اس قسم کے خطابوں کو جیسے پدم شری، پدم بھوشن وغیرہ کو صرف اعزاز قرار دیا گیا ہے اور انکو بطور خطاب نام کے ساتھ شامل کرنے کی سرکاری ممانعت ہے

لقب کی تعریف عبدالصبوح قاسمی ٹھیک کرتے ہیں یعنی

A conventional title usually assumed by the individual or given to him by others as a sobriquet or nickname.

اس تعریف کے مطابق لقب عرف کے ہم معنی ہے اور ہر فرد کا علحیدہ لقب یا عرف ہوتا ہے خود کا اختیار کیا ہوا یا دوسروں کا دیا ہوا جو صرف اس فرد کیلئے مختص ہوتا ہے جو اس کو دوسرے افراد سے ممتاز کرتا ہے لیکن عبدالصبوح

قاسمی اس کی مثالیں دیتے ہیں حاجی، مفتی، سید، مولانا، آغا، شاہ وغیرہ. میرا خیال ہے، چودھری، خاں اور شاہ، عنوان یا خطاب ہیں نہ کہ لقب ہر مسلمان جانتا ہے کہ حاجی کوئی لقب نہیں بلکہ مقدس فریضہ حج کی ادائیگی کی سمت ظاہر کرتا ہے مفتی ایک عہدہ ہے. اور مولانا یا آغا بھی خطاب یا عنوان ہیں.

حقیقت یہ ہے کہ مرور زمانہ سے بہت سے خطاب (عنوان) اور تعظیمی القاب اب نسبتی ناموں کی شکل اختیار کرگئے ہیں عبدالصبوح قاسمی نسبتوں کا ذکر تو کرتے ہیں مگر اس قسم کے القابی اور خطابی نسبتوں کے بارے میں غلطی کرگئے ہیں کبھی کبھی لقب کی بناوٹ کنیت کی ہوتی ہے جیسے ابوہریرہ، ابوتراب وغیرہ. عبدالصبوح قاسمی کے ہاں ان کا بھی ذکر نہیں ملتا اسی طرح کنیت کبھی کبھی Metonymical Expression (استعارہ) کی شکل میں بھی استعمال کی جاتی ہے جیسے ابن السبیل مسافر کے معنوں میں بنت شہابی خرمہا

(کھجور) کی ایک قسم ابوالحسین لومڑی کے معنوں میں عربی میں مستعمل ہیں۔ ان کو کنیت سے گڈ مڈ نہ ہونے دینا چاہیے یہ وضاحت بھی زیر نظر مقالہ میں نہیں ملتی۔

اس باب کے آخر میں عبدالصبوح اردو کے مشہور شاعر غالب کے نام کو بطور مثال لے کر اس کے اجزا کی نشان دہی کرتے ہیں۔

دبیر الدولہ	خطاب
مرزا	لقب
اسد اللہ	نام
خاں	خطاب
غالب	تخلص
دہلوی	نسبت

حالی، غالب کے شاگرد رشید تھے اپنی کتاب یادگار غالب میں جو غالب کی مانی ہوئی سوانح حیات ہے، ان کے نام کے اجزا کی تفصیل یوں دیتے ہیں

نام	مرزا اسد اللہ خاں
عرف	مرزا نوشہ
خطاب	نجم الدولہ دبیرالملک

زیادہ وضاحت سے کہہ سکتے ہیں کہ مرزا نسبتی نام ہے۔ خطاب (عنوان) تھا جو ہندوستان پہنچ کر نام کا جز بن گیا اور نسل کی نشان دہی کرتا ہے۔ ویسے خطابی خاں بھی مغلوں اور ہندوستانی ریاستوں میں رائج تھا۔
مرزا (نوشہ) لقب یا عرف تھا نوشہ لفظ غالباً سہواً چھوٹ گیا۔ عبدالصبوح صاحب ایک بڑی یونیورسٹی کے لائبریرین اس سے ناواقف ہوں ایسا نہیں ہوسکتا

چھٹے باب میں فہرست سازی کے موجودہ طریقوں کی جو تفصیل بتائی گئی ہے اس کو پڑھ کر اس بات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف ممالک متحدہ امریکہ کی اچھی لائبریریوں میں بلکہ لائبریری آف کانگریس میں بھی اردو مصنفوں کے ناموں کی کیا درگت بنتی ہے۔

ساتواں باب طریقہ کار کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ یہی باب سب سے زیادہ اہم کہا جاسکتا ہے مگر صرف ساڑھے گیارہ صفحوں پر مشتمل ہے ۱۰۲ صفحوں کی کتاب جس کا مقصد ہی ایک ضابطہ کی تیاری ہے اور جس کا نام ہے
A Code for Cataloging Materials (Published in Urdu Pushto and Punjabi)

اس میں اگر صرف ساڑھے گیارہ صفحے اصل بحث کےلئے دئے جائیں تو اس کی افادیت کے بارے میں بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مغربی ماہرین کا سلجھاوا کہ نام کے سب سے اہم یا معروف جز میں اندراج ہو کوئی منطقی بنیاد نہیں رکھتا۔ اکثر مشہور مصنفین ابتدا میں کسی ایک نہج سے اپنا نام لکھتے ہیں جو آگے چل کر کوئی اور صورت اختیار کرلیتی ہے تو بھلا کسی نئے لکھنے والے کا معروف یا اہم نام کس طرح متعین کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح قدیم مسلم ناموں میں اہم جز یا عنصر کی تلاش بھی کوئی آسان کام نہیں۔ اکثروں کے ساتھ کئی نسبتیں لگی رہتی ہیں جن میں اہم کو تلاش کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ نام کی بناوٹ، اس کے مقام یا طرز سے اس کو پہچانا نہیں جاسکتا اسی طرح ایک مصنف کا اندراج اس کے نام کے کئی عناصر (اجزا) میں ممکن ہوجاتا ہے اور ان سب کو ایک لڑی میں گوتھنے کے لئے بے گنتی حوالوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔

جدید ترین ناموں کے بارے میں خود عبدالصبوح صاحب ہی اعتراف کرتے ہیں کہ ان علاقوں میں سرنام (Surname) لکھنے کی روایت (مغربی طرز) پر ابھی نہیں اپنائی گئی ہے نسبتی ناموں کو بطور سرنام اختیار کرنے میں بھی کئی دشواریاں ہیں۔ کئی نسبتی نام جو اختیار کر لئے گئے ہیں یا جنہیں سرنام کی حیثیت دی جاتی ہو ہے جیسے تعلیمی نسبت، مقامی نسبت، روحانی سلسلہ کی نسبت وغیرہ فرد کو ممیز کرنے میں پوری طرح مددگار نہیں ہوسکتیں۔

خواتین کے ناموں کے بارے میں عبدالصبوح صاحب امریکی قاعدے کو جوں کا توں دہراتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان عورتیں خاص کر زیر بحث علاقوں کی مسلمان مصنف خواتین اکثر ذاتی ناموں سے ہی مشہور معروف ہیں شادی سے پہلے اور بعد یا جدید اور قدیم نام کی بحث اول تو الزامی ہی نہیں اگر ایسے بھی تو بجائے اندراج کرنے کے ریفرنس دینے سے یکسانیت باقی رہے گی۔

اداروں کے نام کو اپنانے کے بارے میں بھی عبدالصبوح صاحب اے ایل اے کے طریقے کو اپنانے کی بات کرتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اے ایل اے کی جدید شکل اینگلو امریکن اسٹانڈرڈ کوڈ کے جدید اڈیشن میں اداروں کے نام کے اندراج کے طریقہ کو بالکل بدل دیا گیا ہے اگر اس نوبت پر اے ایل اے کی تقلید کی جائے تو اس پر عقل نہ باشد کی مثال صادق آئے گی بجائے اپنے مستقل قاعدے بنانے کے کسی قاعدے کی پیروی کی ہدایت کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اداروں کا نام لکھنے کا

طرز مذکورہ زبانوں میں اور انگریزی میں بالکل مختلف ہے ۔ اس کا بھی فیصلہ ہونا چاہیے کہ ان اداروں کے انگریزی نام کو اپنایا جائے یا انگریزی نام کے ٹرانس لٹریشن (نقل تلفظ) کو استعمال کیا جائے ۔ جبکہ دونوں نام بھی سرکاری طور سے استعمال کئے جاتے ہیں محکمہ زراعت ۔ یا ڈپارٹمنٹ آف اگری کلچر میں کس کو ترجیح دی جائے صرف ایک قاعدہ بنانے سے مسائل حل نہیں ہوجاتے ۔ مشرقی ملکوں کے بےشمار ادارے ایسے ہیں جن کا ذکر اے. ایل. اے میں نہیں ملتا ۔ ان کو عبدالصبوح قاسمی نے بالکل ہی نظرانداز کردیا ہے ۔

یہ تو صحیح ہے کہ اردو ، پشتو اور پنجابی تینوں جدید زبانیں ہیں ان کے خود کے کوئی کلاسیک (ادب عالیہ) نہیں ہیں مگر دو بےحد قدیم زبانوں عربی ، فارسی کے علاوہ سنسکرت کے کئی شاہکاروں کا ترجمہ ان زبانوں میں کیا گیا ہے ۔ ایسے کلاسیک کے بارے میں بھی اے ایل اے خاموش ہے اور عبدالصبوح قاسمی بھی خاموش ہیں

احادیث اور اولیاء اللہ کے ملفوظات ، نیز جغرافیائی ناموں تخلص اور قلمی نام ، اخبار ، رسالے ، قاموس ، لغت وغیرہ کی بارے میں کوئی قاعدے نہیں بنائے گئے ہیں نہ صرف اندراج کے طریقے کو نظرانداز کیا گیا ہے بلکہ ان کے مخففات کا تعین بھی نہیں کیا گیا ہے اوپر کے بعض مسائل کے بارے میں اے ایل. اے میں ضرور قاعدے بنائے گئے ہیں مگر یہ بذات خود ادھورے ہیں نیز یہ سلجھاوے زیر بحث تینوں زبانوں کے مزاج سے بالکل مختلف ہیں

اٹھویں باب میں فہرست کے وضاحتی حصے کے بارے میں بتایا گیا ہے یہ بھی محض اے ایل اے کے قاعدوں کا چربہ ہے

یہ ہدایت کہ مصنف کا نام رومن رسم الخط میں اور بقیہ اندراج کتاب کی زبان میں ہو غیر ملکی لائبریریوں میں کارآمد ہوسکتا ہے مگر خود ان زبانوں کے علاقے میں اسی کی افادیت سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے اس کے بعد مختلف عناصر کے اندراج کی مثالیں دی گئی ہیں قابل اعتراض بات جو نظر آرہی ہے وہ یہ ہے کہ ضابطہ میں دئے گئے قواعد اور مثالوں میں تضاد ہے اشرف علی تھانوی کے نام کا اندراج ، تھانوی اشرف علی میں کیا گیا ہے تو احتشام علی کاندھلوی ، احتشام الحسن میں مندرج ہیں حالانکہ تھانوی اور کاندھلوی دونوں مقامی نسبتیں ہیں محمد شریف قریشی کا اندراج محمد شریف قریشی میں ہی کیا گیا ہے مگر محمد

موسیٰ خاں کلیم کا اندراج کلیم موسیٰ خاں میں ہے اور لفظ محمد حذف کردیا گیا ہے۔

کیا اسی طرح صرف دو نامکمل مثالیں تین زبانوں کے مسائل کو حل کرسکتی ہیں۔ «سر» کو باقی رکھا گیا ہے خان بہادر کو حذف کرنے کی ہدایت دی گئی ہے حالانکہ دونوں انگریز بہادر کے عطا کردہ خطاب ہیں اور دیکھئے اقبال کے نام سے شیخ حذف کردیا گیا مگر حالی کی سیادت باقی رکھی گئی ہے اس کی کیا توجیہ ہے؟ معروف نام کی تشخیص کیسے ہو۔ جب ایک ہی مصنف کی مختلف کتابوں کے مختلف اڈیشنوں کے سر ورق پر مصنف کے نام کا اندراج الگ الگ ڈھنگ سے کیا جائے تو فہرست ساز کیسے معروف سمجھے کیسے گمنام اس بارے میں بھی عبدالصبوح خاموش ہیں۔ پھر نام کے دوسرے اجزا (عناصر) سے نسبت، لقب، خطاب وغیرہ میں بھی ٹھیک سے تفریق نہیں کرسکے ہیں نسبتوں کی درجہ بندی بھی ناقص ہی معلوم ہوتی ہے آخر میں لائبریری آف کانگریس کے مطبوعہ کارڈوں کے چند نمونے دئیے گئے ہیں ان کو دیکھ کر الجھاوے اور بڑھ جاتے ہیں کیا انہیں نمونہ بناکر ان کی پیروی مناسب ہے؟ مسلم ناموں کے ساتھ ان زبانوں کے غیر مسلم مصنفین کی ساخت اور نمونوں کو بھی شامل کرلیا جاتا تو فہرست ساز کے لئے سہولت کا باعث ہوجاتا

چند لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ عبدالصبوح قاسمی کے ضابطہ کو پڑھ کر وہی تاثر پیدا ہوتا ہے جو اے۔ ایل۔ اے کو دیکھ کر ہوتا ہے یعنی جادو کا پٹارہ۔

کتابیات

1 Abdus Subbuh Qasimi : A Code for Cataloguing Materials in Urdu, Pushto & Punjabi
2 Nasar Sharifi : Cataloguing of Persian Works
فہرست کردن آثار فارسی - امریکن لائبریری اسوسیشن ۱۹۵۹ ع
3 Mahmood al- Shenıtı and Muhammad al-Mehdı . Qawaid -al Fahrasah al-Wasfiyah al- Maktobat ul- Arabıah.
4 Rangnathan S. R : Classified Catalogue Code (4th ed)

مخففات

PL = پبلک لا

ALA = American Library Association Cataloging Code Rules for Author & Title Entries (1949)

جناب کاظم علی خاں
لکھنؤ یونیورسٹی ۔ لکھنؤ

مشیر لکھنوی ۔ ایک تعارف

اردو ادب کی تاریخ جن بےشمار شاعروں کو فراموش کرچکی ہے ان میں مشیر بھی شامل ہیں۔ مشیر لکھنوی ہماری ادبی تاریخ کا ایک گمشدہ ورق یا ایسا باب ہیں جو لکھا ہی نہ گیا ہو ادبی تاریخوں اور تذکروں کی ایک بڑی تعداد ان کے ذکر سے خالی ہے۔ ادبی حلقے عام طور پر مشیر کے نام و کلام سے بےخبر نظر آتے ہیں۔ مشیر لکھنوی پر یہ تعارفی مضمون ان ہی حالات کا نتیجہ ہے۔ اسے «حرف آخر» کے بجائے مشیر پر میرے تحقیقی کام کا «نقش اول» سمجھنا چاہیے۔

۱) نام، ولدیت اور خاندان

صاحب تذکرۂ سراپا سخن مشیر لکھنوی کا نام گوہر علی بتاتے ہیں ۱ اور بعد کے متعدد صاحبانِ قلم اس معاصر شہادت کی تائید کرتے ہیں جن میں سید افضل حسین ثابت لکھنوی۲، امیر احمد علوی۳، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۴ ڈاکٹر گیان چند جین ۵ وغیرہ شامل ہیں ان کا پورا نام مع تخلص شیخ گوہر علی مشیر تھا رسالہ گلدستۂ شعراء لکھنؤ۶ ۱۸۶۰ع اور تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا۷ (زمانۂ تالیف ۶۲-۱۲۶۱ ہجری۸ ازروے تقسویم مطابق ۴۶-۱۸۴۵ع) [جو مشیر کے معاصر مآخذ ہیں] میں ان کا نام شیخ گوہر علی، مشیر ہی درج ملتا ہے۔

شیخ گوہر علی شیخو پور (تحصیل فتح پور) کے زمین دار شیخ محمد علی کے فرزند تھے۔۹ مشیر اور ان کے والد کے نام میں لفظ «شیخ» اس پر مشعر ہے کہ مشیر ایک شیخ خانوادے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان اور بزرگوں کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

۲) سنہ ولادت ، مولد اور مسکن (وطن ثانی)

شیخ گوہر علی کا سنہ ولادت ۱۸۰۰ع بتایا جاتا ہے جو تقویم۱۰ کی رو سے ۱۵-۱۲۱۴ ہجری کے مطابق ہے ۔ یہ زمانہ والی اودھ، نواب سعادت علی خاں کے عہد حکومت۱۱ [جنوری ۱۷۹۸ع - شعبان ۱۲۱۲ھ تا جولائی ۱۸۱۴ ع - رجب ۱۲۲۹ھ] سے تعلق رکھتا ہے ۔ شیخ گوہر علی کا مولد ریاست بلہرا [یوپی] بتایا جاتا ہے۔ ناسازگار حالات نے گوہر علی کو کم سنی ہی میں گھر چھوڑنے پر مجبور کیا وہ نو سال کے سن میں لکھنؤ آگئے اور پھر لکھنؤ ہی کے ہورہے ۔ لکھنؤ حالاں کہ ان کا اصل وطن نہ تھا لیکن شیخ گوہر علی « میاں مشیر لکھنوی » کی حیثیت سے ہی مشہور ہوئے ۔ اس طرح لکھنؤ ان کا نہ صرف مسکن بلکہ وطن ثانی بھی بن گیا ۔ ان کی زندگی کا بیش تر حصہ لکھنؤ میں بسر ہوا ۔

۳) تعلیم ، آغاز شاعری اور شاگردی

لکھنؤ میں احسن الدولہ حسین۱۲ نے ان کی تعلیم کا بندوبست کیا ۔ گوہر علی نے گیارہ بارہ سال کے سن [سنہ ولادت کی بنیاد پر یہ زمانہ ۱۲-۱۸۱۱ ع متعین ہوتا ہے] سے شاعری شروع کی ۔ شاعری میں تخلص مشیر اختیار کیا ۱۸۱۷ ع میں میر ضمیر ۱۳ سے ملے ضمیر ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنے ساتھ رکھ کر عروض وغیرہ کی تکمیل کرائی ۔ میر ضمیر کی ہدایت پر گوہر علی مشیر مرزا دبیر تلامذہ میں شامل ہوئے ۔۱۵ آخر عمر میں مشیر واجد علی شاہ اختر کے بھی شاگرد ہوئے تھے ۔ ۱۶

۴) شادی اور اولاد

مشیر کی شادی محلہ بھدیواں ، لکھنؤ کے ایک مغل خانوادے میں ایک مرزا صاحب کی لڑکی سے ہوئی۔ اس شادی سے ان کے تین بیٹے ہوئے جن کے نام (۱) فرزند علی اسیر (۲) احمد علی اور (۳) اکبر علی بتائے جاتے ہیں ۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق کاظم حسین مطیر لکھنوی بھی مشیر کے فرزند تھے ۔ ۱۷ میرے ذخیرے میں ایک مرثیے کے قلمی نسخے پر مطیر لکھنوی درج ملتا ہے ۔ مرثیے اور مطیر کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے ۔ مشیر کے بیٹے فرزند علی اسیر (جن کا عقد حسن علی خاں چکلہ دار کی لڑکی سے ہوا تھا) سے مشیر کی نسل آگے بڑھی ۔ میاں مشیر کے پوتے حامد حسین سفیر ساکن لکھنؤ نے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے مقالے کے لیے مشیر کے حالات فراہم کیے تھے ۔ ۱۸

۵) دربار اودھ سے تعلق

مشیر اودھ کے دوسرے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد ۱۹ [اکتوبر ۱۸۲۷ء ۔ ربیع الاول ۱۲۴۳ ھ تا جولائی ۱۸۳۷ء ۔ ربیع الاخر ۱۲۵۳ ھ] میں دربار اودھ کے متوسلین میں شامل ہوئے ۔ اودھ کے تیسرے حکم ران محمد علی شاہ ۲۰ [عہد حکومت ۔ جولائی ۱۸۳۷ ع ۔ ربیع الاخر ۱۲۵۳ ھ تا مئی ۱۸۴۲ ع ربیع الاخر ۱۲۵۸ ھ] کے مصاحبین میں مشیر بھی شامل تھے ۔ مشیر تاج دار اودھ واجد علی شاہ اختر لکھنوی کی بھی شاگردی اور ملازمت میں رہے تھے مگر یہ ملازمت انہیں ۱۲۹۰ ھ (مطابق ۷۴-۱۸۷۳ ع) میں ملی تھی جیسا کہ واجد علی شاہ اختر لکھنوی کی کتاب بنی کے مندرجہ ذیل اندراج سے ظاہر ہے : « مشیر ۔ یہ راقم کا بھی شاگرد ہوا اور سنہ بارہ سو نوے میں ملازم ہوا . . . » ۲۱

۶) مشیر لکھنوی بہ حیثیت نامہ نویس بیگمات اودھ

مشیر کے صحیفۂ حیات میں بیگمات اودھ کی نامہ نویسی کا باب خاصی اہمیت کا حامل ہے جس کے بارے میں آگے مفصل گفتگو کی گئی ہے دستان دبیر میں مشیر کی زندگی کے اس اہم پہلو کو نظرانداز کردیا گیا ہے . اس سلسلے میں یہاں اجمالاً عرض ہے کہ مشیر لکھنوی واجد علی شاہ کی ایک بیگم زیب عالم ہادی بیگم کے نامہ نویس رہ چکے ہیں ۲۲ واجد علی شاہ کے ایک مکتوب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشیر ۵ ذی قعدہ ۱۲۷۵ ھ [از رُوئے تقویم مطابق سہ شنبہ ۷ جون ۱۸۵۹ع] ۲۳ سے قبل زیب عالم ہادی بیگم کے یہاں بہ حیثیت نامہ نویس ملازم ہوچکے تھے . ۲۴ کلام مشیر کی ایک داخلی شہادت اس امر پر مشعر ہے کہ نامہ نویسی کی ملازمت کے سلسلے میں مشیر کا مشاہرہ تیس روپے ماہوار مقرر ہوا تھا ۲۵ آج یہ رقم کم ہے مگر عصر مشیر میں یہ آمدنی بھی اہم تھی

۷) ادبی معرکہ آرائیاں اور کامیاب مرثیہ خوانی

انیسیوں اور دبیریوں کی نوک جھوک کے بارے میں امیراحمد علوی کا بیان ہے :
« مرزا دبیر کے مشہور شاگرد میاں مشیر نے اپنے مخصوص انداز میں سچ کہا تھا :

جگھڑا بکر کا ہے نہ جناب امیر کا ۔ اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا » ۲۶ لکھنؤ میں انیسیوں اور دبیریوں کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائی میں میاں مشیر لکھنوی اپنے استاد مرزا دبیر کے سرگرم حمایتی کی حیثیت رکھتے تھے . ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے "ان معرکوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ مشیر « . . . دبیریوں کے لشکر

کے مسلمہ سر گروہ تھے ۔ ۲۷ انیسیوں اور دبیریوں کے مابین برپا ہونے والے ادبی معرکوں میں مشیر کی سرگرمی کا ذکر افضل حسین ثابت ۲۸ ، شاد عظیم آبادی ، ۲۹ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ۳۰ اور امیر حسن نورانی ۳۱ کی تحریروں میں بھی موجود ہے ۔ میر انیس کے ایک سلام کے سلسلے میں انیسیوں اور دبیریوں میں جو منظومات کی جنگ چھڑی تھی اس میں انیس کے بھائی مونس اور دبیر کے شاگرد میاں مشیر نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا اس ادبی جنگ کے تفصیلات انیسیات ، حیات دبیر (جلد اول) اور اردو کے ادبی معرکے میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں یہاں انہیں درج کرنا تحصیل حاصل و تطویل لا طائل کے ہم معنی ہوگا ۔ یہ « بیت بحثی » کیونکر موقوف ہوئی اس کا ذکر ثابت لکھنوی سے سنیے : « . المختصر ادھر میر صاحب میر مونس مرحوم پر اور ادھر مرزا صاحب مشیر مغفور پر بہت خفا ہوئے اور میر مونس مرزا صاحب کی خدمت میں اور شیخ مشیر میر صاحب کی حضوری میں آکر عذر خواہ ہوئے اور گرد کدورت دلوں سے دھو گئی . . . . اور آئینۂ قلب پر جلا ہو گئی . » ۳۲

ان ادبی معرکوں کے علاوہ مشیر نے اپنے عہد میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں بھی شہرت حاصل کی تھی ۔ شاہی امام باڑے کے علاوہ مشیر نے ممتازالدولہ ، محسن الدولہ ، اسد الدولہ وغیرہ کے امام باڑوں میں بھی دھوم دھام کی مجلسیں پڑھی ہیں شاہی امام باڑے میں مشیر مرثیہ خوان تھے مشیر کے مرثیے سوز خوانوں میں کافی مقبول تھے ۔ دبستان دبیر میں ان تمام امور کا ذکر موجود ہے ۔

۸) سفر کلکتہ

مشیر لکھنوی کی کتاب حیات کا آخری باب کلکتے سے تعلق رکھتا ہے ۔ زندگی کے آخری چند سال مشیر نے واجد علی شاہ کے پاس مٹیا برج کلکتہ میں رہ کر بسر کیے ۔ گمان غالب ہے کہ مشیر ۱۲۹۰ ھ [ازروئے تقویم مطابق شنبہ یکم مارچ ۱۸۷۳ ع تا سہ شنبہ ۱۷ فروری ۱۸۷۴ ع] میں کلکتے گئے ہونگے جیسا کہ واجد علی شاہ کا بیان ہے کہ مشیر ۱۲۹۰ ھ میں ان کے ملازم ہوئے ۔ [یہ بیان سطور گذشتہ میں مع حوالہ پیش ہوا ہے ۔]

۹) وفات و مدفن

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اپنے مقالے میں مشیر کا سنہ وفات ۱۸۷۶ ع بتایا ہے جو از روئے تقویم شنبہ ۴ ذی الحجہ ۱۲۹۲ ھ تا یک شنبہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۹۴ ھ کے مطابق ہے ۔ ۳۳ مشیر لکھنوی کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور

حسینیہ سبطین آباد واقع مٹیا برج کلکتہ میں ہی دفن ہوئے۔ اس طرح مشیر کا سفر حیات، جس کا آغاز ریاست بلہرہ میں ۱۸۰۰ ع میں ان کی ولادت سے ہوا تھا، ۱۸۷۶ ع میں بیٹا برج کلکتہ میں ان کی وفات پر تمام ہوا۔

۱۰) مشیر کے تلامذہ

دستان دبیر (ص۳۱۲- ۲۱۱) میں مشیر لکھنوی کے مندرجہ ذیل چار شاگردوں کے نام ملتے ہیں: (۱) اسدالدولہ ذکی (۲) میر واجد علی تسخیر ۳۴ (۳) ذکی بلگرامی (۴) مرزا محمد خورشید قدر قیصر۔ ۳۵ ان میں سے شاگرد مشیر مرزا محمد خورشید قدر بہادر قیصر، صاحب تذکرہ سراپا سخن محسن علی محسن کے ان مربیوں میں شامل ہیں جن کی خدمت میں محسن نے اپنا تذکرہ پیش کیا تھا جیسا کہ سراپا سخن کے دیباچے میں خود محسن کے بیان سے ظاہر ہے۔ ۳۶ ان چار شاگردوں کے علاوہ تلاش کرنے پر راقم السطور کو مشیر لکھنوی کے تین اور شاگرد ملے ہیں جن کے نام و تخلص سطور ذیل میں درج ہیں:

(الف) میرن صاحب یقین- شاگرد میاں مشیر ۳۷

(ب) مولوی احمد علی قدیر- شاگرد مشیر ۳۸

(ج) میر اصغر علی ذکیر- شاگرد مشیر ۳۹

رسالۂ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ (۱۸۶۱ - ۱۸۶۰ ع) کے بعض شماروں [جو مشیر متوفی ۱۸۷۶ ع کے لیے معاصر مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں] میں تلامذۂ مشیر، یقین، قدیر اور ذکیر کا ذکر مع نمونۂ کلام موجود ہے۔ اس قدیم مجلے کی ایک فائل میرے پیش نظر رہی ہے۔

۱۱) مشیر کے ادبی آثار

مشیر کے ادبی آثار میں جن اصناف کا پتا چلتا ہے ان میں پرسیہ، مرثیہ، قصیدہ، قطعہ، منظوم و منثور مکاتیب اور مثنوی شامل ہیں۔ اب ان اصناف میں مشیر کے ادبی آثار پر اختصار سے گفتگو کی جاتی ہے۔

۱) پرسیہ گوئی: مولانا شرر لکھنوی کے مطابق پرسیہ گوئی پرانی ہجوگوئی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ۴۰ میر احمد علوی پرسیہ کو "دشمنان اہل بیت کی ظرافت آمیز ہجو" قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ پرسیہ ایک بےمعنی لفظ ہے جو غالباً "مرثیہ کے وزن پر بنایا گیا ہے۔ مرثیے کا مضمون پر عظمت تھا اگر ظرافت شامل کی جاتی تو مجلس ماتم بزم طرب بن جاتی ۔ ہنسنے ہنسانے کے لیے لکھنؤ .. کے زندہ دلوں نے یہ صورت نکالی کہ ... عزاداری سے فراغت کرکے .... جشن عید منعقد کرتے تھے اور اس دن قاتلان حسین کے انجام پر خوشی مناتے تھے۔" ۴۱ پرسیہ گوئی کو

ضمیر کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ ۴۲ مگر ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اس سے انکار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "ہرسیے کے لیے یہ مشہور کردیا گیا ہے کہ میر ضمیر اس کے موجد تھے لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ ۔ ۔ ضمیر نے اپنی ۔ ۔ ۔ ہرسیہ گوئی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ان کے کسی ہر سیے کا بھی پتا نہیں چلتا۔ ۔ ۔" ۴۳ ہرسیے کے موجد ضمیر تھے یا کوئی اور اس کے بارے میں فیصلہ کن بات کہنا دشوار ہے لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین کا ضمیر کی ہر سیہ گوئی سے انکار کرنا بعض شواہد کی روشنی میں درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔ میر ضمیر کے ہم عصر نجات حسین خاں عظیم آبادی کے (سوانح لکھنؤ میں) ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چہار شنبہ ۱۱ ربیع الاول ۴۴ ۱۲۵۹ھ [تقویم چہار شنبہ کو ۱۲ اپریل ۱۸۴۳ء اور ۱۲ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ بتاتی ہے لیکن ابوالنصر محمد خالدی کی مرتب کردہ تقویم میں کبھی کبھی ایک روز کا فرق نکلنا عام بات ہے۔ کاظم علی خاں] کو نجات حسین خاں نے ضمیر کو حاجی سید حسن رضا کی مقرر کردہ محفل میں ہر سیہ پڑھتے سنا۔ ضمیر کے ہرسیے نے حاضرین کے مارے ہنسی کے ہوش اڑادیے۔ ۴۵ نجات حسین خاں کا یہ چشم دید بیان معاصر عینی شہادت کا درجہ رکھتا ہے جس کی تصدیق ضمیر کے ایک اور ہم عصر سعادت خاں ناصر کے اس بیان سے ہوتی ہے: "لکھنؤ میں ہر سال ۔ ۔ ۔ میر ضمیر ۔ ۔ ۔ حاجی حسن رضا کے یہاں جلسے میں نیا ہرسیہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک سال میر ضمیر صاحب علیل ہوئے۔ حاجی صاحب موصوف نے اس سال شیخ گوہر علی مشیر سے ہرسیہ پڑھوایا اور اسی دن سے وہ چمکے۔" ۴۶ ان معاصر شہادتوں کے علی الرغم ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا ضمیر کی ہرسیہ گوئی سے انکار فرمانا اپنے موضوع سے موصوف کی بےخبری کی مثال قرار دی جائے گی۔

شیخ گوہر علی مشیر لکھنوی کا اصل میدان ہرسیہ ہے۔ مولانا شرر لکھنوی کا بیان ہے کہ ہرسیے کے "۔ ۔ ۔ فن کے متعدد باکمال لکھنؤ میں مشہور ہوئے مگر ہرزیہ گوئی اور ہرزیہ خوانی [اس صنف کا نام ہرسیہ ہی مشہور ہے] کو مکانوں کی چار دیواری سے نکلنے کی جرأت نہیں ہوسکی، اگر ہرزیہ [ہرسیہ] گوئی کا عام سبجکٹ ایسا محدود اور مابہ النزاع نہ ہوتا تو زمانہ دیکھتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گوئیوں نے ۔ ۔ ۔ کیسے کیسے کمال دکھائے ہیں۔ اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میاں مشیر کو حاصل ہوئی۔ ہجو گوئی ۔ ۔ پہلے بھی تھی، مگر مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا، متانت الفاظ، طرز ادا اور استعمال تشبیہات میں جو مضحکہ خیزی پیدا کی، اس کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں۔ ابتذال میں بھی لطف پیدا کرکے شایستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل

پتا دینا ان کا خاص جوہر تھا جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ امیر احمد علوی معترف ہیں : "شیخ گوہر علی مشیر مرزا دبیر کے شاگرد اور شریعت پرسیہ گوئی کے پیغمبر تھے.... میاں مشیر نے ساری طاقت [پرسیے پر] صرف کردی اور اس فن میں ان کا مقابل بننے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ رعایت لفظی میں امانت کو مات کیا اور ایسے نادر محاورے استعمال کیے جن کی سند سواۓ ان کے کلام کے کہیں نہیں مل سکتی۔ انہوں نے مختلف قوموں اور اہل پیشہ کی اصطلاحیں کثرت سے نظم کیں اور اردو شاعری کو ظرافت و شوخی کے ان مول خزانے سے مالا مال کردیا ... ان کا ہر شعر ہنسنے والوں کے لیے زعفران زار کی کیاری ہے۔ افسوس ہے کہ پھول کے ساتھ کانٹوں کا اتنا انبار ہے کہ اس مقدمے کی تہذیب ان کے بار کی متحمل نہیں ہوسکتی اور دامن گلچیں کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے ورنہ ان کے بعض پرسیوں کا انتخاب اس مقام پر درج کرتا۔ نمونے کے طور پرحسب ذیل اشعار... نقل کیے جاتے ہیں ....." ۴۸ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں : "....ہزلیہ [پرسیہ] گوئی ... میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میاں مشیر نے حاصل کی اور اس میں طرز ادا، تشبیہات کے نادر استعمال سے عجیب عجیب باتیں پیدا کیں۔" ۴۹ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اپنے تحقیقی مقالے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں : "پرسیہ گو کی حیثیت سے مشیر فرد فرید تسلیم کیے جاتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی ٹکر کا کوئی پرسیہ گو آج تک پیدا نہیں ہوا۔" ۵۰ مشیر کے پرسیے فحاشی اور مذہبی مناظر کے باعث عام قارئین تک نہیں پہنچ سکے ہیں لیکن ان کے بعض حصوں میں زبان و بیان، محاورات و رعایات کے دل چسپ نمونے ملتے ہیں۔ ان میں عصر مشیر کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ انیسویں صدی عیسوی کے لکھنؤ کی سماجی اور معاشرتی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں دھوم دھام کے ساقی نامے ہیں ان پہلوؤں کے علاوہ مشیر کے پرسیوں نے اردو شاعری کو طنز و ظرافت کے بھی بہت کچھ اچھے برے نمونے دیے ہیں۔ مشیر کے پرسیے کے ساقی نامے کا اک مشہور بند بہ طور مثال پیش ہے :

تو اپنے ایک جام پہ نازاں ہے ساقیا چودہ پلانے والے ہیں پروا ہے مجھ کو کیا
بتلائے دیتا ہوں تجھے میخانوں کا پتا بطحی و کاظمین و خراسان و سامرا
خورشید مدعا مرا برج شرف میں ہے
اک کربلا میں اک مرا ساقی نجف میں ہے

مشیر کے پرسیے میں ظرافت اور رعایت لفظی کے ماتحت مندرجۂ ذیل بند

ملاحظہ ہوں جن میں بہ قول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی «پرسیے کی ہیروئن اپنے ایرانی آشنا کے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتی ہے اور اسے چور ثابت کرنا چاہتی ہے»:

قاضی جی دیکھو یہ جی ہوئے اس کے مشتری سنیے کی روبکار ہوئی پہلے رنڈی کی
وہ بولی صدقے جاؤں، مصیبت سنو مری مسی تلک نہ دی مجھے لوٹا دھڑی دھڑی

گہنا تمام لے گیا، ملبوس لے گیا
ہاتھوں کی چوہے دنتیاں تک موس لے گیا

چوڑی کا حال صاف بتانا مجھے پڑا ستی ہو شہ چھوڑ کے گلی میں کڑا بکا
گل کھانے کے لیے مرا چھلا ہر اک لیا آئینہ گھر سے لے گیا بہ صورت آشنا

بچیانے ککن ایسے مغایے شریر ہیں
جوشن لیے گواہ صغیر و کبیر ہیں

دم دھک دھکی میں ہے کہوں جگنو کا حال کیا گو غل مچایا کی، وہ مرا طوق لے اڑا
نتھ ناک سے اتارلی، منہ کیل کر مرا اور چھپکا دے کے سونے کا تعویذ بھی لیا

لے بھاگا ڈھولنا مرا، قرآن کی قسم
انگشتری چرائی، سلیماں کی قسم

کیا کیا میں تڑپی بجلیوں کے واسطے میاں بالا بتا کے لے گیا بچپن کی بالیاں
پٹے میرے اتارلیے، آگو خزاں بیچیں اننت رام کے ہاتھوں وہ انتیاں

سب چیز بست باندھ کے بستے میں لے گیا
موتی کے جھالے پاس برستے میں لے گیا ۵۲

ثابت لکھنوی کا بیان ہے کہ مرزا دبیر نے اپنے شاگرد میاں مشیر کی افتاد طبع دیکھ کر انھیں پرسیہ گوئی کا مشورہ دیا تھا۔ ۵۳

۲) مرثیہ نگاری

مشیر کو ان کے معاصر محسن علی محسن نے اپنے تذکرے میں «مرثیہ گو» لکھا ہے ۵۴۔ امیر احمد علوی رقم طراز ہیں: «مرزا دبیر کے مشہور مرثیہ گو شاگرد میاں مشیر۔۔۔» ۵۵ سفارش حسین رضوی کا بیان ہے: «وقت کے رواج کے مطابق مشیر نے مرثیہ گوئی اختیار کی، مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے اور دبیر یا گروہ کے سرغنہ، مگر۔۔۔۔ جلد ہی۔۔۔۔ پرسیہ گوئی پر اتر آئے» ۵۶ گوہر علی مشیر کے بعض مرثیوں کے مطلعے یہ ہیں: (۱) جب زیب کربلائے معلیٰ ہوئے حسین (۲) سوحسز

جو تیغ ستم سے قلم ہوا (۳) دربار میں ورود ہے اب اہل بیت کا (۴) دم بھرتے ہیں مسیح ولالے حسین کا (۵) شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامان مرتضیٰ

ان میں مرثیہ نمبر ۵ دبیر کے مجموعۂ مراثی دفتر ماتم ۵۷ میں شائع ہوا ہے لیکن ثابت لکھنوی اسے کلام مشیر قرار دیتے ہیں ۵۸ ۔

مشیر کے مرثیوں میں ساقی نامہ خاصا اہم پہلو ہے ۔ ثابت لکھنوی مشیر کو مراثی میں ساقی نامے کا موجد بتاتے ہیں ۵۹ ۔ مراثی مشیر کے بعض بند بہ طور نمونہ حاضر ہیں :

جب زیب کربلائے معلی ہوئے حسین   خاک شفاز میں تو مسیحا ہوئے حسین
محو جمال خالق یکتا ہوئے حسین   روکر زبان حال سے گویا ہوئے حسین
پنہاں کچھ اس میں راز خدائے قدیر تھا
لائی وہاں یہ خاک ، جہاں کا خمیر تھا [بہ حوالۂ اردو مرثیہ]

مشیر نے ایک مرثیے میں تلوار اور گھوڑے کے مابین کئی بند کا مکالمہ نظم کیا ہے ۔ اس کے بعض بند ملاحظہ ہوں ۔ تلوار کہتی ہے :

عرش آسمانوں میں ہوں میں ، کعبہ زمینوں میں   زمزم کنووں میں ، یوسف مصری حسینوں میں
پیشانی شریعۂ مہدی جبینوں میں   روزوں میں جمعہ ہوں ، رمضاں ہوں مہینوں میں
حرزوں میں جوشنیں صغیر و کبیر ہوں
تیغوں میں ذوالفقار جناب امیر ہوں

جب یوں گہر فشاں ہوئی شمشیر آبدار   گھوڑا ہوا کہے گھوڑے کے اوپر ہوا سوار
بولا مثال رعد کہ اے تیغ خوں فشار   میں بھی ہوں ذوالجناح ، اگر تو ہے ذوالفقار
آگے مرے تو ذکر شرف کیا نکالے گی
جبرئیل میں نہیں ہوں کہ پر کاٹ ڈالے گی

یاں سے اگر اشارہ کریں سرور امم   مثل براق عرش کے اوپر رکھوں قدم
میں تین دن کے فاقے سے ہوں ، تو ہے تازہ دم   پر آج دیکھیں کون تھکے پہلے ، تو کہ ہم
دم دعوی ہو گیا ہے لہو چاٹ چاٹ کے
کیا اڑ چلی ہے تو پر جبرئیل کاٹ کے

تو برق التہاب ہے میں رعد کا جواب   باراں ہے تو زمین پہ ، گردوں پہ میں سحاب
تو غصہ ہے علی کا ، میں اللہ کا عتاب   بسم اللہ گر ہے تو ، تو میں ہوں صفحۂ کتاب
اول میں کہہ دیا تھا یہی اور بند بھی
بجلی اگر چہ چمکے گی ، گرجے گا رعد بھی [بہ حوالۂ دبستان دبیر]

۴- قصیدہ اور متفرق کلام

راقم الحروف کو رسالۂ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ کے ۱۸۶۰ع کے ایک شمارے میں حضرت علی کی منقبت میں مشیر لکھنوی کا ایک قصیدہ دستیاب ہوا ہے۔ صد مشید [مشیر متوفیٰ ۱۸۷۶ع] کے اس معاصر ماخذ سے اس قصیدے کے بعض اشعار مع عنوان پیش ہیں ۶۰:

"قصیدہ در طرح مشعر منقبت جناب امیر از شیخ گوہر علی صاحب مشیر"

عشق روئے مرتضیٰ واجب ہے ایماں کی طرح　　یاد ہے وہ صورت پر نور قرآں کی طرح
روضۂ حیدر ہے جنت کے گلستاں کی طرح　　روح درباں در دولت ہے رضواں کی طرح
حال جب معراج کا پوچھا تو احمد نے کہا　　کیں خدا نے مجھ سے باتیں شاہ مرداں کی طرح
ہاتھ بھی دیکھا نبی نے اور سنی آواز بھی　　پردے کے اندر تھے حیدر، راز پنہاں کی طرح
ماتم در نجف میں گر میں روؤں اے مشیر　　ابر مژگاں ہو گہر بار ابر نیساں کی طرح

مشیر لکھنوی کے یہ مدحیہ اشعار لکھنؤ کے اس طرحی مشاعرے کے لیے کہے گئے تھے جس کا مصرع طرح گلدستۂ شعرا، لکھنؤ مورخہ ۶ مئی ۱۸۶۰ع (روز یک شنبہ) [تقویم دن، تاریخ اور سنہ میں مطابقت بتائی ہے] ۶۱ (ص ۱) میں چھپا تھا۔ مشیر کے یہ اشعار اسی طرح میں ہیں اور یہ رسالۂ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۶۰ع یک شنبہ (ص ۷-۶) میں شائع ہوئے ہیں۔ ان شواہد کی بنیاد پر میں مشیر کے ان اشعار کو ۶ مئی سے ۲۰ مئی ۱۸۶۰ع تک کی درمیانی مدت کا کلام قرار دیتا ہوں۔

رسالہ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ (۱۸۶۰ع) کے ایک شمارے ۶۲ سے مشیر لکھنوی کا ایک مدحیہ قطعہ مع عنوان نقل کیا جاتا ہے: [عنوان میں غلطی سے قطعے کو رباعی کہا گیا ہے]

"تہنیت عید سعید میں رباعی [کذا؟ قطعہ] شیخ گوہر علی صاحب مشیر ہے مدح جناب نواب شاہ میرزا خاں صاحب آزاد ۶۳ سلمہ اللہ القدیر ہے:"

سر بسر ماضی ہوا ہے غم، یہ حال عید ہے　　اوج پر مثل مہہ تاباں کمال عید ہے
وجہ عشرت ہے خیال رو و ابروئے حضور　　وہ صباح عید ہے [تو] یہ ہلال عید ہے

اس قطعے کا رسالۂ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ مورخہ ۳ جون ۱۸۶۰ع میں شائع ہونا اس امر پر مشعر ہے کہ مشیر کا یہ مدحیہ کلام ۳ جون ۱۸۶۰ع سے قبل کو

تخلیق ہے۔ عجب نہیں کہ مشیر نے یہ مدحیہ قطعہ نواب شاہ میرزا خاں آزاد کی خدمت میں یکم شوال ۱۲۷۶ھ کو عید کے موقع پر پیش کیا ہو۔ یکم شوال ۱۲۷۶ھ (روزِ عید) کو تقویم دوشنبہ ۲۳ اپریل ۱۸۶۰ء بتاتی ہے ۶۴ لیکن گلدستۂ شعرا لکھنؤ میں تاریخوں کے اندراجات سے [٦ مئی ۱۸۶۰ = ۱۳ شوال ۱۲۷۶ھ یک شنبہ ر۔ک۔ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ جلد ۱۔ نمبر ۱۰ ص ۱] یکم شوال ۱۲۷۶ھ (سہ شنبہ) ۲۴ اپریل ۱۸۶۰ ع کے مطابق نکلتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ قطعہ مشیر نے یکم شوال ۱۲۷۶ھ تک کہہ لیا ہوگا۔ اس قطعہ کے ساتھ اسی جریدے میں مشیر کا ایک اور قطعہ بھی موجود ہے۔

مشیر کے متفرق کلام کے ماتحت رسالۂ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۸۶۰ ع مطابق یک شنبہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ [تقویم دن اور عیسوی و ہجری تاریخوں کی مکمل تائید کررہی ہے۔ ر۔ ک تقویم یک صد و دو سالہ (۱۷۶۴ ع تا ۱۸۶۵ ع) مطبع منشی نول کشور، الکھنؤ ۱۸۶۵ ع۔ یہ مفید تقویم رضا لائبریری، رام پور میں موجود ہے۔ اس کے بعض ضروری اندراجات میں نے اپنے کام کے لیے نوٹ کرلیے ہیں۔ کاظم علی خاں] سے ایک شعر مع فارسی عنوان پیش کیا جاتا ہے:

«این شعر کہ در صنعت لف و نشر مرتب است و علاوہ این صنعت دیگر ہم دارد من تصنیف جناب شیخ گوہر علی صاحب متخلص بہ مشیر در مدح جناب نواب شاہ میرزا خاں بہادر دام اقبالہم العالی بہ قالب طبع درآمد»

بہ سخاوت	بہ عدالت	بہ شجاعت	بہ تجلا
دل حاتم	سر کسرا	دم رستم	ید بیضا ۶۵

اپنے ماخذ کی روشنی میں میرے نزدیک مشیر کا یہ شعر ۱۵ جولائی ۱۸۶۰ع تک کہا جاچکا تھا۔ نواب شاہ میرزا خاں بہادر آزاد کی مدح میں مشیر کے یہ متفرق اشعار نواب موصوف سے مشیر کے قریبی تعلقات پردال ہیں۔ مشیر کا ۱۸۶۰ع میں نواب شاہ میرزا کے متوسلین میں شامل ہونا خارج از مکان نہیں۔ حیات مشیر کے اس پہلو پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ عجب نہیں کہ مشیر کا کچھ اور مدحیہ کلامِ نواب موصوف کی مدح میں ہو۔

۴) مشیر کے منظوم و منثور مکاتیب

کلام مشیر کی ایک داخلی شہادت اور بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیر والیِ اودھ نواب واجد علی شاہ کی بیگم زیب عالم بادی بیگم کے

نامہ نویس تھے ۔ [سطور گذشتہ میں اس کا تذکرہ کیا جاچکا ہے] ۔ ہادی بیگم کے نام واجد علی شاہ نے کلکتے سے ایک خط لکھنؤ بھیجا ۔ داروغہ میر واجد علی تسخیر (شاگرد مشیر لکھنوی) نے زیب عالم ہادی بیگم کی جانب سے اس خط کا منظوم جواب اپنے استاد میاں مشیر سے لکھوا کر کلکتے روانہ کیا ۔ بادشاہ کو مشیر کا وہ منظوم خط بادشاہ کو پسند آیا اور انہوں نے مشیر کو بیگم کا نامہ نویس مقرر کردیا ۔ مشیر نے اس واقعے کو یوں نظم کیا ہے :

وہ خط نظم کرکے جو میں نے دیا
دروغہ نے فوراً روانہ کیا

گیا رفتہ رفتہ جو سلطاں کے پاس
فلک نے دکھائی خوشی کی اساس

مقدر رسا بس یکایک ہوا
پسند مزاج مبارک ہوا

اسی وقت غم ہوگیا سب غلط
مری شہ نے تن خواہ کی دستخط

عدم ہوگئی زیر باری مری
ہوئی تیس ماہ واری مری

عنایت یہ سلطان عالم نے کی
زر پنج ماہہ ملا پیشگی

رسا جن کے خط میں مقدر ہوا
انہیں کے محل میں مقرر ہوا

مجھے اوج نامہ نویسی دیا
پری کا سلیماں نے تابع کیا

ملا جب کہ مجھ کو یہ عہدہ فقط
بہت سے لکھے نظم اور نثر خط ٦٦

کلام مشیر کی یہ داخلی شہادت اس امر کی مظہر ہے کہ مشیر لکھنوی نے ہادی بیگم کی جانب سے واجد علی شاہ کو بہت سے منظوم و منثور رقعات لکھے تھے ۔ مشیر پر تحقیق کرنے والوں کو مشیر کے ان منظوم و منثور مکاتیب کو تلاش کرنا چاہیے ۔ اگر یہ رقعات مل جائیں تو ان کی مدد سے نثر مشیر کے نمونے دست یاب ہوسکتے ہیں اور مشیر کی انشا پردازی کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے ۔ اس سلسلے میں انشائے راحت روح کو تلاش کرنا چاہیے ۔ ٦٧ ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب اس سلسلے میں مفید مطلب ثابت ہو ۔ مشیر پر تحقیق کو اس سمت میں بھی پیش رفت کرنا چاہیے ۔

۵) مشیر کی ایک اہم مثنوی

مشیر کے صحیفۂ حیات میں بیگمات اودھ کی نامہ نویسی کا باب اپنے دور رس نتائج کے باعث خاصا اہم ثابت ہوتا ہے ۔ یہ نامہ نویسی مشیر کے ادبی آثار میں ایک اہم مثنوی کی تخلیق کا سبب بنی ۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ خدابخش لائبریری ، پٹنہ میں موجود ہے ۔ واجد علی شاہ کو اپنی بیگم (ہادی بیگم) کی جانب

ہے کلکتہ میں موصول ہونے والے مشیر کے تحریر کردہ منثور و منظوم مکاتیب اس قدر پسند آئے کہ انھوں نے ہادی بیگم سے فرمائش کر کے مشیر سے ایک مثنوی لکھوائی ۔ مشیر نے اس مثنوی میں ان واقعات کو یوں بیان کیا ہے :

ہوا حکم ناگاہ یہ دل پذیر — کہ بھاتا ہے مجھ کو کلام مشیر
سوائے جان جاں چاہتا ہے یہ جی — کہ کہواؤ تم اس سے اک مثنوی
شروع جوانی سے تا ایں زماں — جو گزری ہو تم پر کرو سب بیاں
کہو صاف جس جس پہ آیا ہو دل — جوانی میں جس سے لگایا ہو دل
ہماری محبت ہوئی کس طرح — بتاؤ یہ الفت ہوئی کس طرح
مگر شعر ہوں پانچ یا چھ ہزار — نہ ہو جھوٹ اس حال میں زینہار ۶۸

مشیر کے اس بیان پر ہادی بیگم کے نام واجد علی شاہ کا مندرجہ ذیل مکتوب مہر تصدق ثبت کرتا ہے ۔

" داسی کاتب و شاعر خوش نویس فکر و خوش تقریر [مشیر لکھنوی مراد ہیں] کے واسطے آگے بھی تحریر کر چکا ہوں ۔ ان کی ملازمی اور تنخواہ کی تدبیر کر چکا ہوں .... اب پھر بار دگر لکھتا ہوں ، مکرر لکھتا ہوں کہ اس کاتب خوش تقریر کا نام لکھوا بھیجو اور بحر متقارب مثمن مقصورالآخر میں بھی کلام لکھوا بھیجو تو ہم اس کے نام کو اپنے دفتر پر لکھ لیں ۔ اور خطاب اس کا " راقم عشق اختر " لکھ لیں ۔ ہمیں منظور ہے کہ جب سے تم نے ماشاءاللہ ہوش سنبھالا ہو اورالی الآن جو جو سوانحات اور تعشق اور فرط تعشق تم سے ہمارے واسطے صادر ہوا ہو ، ان سب واردات کو یہ شخص پانچ چھ ہزار شعر میں اور بحر متقارب مثمن مقصور میں بقید تسطیر لائے اور لطف تحریر راست راست سوائے مبالغہ شاعری دکھلائے ۔ ... جی تو یہ چاہتا ہے کہ کتاب " مثنوی ممتاز " کہ یہ نام بھی اس مثنوی کے واسطے زیبا اور لائق ہے ، مجلد اور حبشی اور مطلا اور مذہب اور مقر کروا کے ہمارے پاس بھیجواؤں ، جو صرف اس کا ہوگا وہ متعلق ہم سے ہے ۔ اور جو یوں نہ ہو سکے تو ایک ایک دو دو جز میرے پاس روانہ کرتی جانا ۔ میں یہاں حسب مرضی خود اس کی تیاری کروا لوں گا اور چھپنے کی بھی تدبیر کروں گا ۔ " ۶۹

کلام مشیر کی داخلی شہادت اور واجد علی شاہ کے منقولہ بالا مکتوب سے بہ خوبی معلوم ہوتا ہے کہ مشیر نے خود جان عالم واجد علی شاہ کی فرمایش پر مثنوی میں ریب عالم بادی بیگم اور واجد علی شاہ کے عشقیہ روابط کی داستان نظم کی تھی ۔ ان حقائق کے پیش نظر ڈاکٹر گیان چند جین کا اپنے ڈی ۔ لٹ کے مقالے میں یہ ارشاد نظر ثانی کا محتاج ہے کہ جان عالم واجد علی شاہ نے مشیر کو « . . . یہ حکم دیا کہ تم اپنی سوانح کی آپ بیتی لکھو ۔ انہوں (یعنی مشیر) نے خوشامد کے طور پر اپنی سرگزشت کی بجائے واجد علی شاہ اور ان کی ایک محبوبہ کے معاشقے کا بیان کردیا ۔ » ۷۰

واجد علی شاہ نے اپنے محولۂ بالا مکتوب میں خود مشیر کی اس مثنوی کا عنوان « مثنوی مختار » تحریر کیا ہے ۔ ان حالات میں ڈاکٹر گیان چند جین کا مشیر کی اس مثنوی کو « بے نام مثنوی » ۷۱ کہنا محل نظر قرار دیا جائے گا ۔

مشیر کی مثنوی « مثنوی ممتاز » کا ایک ناتمام (ناقص الآخر) قلمی نسخہ خدابخش لائبریری ، پٹنہ ۷۲ میں موجود ہے ۔ ۹۱ اوراق (اکیانوے اوراق) پر مشتمل مشیر کی مثنوی کا یہ مطلا قلمی نسخہ رنگ برنگی کاغذوں پر لکھا ہوا ہے ۔ اس نسخے میں ابیات کی تقسیم دس اشعار فی صفحہ کے حساب سے ہے ۔ آخری صفحے میں چند سطروں کی جگہ سادہ ہے ۔ مثنوی مشیر کا ابتدائی مصرع یہ ہے ع

دلا ربِ ایماں ہے حمد خدا

نسخۂ خدا بخش لائبریری ، پٹنہ کی آخری بیت یہ ہے :

پلا ساقیا اب وہ جام شراب دکھادے جو کیفیت انقلاب

یہ بیت خود بتاتی ہے کہ مثنوی مشیر کا نسخۂ پٹنہ کسی وجہ سے ناتمام رہ گیا ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے تخمینے کے مطابق یہ مخطوطہ تقریباً ۱۶۰۰ (سولہ سو) اشعار پر مشتمل ہے ۷۳ ۔

سطور گذشتہ میں کلام مشیر کی داخلی شہادت اور خود واجد علی شاہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے مثنوی میں پانچ یا چھ ہزار ابیات کی فرمایش کی تھی ۔ مشیر بادشاہ کی اس فرمایش کی تعمیل کرسکے یا نہیں یہ مسئلہ تحقیق کا طالب ہے ۔ مشیر کی یہ مثنوی منزل تکمیل سے ہم کنار ہوئی یا ناتمام ہی رہی؟ اس سوال کا جواب بھی تحقیق کا طالب ہے ۔ اس کے علاوہ اگر مشیر نے مثنوی مکمل کی تھی تو مکمل مثنوی کے اشعار کی مجموعی تعداد کتنی تھی؟ یہ مسئلہ بھی مزید تحقیق سے حل ہوگا ۔

مشیر کی « مثنوی ممتاز » میری اطلاع کے مطابق ۵ ذی قعدہ ۱۲۷۵ ھ [از روے تقویم مطابق ۷ جون ۱۸۵۹ ع] کے بعد معرض وجود میں آئی ہوگی۔ کیوں کہ جس مکتوب میں واجد علی شاہ نے اس مثنوی کی فرمایش کی تھی اس کی تاریخ تحریر ۵ ذی قعدہ ۱۲۷۵ ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے بہ طور مثال مشیر کی زیر بحث مثنوی کے چند اشعار پیش فرمائے ہیں اور مثنوی کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

« ..... مثنوی میں وصل کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی اعلا درجے کی ہے۔ .. جہاں تک زبان کا تعلق ہے مثنوی کی خوبی سے کون منکر ہوسکتا ہے۔ زباں سے قطع نظر اس میں کوئی امتیازی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ موضوع کی پستی اور تصنع ظاہر ہے۔ »

ڈاکٹر ذاکر حسین کے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے دبستان دبیر میں مشیر کے حالات و کلام پر اچھے خاصے صفحات لکھے گئے ہیں مگر مشیر کی اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

مشیر نے « مثنوی ممتاز » میں واجد علی شاہ کی جن بیگم کی حیات معاشقہ بیان کی ہے وہ بادشاہ کی ممتوعہ تھیں۔ ان کا نام ہادی بیگم اور لقب زیب عالم تھا ۷۶۔ افسوس کہ شیخ تصدق حسین کی کتاب ۷۷ میں اور بیگموں کے حالات تو مل جاتے ہیں مگر زیب عالم ہادی بیگم کے حالات اس کتاب میں علاحدہ نہیں ملتے۔

مجھے مسرت ہے کہ ڈاکٹر حمیرا خاتون (پٹنہ) مشیر کی اس مثنوی پر ایک مضمون لکھ رہی ہیں۔ آج ۱۹ جون ۱۹۷۹ ع کو (جب اس مضمون کو صاف کرچکا ہوں) مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر حمیرا خاتون کا مضمون کس منزل میں ہے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ اس مثنوی کے نسخۂ پٹنہ پر سیر حاصل تحقیقی مضمون تحریر فرمائیں گی۔

حواشی

۱ سراپا سخن: سید محسن علی محسن۔ مطبع منشی نول کشور۔ لکھنؤ اپریل ۱۸۷۵ ع مطابق ربیع الاول ۱۲۹۲ ھ ص ۲۴ (ملاحظہ ہوں کہ حالات مرزا خورشید قدر بہادر قیصر)

۲ حیات دبیر (جلد اول) : سید افضل حسین ثابت لکھنوی - سیوک پریس، لاہور ۱۹۱۳ ع ص ۴۹۸ -

۳ یادگار انیس : امیر احمد علوی - سرفراز پریس، لکھنؤ (طبع پنجم) ص ۳۰ حاشیہ -

۴ دبستان دبیر (تحقیقی مقالہ براۓ پی ایچ - ڈی) : ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نسیم بک ڈپو، لکھنؤ مئی ۱۹۶۶ ع ص ۲۱۰ -

۵ اردو مثنوی شمالی ہند میں (تحقیقی مقالہ براۓ ڈی۔لٹ) : ڈاکٹر گیان چند جین - انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ ۱۹۶۹ ع ص ۵۷۰ -

۶ رسالۂ گلدستۂ شعراء لکھنؤ جلد ۱ - نمبر ۱۱ - مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۶۰ع ص ۹ نیز جلد ۱ نمبر ۱۲ - مورخہ جون ۱۸۶۰ع ص ۱۳ -

۷ خوش معرکۂ زیبا : سعادت خاں ناصر (قلمی نسخہ) ورق ۱۶۲ [حوالۂ ڈاکٹر اکبر حیدری : میر ضمیر (تحقیقی مطالعہ) - (طبع اول) ۱۹۷۲ ع ص ۶۳ مع حاشیہ ۱] -

۸ ر۔ک تذکرۂ خوش معرکہ زیبا ، مؤلفۂ سعادت خان ناصر - مرتبۂ ڈاکٹر شمیم انہونوی - نسیم بک ڈپو ، لکھنؤ (طبع اول) جولائی ۱۹۷۱ع ص ۱۵۷ -

۹ مئیر لکھنؤی کے سوانحی حالات کے بیش تر تفصیلات [مثلاً ولدیت ، خاندان ، سنہ ولادت ، مولد ، وطن ثانی ، تعلیم ، آغاز شاعری ، میر ضمیر سے ملاقات ، شاگردی شادی ، اولاد ، دربار اودھ سے تعلق ، سفر کلکتہ ، وفات اور مدفن وغیرہ] دبستان دبیر (ص ص ۲۱۱-۲۱۰) کے مندرجات پر مبنی ہیں - بخوف طوالت و تکرار ہر جگہ ان کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے - کاظم علی خاں -

۱۰ اس مضمون میں مندرجہ ذیل تقویموں کو استعمال کیا گیا ہے :

(الف) تقویم یک صد و دو سالہ (۱۷۶۴ع تا ۱۸۶۵ع) مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ع - مخزونہ رضا لائبریری ، رام پور سے نقل کردہ یادداشتیں - امید ہے کہ اس تقویم کا جدید ایڈیشن شائع ہوگا -

(ب) مفتاح التقویم : مرتبۂ حبیب الرحمٰن خاں صابری - ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی طبع ۱۹۷۷ع

(ج) تقویم ہجری و عیسوی : مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی - انجمن ترقی اردو (ہند) ، دہلی طبع مارچ ۱۹۷۷ ع -

۱۱　والیِ اودھ نواب سعادت علی خاں کا عہد حکومت ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو وزیر علی خاں کی معزولی پر شروع ہوتا ہے [تاریخ آصفی (اردو ترجمہ تفضیح الغافلین مصنفہ مرزا ابو طالب اصفہانی لندنی) : مترجمہ و مرتبہ ڈاکٹر ثروت علی ۔ جمال پرنٹنگ پریس ، دہلی ۱۹۶۸ء ص ۲۲ ۔ حاشیہ ۲] ۔ تقویم ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو یک شنبہ ۳ شعبان ۱۲۱۲ھ کے مطابق بتاتی ہے ۔ امجد علی شاہ : سید سبط محمد نقوی ۔ سرفراز پریس ، لکھنؤ ۱۹۷۶ء (ص ۵۳) میں اس سلسلے میں ۳ شعبان ۱۲۱۲ھ کا اندراج ملتا ہے (بحوالہ امجد علی خاں) سہ شنبہ ۱۲ جولائی ۱۸۱۴ء (از روئے تقویم مطابق ۲۴ رجب ۱۲۲۹ ھ) کو نواب سعادت علی خاں کی وفات پر ان کے عہد کا اختتام ہوتا ہے [ہندی کتاب واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن : پریپورنانند ورما ۔ سوچنا وبھاگ اتر پردیش ، لکھنؤ جنوری ۱۹۵۹ء ص ۳۳] نواب سعادت علی خاں کی تاریخ وفات امجد علی خاں تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ طبع لکھنؤ ۱۹۷۸ء (ص ۱۴۰ میں) بحوالۂ تواریخ نادر العصر ۲۳ رجب ۱۲۲۹ھ (منگل) لکھتے ہیں ۔ اس کے علاوہ فقیر محمد خاں گویا نے بھی بستان حکمت طبع ۱۲۵۴ھ میں نواب سعادت علی خاں کی تاریخ وفات ۲۳ رجب ۱۲۲۹ھ (سہ شنبہ) درج کی ہے (بحوالۂ گویا صاحب سیف و قلم ۔ جعفر ملیح آبادی ۔ نامی پریس ، لکھنؤ ۱۹۷۸ء ص ۲۵۴) ۔ (کاظم علی خاں)

۱۲　حصین کے بارے میں محسن علی محسن کا بیان ہے : « امیر خوش تدبیر حضرت سلطان عالم کے مشیر ، نازک خیال قدردان اہل کمال احسن الدولہ محسن الملک محمد حسین علی خاں بہادر تحسین جنگ خواجہ سرا ، حصین تخلص باشندۂ لکھنؤ صاحب دیوان » [سراپا سخن طبع اپریل ۱۸۷۵ء (ص ۳۰)] ۔ خم خانۂ جاوید (جلد دوم) ۔ لالہ سری رام ۔ رائے گلاب سنگھ پریس ، لاہور ۱۹۱۱ء (ص ص ۴۷۶ ۔ ۷۷) میں بحوالۂ سراپا سخن حصین کا ذکر کیا گیا ہے ۔ دبستان دبیر (ص ۲۱۹ نیز ص ۴۵۸) میں حصین کو مرزا دبیر کا شاگرد بتایا گیا ہے ۔ (کاظم علی خاں) ۔

۱۳　میر مظفر حسین ضمیر کا ذکر متعدد مآخذ میں موجود ہے جن میں مندرجہ ذیل مصادر شامل ہیں :

(۱) ریاض الفصحاء : تالیف غلام ہمدانی مصحفی ۔ مرتبہ مولوی عبدالحق ۔ جامع برقی پریس ، دہلی ۱۹۳۴ء ص ۱۸۰ ۔

(۲) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا لکھنؤ طبع جولائی ۱۹۷۱ء ص ص ۳۷۹ تا ۳۸۹ ۔

۲) سراپا سخن۔ طبع لکھنؤ اپریل ۱۸۷۵ع ص ۲۹۰

۴) تذکرۂ سخن شعراء : مولوی عبدالغفور خان بہادر نساخ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع اکتوبر ۱۸۷۴ع رمضان ۱۲۹۱ھ ص ۲۸۹۔

۵) تذکرۂ خم خانۂ جاوید (جلد پنجم) : مؤلفۂ لالہ سری رام۔ مرتبہ پنڈت برج موہن دتاریہ کیفی۔ دہلی ۱۹۴۰ع ص ص ۳۷۶ تا ۳۷۷

(۶) تذکرۂ نادر۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۷ع ص ۱۰۱۔

(۷) فارسی کتاب شمس الضحیٰ : مصنفہ مولوی صفدر حسین۔ مطبع اثناعشری، لکھنؤ طبع ۱۲۹۸ھ (ص ص ۱۶۵ـ۱۶۴) میں میر ضمیر کا ایک فارسی مکتوب بنام مرزا دبیر موجود ہے۔ [تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مضمون " مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار " از کاظم علی خاں ۔ مشمولۂ ماہنامہ آج کل، دہلی بابت ستمبر ۱۹۷۶ع ص ۳۰۔ یہی مضمون سرفراز لکھنؤ کے دبیر نمبر : مرتبہ کاظم علی خاں۔ شمارہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۶ع (ص ص ۷۶ تا ۸۲) میں بھی شائع ہوا ہے]۔

(۸) اردو مرثیے کا ارتقا (تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔لٹ) ڈاکٹر مسیح الزماں۔ کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ ۱۹۶۸ع ص ص ۲۴۵ تا ۲۷۴۔

(۹) اردو مرثیے کی روایات : ڈاکٹر مسیح الزماں۔ کتاب نگر لکھنؤ ۱۸۶۹ع ص۴۲ نیز ص ص ۲۶۴ تا ۳۰۲۔

(۱۰) میر ضمیر (تحقیقی مطالعہ) : ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری۔ (مطبع کا نام ندارد) طبع اول ۱۹۷۲ع۔ یہ ضمیر کے بارے میں ایک مفید کتاب ہے مگر ص ۷ پر میر ضمیر کی تاریخ وفات کے ماتحت ۲۳ محرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۶ نومبر ۱۸۵۵ھ کا اندراج نظر ثانی کا محتاج ہے۔ تقویم یک صد و دو سالہ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ع کی رو سے ۲۳ محرم ۱۲۷۲ھ (شنبـــہ) ۶ اکتوبر ۱۸۵۵ع کے مطابق نکلتی ہے۔

(۱۱) اردو مرثیہ اور مرزا دبیر : کاظم علی خاں۔ احباب پبلیشرز، لکھنؤ اگست ۱۹۶۵ع میں بھی متعدد و مقامات پر ضمیر کا ذکر دیکھا جا سکتا ہے۔

ان ماخذوں کے علاوہ حیات دبیر، سبع مثانی، دربار حسین، دبستان دبیر، رزم نامہ دبیر، اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ)، تعارف مرثیہ از شجاعت علی سندیلوی اور دوسری بہت سی کتابوں میں ضمیر کا ذکر موجود ہے۔ بعض وسائل میں

ضمیر پر مضامین بھی شائع ہوئے ہیں مثلاً مضمون «ضمیر لکھنؤی اور ان کا کلام» از علی جواد زیدی، مشمولہ نیا دور، لکھنؤ ۲۶ جنوری ۱۹۶۴ء۔ «مضمون میر اور ضمیر مرزا دبیر کے دو معراج نامے» از سید سبط محمد نقوی۔ مشمولۂ ماہ نامہ آج کل، دہلی شمارہ بابت ماہ جنوری ۱۹۷۷ء۔ وغیرہ۔ کاظم علی خاں)۔

۱۴　دبیر کے لیے مفید ماخذوں کی ایک طویل فہرست میرے مضمون «مطالعۂ دبیر کے بعض پہلو» مشمولۂ ہماری زبان، دہلی شمارہ ۸ جون ۱۹۷۶ء نیز ضمیمۂ قومی آواز، لکھنؤ میں شائع ہوچکی ہے۔ یہ فہرست اب اضافوں کے ساتھ راقم الحروف کی زیر طبع کتاب تلاش دبیر میں بھی شائع کی جارہی ہے (کاظم علی خاں)۔

۱۵　مثیر کے دبیر سے تلمذ کے لیے مندرجہ ذیل ماخذوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے:
(۱) حیات دبیر (جلد اول) : ثاقب لکھنؤی　(۲) دبستان دبیر (۳) یادگار انیس
(۴) سبع مثانی : مرتبہ خبیر لکھنوی لکھنؤ ۱۳۴۹ھ (دیباچہ از ثابت لکھنؤی) وغیرہ۔

۱۶　بحوالۂ (الف) سلطان عالم واجد علی شاہ : سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص ۱۳۲۔ (ب) اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ ص ۵۷۰۔

۱۷　اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۶۶۸۔

۱۸　دبستان دبیر ص ۳۱۱ (حاشیہ)۔

۱۹　نصیرالدین حیدر اودھ کے دوسرے بادشاہ کا ذکر نامۂ عبرت　رجب علی بیگ سرور مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر، لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۷ء، لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین۔ بارگاہ ادب، لاہور ۱۹۷۵ء ص ۹۹ نیز دوسرے متعدد ماخذوں میں موجود ہے۔ نصیرالدین حیدر کا عہد حکومت تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ (لکھنؤ طبع ۱۹۷۸ء) ص ۱۴۷ نیز ص ۱۵۸ کے اندراج کے مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ تا ۳ ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ کی درمیانی مدت کو محیط ہے اور یہ زمانۂ از روئے تقویم پنج شنبہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۲۷ء تا جمعہ ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کے مطابق ہے (بحوالہ تقویم مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی)۔ تقویم ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو پنج شنبہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۲۷ء بتاتی ہے لیکن تاریخ مذکورہ کو فقیر محمد خاں گویا بستان حکمت میں ہفتہ کا روز بتاتے ہیں (بحوالۂ گویا صاحب سیف و قلم ص ۲۶۳)۔ اس کے علاوہ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ (ص ۱۴۶) میں ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو خلاف تقویم ۲۱ اکتوبر ۱۸۲۷ء کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔

تذکرۂ ریاض الفردوس : تالیف محمد حسین خان ۔ ترتیب و حواشی مرتضیٰ حسین فاضل ۔ ناشر شیخ محمد مبارک علی تاجر کتب لاہور (طبع اول) اپریل ۱۹۶۸ء ص ۵۳ (حاشیہ ۲) میں نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کی تاریخ خلاف واقعہ و خلاف تقویم ۲۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ ۔ ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۷ء درج کی گئی ہے ۔ صحیح تاریخ ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ ہے ۔ تقویم ۲۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو ۱۲ اکتوبر کے بجائے ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء بتاتی ہے ۔

ہندی کتاب اودھ کی لوٹ (میجر برڈ کی انگریزی کتاب « ڈکیتی ان اکسل سس » کا ہندی ترجمہ) مترجم راجیبور پانڈے ہندی سمیتی سوچنا و بھاگ ، اتر پردیش ، لکھنؤ ۱۹۶۶ء (ص ص ۵۸ ۔ ۵۷) سے نصیر الدین حیدر کی تاریخ وفات ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کی تائید ہوتی ہے ۔ (کاظم علی خاں)

۲۰ محمد علی شاہ کا عہد حکومت ۴ ربیع الاخر ۱۲۵۳ھ تا ۵ ربیع الاخر ۱۲۵۸ھ کی درمیانی مدت کو محیط ہے (دیکھ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ص ۱۶۴ نیز ص ۱۷۱) اور از روئے تقویم یہ زمانہ شنبہ ۸ جولائی ۱۸۳۷ء تا دو شنبہ ۱۶ مئی ۱۸۴۲ء کے مطابق ہے ۔ تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ (ص ۱۷۱) میں ۵ ربیع الاخر ۱۲۵۸ھ (تاریخ وفات محمد علی شاہ) کو چونکہ سہ شنبہ بتایا گیا ہے لہذا عہد محمد علی شاہ کو سہ شنبہ ۱۷ مئی ۱۸۴۲ء تک مانا جاسکتا ہے ۔ امجد علی خاں نے ۵ ربیع الاخر ۱۲۵۸ھ کو خلاف تقویم ۷ مئی ۱۸۴۲ء کے مطابق قرار دیا ہے (تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ ص ۱۷۱) (کاظم علی خاں)

۲۱ بنی : واجد علی شاہ اختر ۔ مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۹۵ھ ص ص ۲۳۶ تا ۲۴۶ میں واجد علی شاہ کے درباری شاعروں کا ذکر موجود ہے ۔ اسی کے ماتحت مشیر لکھنوی کا ذکر ملتا ہے (بحوالۂ سلطان عالم واجد علی شاہ ص ۱۲۲) ۔

۲۲ سلطان عالم واجد علی شاہ ص ۲۲۴

۲۳ تقویم یک صد دو سالہ ۔ مطبع منشی نول کشور ، لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ء ۔

۲۴ بحوالۂ سلطان عالم واجد علی شاہ ص ص ۲۳۶ ۔ ۲۳۵ ۔

۲۵ ایضاً ص ۲۲۵ ۔ ۲۶ یادگار انیس ص ص ۳۱ ۔ ۳۰ ۔ ۲۷ دبستان دبیر ص ۳۱۴ ۔

۲۸ حیات دبیر (جلد اول) ص ص ۱۲۸ ۔ ۱۱۹ ۔ ۲۹ فکر بلیغ ۔ مولفۂ شاد عظیم آبادی ۔ مرتبہ نقی احمد ارشاد ۔ نسیم بک ڈپو ، لکھنؤ ۔ اگست ۱۹۰۴ء ص ۱۷۳ ۔

۳۰ انیسیات : مرتبہ صباح الدین عمر ۔ مقدمہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ نومبر ۱۹۷۶ء ص ص ۲ [illegible]

۴۴ اردو کے ادبی معرکے : ظہیر حسن نورانی ۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ مئی ۱۹۶۹ع ص ص ۱۲۳۔ ۱۲۲ ۴۲ حیات دبیر (جلد اول) ۔ ص ۲۲۰ ۔ ۴۳ مفتاح التقویم حبیب الرحمن خاں صابری طبع ۱۹۷۷ع ۔ ۴۴ میر واجد علی تسخیر کو دبستان دبیر (ص ص ۴۱۲۔ ۴۱۱ نیز ص ۴۴۵) میں مشیر لکھنوی کا شاگرد بتایا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعد کو مشق سخن بڑھنے پر مشیر نے تسخیر کو دبیر کا شاگرد کرادیا ۔ خم خانۂ جاوید (جلد دوم) : مولفۂ لالہ سری رام ۔ راے گلاب سنگھ پریس، لاہور ۱۹۱۱ع (ص ص ۵۷۔ ۵۶) میں تسخیر کا ذکر مع نمونۂ کلام موجود ہے ۔ بیگمات اودھ : شیخ تصدق حسین ۔ کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۵۶ع ۔ (ص ص ۲۶۸ تا ۲۸۱) میں بھی میر واجد علی کی زندگی کے واقعات ملتے ہیں ۔ میر واجد علی تسخیر کے مختصر حالات ان محولۂ بالا ماخذوں سے پیش کیے جاتے ہیں ۔ میر واجد علی، نواب سلطان جہاں محل (زوجہ متوعہ واجد علی شاہ) کے داروغہ تھے ۔ بعض دوسرے شاہی محلات میں بھی دوسری خدمتیں ان سے متعلق تھیں ۔ داروغہ واجد علی کے بڑے فرزند نظیر حسین نے اپنے نام پر امین آباد سے متصل لکھنؤ میں محلہ نظیر آباد، آباد کیا جو آج کل لکھنؤ کا بارونق بازار ہے ۔ نواب سلطان محل نے میر واجد علی، کی کارکردگی سے متاثر ہوکر ۱۹ شعبان ۱۲۷۵ھ کو ہزاروں روپے کی مالیت سے ایک وقف قائم کرکے انہیں اس کا متولی بنا دیا اور وقف کی تولیت میر واجد علی کی اولاد کے لیے مختص کردی ۔ اسی وقف کی جانب سے محلہ گولا گنج لکھنؤ میں واقع حسینیہ داروغہ واجد علی سے ۷ محرم کو مہدی کا جلوس اٹھتا ہے ۔ دبستان دبیر میں واجد علی تسخیر کا سنہ وفات ۱۸۷۵ع بتایا گیا ہے (دبستان دبیر ص ۴۴۷) لیکن بیگمات اودھ (ص ۲۸۱) میں تسخیر کی تاریخ وفات ۱۴ دسمبر ۱۸۷۶ع بتائی گئی ہے ۔ تسخیر کو خم خانۂ جاوید جلد دوم (ص ۵۶) میں اسیر کا شاگرد قرار دیا گیا ہے ۔ وہ غزلیں اسیر کو دکھاتے تھے ۔ دبستان دبیر (ص ۲۵۱) میں اس کی تائید کی گئی ہے ۔

۴۵ سراپا سخن طبع اپریل ۱۸۷۵ع (ص ۲۴) میں «شاہزادۂ والا گہر مرزا محمد خورشید قدر بہادر قیصر خلف اکبر مرزا محمد آسماں قدر بہادر مغفور بن مرزا محمد خرم بخت بہادر بن مرزا جہاں دار شاہ بہادر» کا اندراج قیصر کو مغلوں کے شاہی خاندان سے بتاتا ہے ۔ سراپا سخن میں قیصر کو شاگرد مشیر قرار دیا گیا ہے ۔ دبستان دبیر (ص ۷۱۷) میں قیصر کا مختصر حال بحوالہ سراپا سخن درج کیا گیا ہے مگر سراپا سخن طبع ۱۸۷۵ع کے صفحۂ ۹۴ کا حوالہ

دیا گیا ہے۔ سراپا سخن کے اس ایڈیشن کے ص ۶۴ پر قیصر کا ذکر نہیں ملتا۔ یہاں ص ۳۴ کے بجائے غلطی سے ص ۶۴ درج ہوگیا ہے۔ دبستان دبیر میں قیصر کے حال پر یہ بات اضافہ ہوگی کہ قیصر صاحب تذکرۂ سراپا سخن کے مربی تھے۔ اس کے علاوہ مجھے قیصر کے دو فرزندوں کا بھی علم ہوا ہے :
(۱) شہزادہ مرزا محمد سلیمان قدر بہادر تسخیر اور (۲) شاہزادہ مرزا محمد ہمایوں قدر بہادر (بحوالۂ سراپا سخن طبع ۱۸۷۵ء ص ص ۲۵۷ تا ۲۵۸)۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے (مشیر کے حوالۂ بالا چار شاگردوں کے علاوہ) دبستان دبیر (ص ۴۱۸) میں میر محمد جعفر کثیر کو بھی مشیر کے شاگردوں میں شمار کیا ہے۔ ۳۶ سراپا سخن ص ۷ (دیباچہ)۔

۳۷ ر۔ک رسالۂ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ جلد ۱۔ نمبر ۵۔ مورخہ ۲۹ جنوری ۱۸۶۰ء ص ۷۔ ۳۸ گلدستۂ شعراء جلد ۱۔ نمبر ۶۔ مورخہ ۲۶ فروری ۱۸۶۰ء ص ۸۔

۳۹ گلدستۂ شعراء، لکھنؤ جلد ۱۔ نمبر ۲۵۔ مورخہ سیزدہم جنوری ۱۸۶۱ء ص ۹۔

۴۰ بحوالہ دبستان دبیر ص ۳۲۳۔

۴۱ یادگار انیس ص ص ۳۱۔۳۰ (حاشیہ)۔

۴۲ ایضاً۔ ۴۳ دبستان دبیر ص ص ۳۲۰۔ ۳۱۹۔ ۴۴ ماہ و سنہ بحوالۂ ڈاکٹر اکبر حیدری۔ ۴۵ «خلاصۃ سوانح لکھنو» مشمولۂ رسالہ معاصر، پٹنہ (حصہ ۱۸) بابت جولائی ۱۹۶۲ء (خلاصہ لکھنؤ کے صفحات کا سلسلہ) ص ص ۸۹ تا ۹۱۔

۴۶ جوش معرکۂ ربیبا۔ سعادت خاں ناصر (قلمی نسخہ) ورق ۱۶۴ [بحوالۂ کتاب میر ضمیر طبع ۱۹۷۲ء ص ص ۶۳۔ ۶۲]۔ ۴۷ بحوالۂ دبستان دبیر ص ۳۲۳۔

۴۸ یادگار انیس ص ص ۳۱۔۳۰ (حاشیہ)۔ ۴۹ لکھنؤ کا دبستان شاعری (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی): ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ مکتبہ علم و فن، دہلی اپریل ۱۹۶۵ء ص ۴۷۔ ۵۰ دبستان دبیر ص ۴۱۸۔ ۵۱ مشیر کی ہر سہ گوئی پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دبستان دبیر (ص ص ۳۲۳ تا ۳۳۰) کے مندرجات پر مبنی ہے۔ اس کتاب سے یہاں میں نے استفادہ کیا ہے۔ ۵۲ دبستان دبیر ص ص ۳۲۰۔ ۳۲۹۔ ۵۳ سبع مثانی (جلد اول): مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی۔ لکھنو ۱۳۴۹ھ (دیباچہ از ثابت لکھنوی ص ۲۴)۔ ۵۴ سراپا سخن ص ۲۴ (ملاحظہ ہو احوال مرزا محمد خورشید قدر قیصر شاگرد مشیر۔ کاظم علی خاں)۔

۵۵ یادگار انیس ص ۳۰۔ ۵۶ اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ)۔ سفارش حسین رضوی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ جولائی ۱۹۶۵ء ص ۳۴۶۔ ۵۷ دفتر ماتم

(جلد ۸) : مرزا سلامت علی دبیر ۔مطبع شاہی، لکھنؤ (طبع دوم) مطبوعہ اکتوبر ۱۹۱۲ع ۔ مرثیہ نمبر ۱۵ ۔ ۵۸ حیات دبیر (جلد اول) ص ۲۷۹ ۔

۵۹ دربار حسین : سید افضل حسین ثابت لکھنوی۔ مطبع اثناعشری، دہلی ۱۳۳۸ھ ص ۱۲ [بحوالۂ مضمون « شاد کی مرثیہ گوئی » از رضوان احمد خاں ۔ مشمولۂ ماہ نامہ زبان و ادب ، (شاد عظیم آبادی نمبر) شمارہ بابت فروری ۔ مارچ ۱۹۷۹ع ص ۸۸ نیز بحوالۂ دبستان دبیر ص ۲۳۰]۔ ٦۰ رسالۂ گلدستۂ شعراء ، لکھنؤ جلد ۱ ۔ نمبر ۱۱ ۔ مورخہ ۲٦ مئی ۱۸٦۰ع ۔ ص ص ۷ ۔ ٦ ۔ ٦۱ تقویم یک صد و دو سالہ. مطبع منشی نول کشور ، لکھنو ۱۸٦۵ع ۔ ٦۲ گلدستۂ شعراء ، لکھنو جلد ۱ ۔ نمبر ۱۲ ۔مورخہ ۳ جون ۱۸٦۰ع مطابق یک شنبہ ۱۲ ذی القعد ۱۲۷٦ھ ص ۱۴۔

٦۳ نواب شاہ مرزا خاں آزاد کے بارے میں تذکرۂ خوش معرکہ زیبا مطبوعہ لکھنو جولائی ۱۹۷۱ع (ص ۴۳۵) میں لکھا گیا ہے : « آزاد ۔ رئیس فیض بنیاد شاہ مرزا، تخلص « آزاد » ولد سلطان مرزا شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔» تذکرۂ نادر طبع لکھنؤ ۱۹۵۷ع (ص ۲۴) میں یہ اندراج ملتا ہے . « آزاد سید محمد امیرالدین معروف بہ شاہ مرزا لکھنوی ۔ » تذکرۂ خم خانۂ جاوید (جلد اول) لالہ سری رام ۔ مطبع منشی نول کشور، لاہور ۱۹۰۸ ع ۔ (ص ص ۴۳ ۔ ۴۲) میں بھی شاہ میرزا خاں آزاد کو عشرت و فضل احمد کیف کا شاگرد قرار دیا گیا ہے ۔ (کاظم علی خاں) ۔ ٦۴ تقویم یک صد و دو سالہ ۔ مطبع منشی نول کشور ، لکھنؤ ۱۸٦۵ع ۔ ٦۵ گلدستۂ شعراء ، لکھنؤ جلد ۱ ۔ نمبر ۱۵ ۔ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۸٦۰ع ص ۱۵ ۔ ٦٦ بحوالۂ سلطان عالم واجد علی شاہ ص ۲۲۵ ۔

٦۷ انشاے راحت روح ۔ مطبع حسینی اثناعشری، لکھنؤ ۱۲۸۷ھ [بحوالۂ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب] . ٦۸ بحوالۂ سلطان عالم واجد علی شاہ ۔ ص ص ۲۲٦ ۔ ۲۲۵ ۔ ٦۹ ایضاً ص ص ۲۲٦ ۔ ۲۳۵ ۔ ۷۰ اردو مثنوی شمالی ہند میں ڈاکٹر گیان چند جین ص ۵۷۰ ۔ ۷۱ ایضاً ص ۵٦۹ ۔ ۷۲ «مثنوی ممتاز» کے مخطوطۂ خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے بارے میں یہ امور بہ حوالۂ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب پیش کیے جاتے ہیں ۔ (کاظم علی خان) ۷۳ اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۵٦۹ ۔ ۷۴ بحوالۂ سلطان عالم واجد علی شاہ ص ۲۳۵۔

۷۵ ڈاکٹر گیان چند جین : اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ص ۵۷۱ ۔ ۵۷۰ ۔ ۷٦ بحوالۂ سید مسعود حسن رضوی ادیب : سلطان عالم واجد علی شاہ ص ۲۲۵ ۔

۷۷ بیگمات اودھ طبع لکھنو ۱۹۵٦ع ۔

•

مبصرین

ڈاکٹر عصمت جاوید

ڈاکٹر خورشید نعمانی رودلوی

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

ڈاکٹر عصمت جاوید

نیا ادب نئے مسائل

بشر نواز اردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ نئی اردو شاعری جہاں بھی زیر بحث آتی ہے، اس کے نمایاں اور نمائندہ رجحانات کی نشاندہی کے سلسلے میں جن نئے شاعروں کے کلام سے حوالے دیے جاتے ہیں، ان کی فہرست میں بشر نواز کا نام بھی اکثر دکھائی دیتا ہے۔ بشر نواز مقرر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ان کی نثر نگاری تنقید تک محدود ہے۔ انہوں نے نئی شاعری اور خود اپنے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کا شمار اردو کے نقاد شاعروں میں کیا جاسکتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "نیا ادب نئے مسائل" پیش نظر ہے۔ نئی شاعری سے متعلق بعض حلقوں میں آج بھی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انہیں دور کرنے کے سلسلے میں مضامین کی کمی کی شدت اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس سمت میں بشر نواز کا یہ اقدام سراہنے کے قابل ہے۔ اس مجموعے میں کل چار مضامین ہیں اور ان سبھوں کا تعلق نئے ادب سے ہے۔ پہلا مضمون "عصری ادب اور میری پہچان ہے" اور جیسا کہ فٹ نوٹ میں مصنف نے خود بتایا ہے، ادارۂ شب خون نے اسی عنوان کے تحت ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مضمون کے چند ابتدائی صفحات میں مصنف نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ شاعری آخر کیوں پڑھی جانے اور وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ شاعری "(۱) شخصی اظہار کا ذریعہ ہے اور (۲) شاعری میں محض ہیئت اہم ہے نہ محض دوصنف اور اس طرح گھوم پھر کر شاعری کے بارے میں جو باتیں بتائی گئی ہیں ان کا اطلاق صرف شاعری پر نہیں بلکہ فن پر بحیثیت مجموعی ہوتا ہے اور ان خصوصیات پر روشنی نہیں پڑتی جو شاعری کو ادب سے اور دیگر فنون لطیفہ سے الگ کرتی ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ان باتوں کا موضوع زیر بحث سے کوئی تعلق بھی نہیں لیکن اس سلسلے میں انہوں نے فن میں ہیئت اور موضوع کے توازن اور ان کی نامیاتی وحدت سے متعلق جو بحث کی ہے وہ اس مضمون کی جان ہے بشر نواز شاعری میں

سلامت روی کے قائل ہیں۔ وہ ادب میں نہ تو خالص ہیئت پرستی کو اہمیت دیتے ہیں اور نہ موضوع کو۔ ان کی یہ میانہ روی تھی ادب کو افراط تفریط سے بچا سکتی ہے۔ لیکن بعض مقامات پر ان کا تجزیہ بڑا سطحی نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں «۱۹۲۰ء کے لگ بھگ مغرب کی مشینی زندگی سے پیدا شدہ ہنگاموں اور افراتفری کے ردعمل کے طور پر زندگی اور خصوصاً آرٹ میں تنظیم، سجاوٹ رکھ رکھاؤ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔» یہ مغرب کے رجحانات کا نہ صرف سرسری بلکہ بڑا گمراہ کن تجزیہ ہے۔ آرٹ میں تنظیم اور رکھ رکھاؤ تو کجا، نمائندہ آرٹ کی ایسی خصوصیات کے خلاف شدید رد و عمل یورپ میں اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل ہی میں شروع ہو چکا تھا جس کی بھرپور نمائندگی ایزرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ نے کی تھی۔ اس لیے ایزرا پاؤنڈ اور ایلیٹ کو فن میں مخصوص ترتیب و تنظیم، آرائش و زیبائش، سجاوٹ اور رکھ رکھاؤ کا مبلغ سمجھنا حیرت ناک اور اس سے بھی حیرت ناک یہ خیال ہے کہ ایلیٹ اور پاؤنڈ کے پرستار اردو میں ناسخ رند و صبا احمد وزیر و مدن کی ناز دریافت کرنے تو شاید کوئی بات بنتی۔ ایلیٹ اور پاؤنڈ کو ناسخ و امیر کے سلسلے کی کڑی سمجھنا ایسی بات ہے جو مشکل ہی سے حلق سے اتر سکتی ہے۔ بشر نواز نے پیکر کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ «ہر لفظ ایک پیکر کے کسی نہ کسی شے کا اشاریہ ہے اور شے کی کوئی نہ کوئی شکل ہوتی ہے تو یہ بات بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے الفاظ معنوی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں اور ساختی نوعیت کے بھی۔

اگر لفظ سے مراد صرف اسم، صفت اور فعل لیں تو اس صورت میں بھی اسم عام اور اسم ذات تصور (Concept) کے اشاریہ ہوتے ہیں اور تصور پیکر کی عین ضد ہے۔ لفظوں کے پیکر تو مخصوص صوتی اور جذباتی ماحول میں بنتے ہیں ہر حال میں نہیں۔ صرف «درخت» یا «آدمی» کہہ دینے سے اس کے مفہوم کا ادراک تو ہوتا ہے لیکن اس سے ذہن میں کوئی پیکر نہیں بنتا بشر نواز نے یہ ثابت کرنے پر کافی زور قلم صرف کیا ہے کہ نیا شاعر وہ ہے جو شعری حسیت کے اظہار میں آزاد ہوتا ہے لیکن یہ وہ خصوصیت ہے جو ہمیں بندھے ٹکے مضامین کے سلسلے میں روایتی شاعروں کے یہاں بھی اور خود ترقی پسند شاعری میں بھی ملتی ہے۔ سردار جعفری اور فیض کے درمیان بھی ہمیں طے شدہ مضامین کے سلسلے [illegible] کا یہ فرق نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ [illegible] میں تو ایسا [illegible] تک [illegible] نہیں پاتے مثلاً

محمد علوی کے ان اشعار

ننھی منی چڑیا نے
توپ کے دہانے میں
گھونسلہ بنایا ہے

کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔" توپ کو توپ جان کر اس کے دہانے کو اپنا آشیانہ بنانا بڑے دل گردے کا کام ہے " میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان اشعار کے بنیادی موڈ ہی کو Miss کر گئے ہیں۔ ان اشعار میں تو ننھی منی چڑیا کی معصومیت کو ابھارا گیا ہے جو بیچاری یہ بھی نہیں جانتی کہ جس جگہ کو اس نے اپنا گھونسلہ بنانے کے لئے منتخب کیا ہے وہ توپ کا دہانہ ہے۔ یہی ان اشعار کی جان ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا مضمون "کچھ جدید شاعری کے بارے میں" نئی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی مدد دیتا ہے انہوں نے جدید شاعری کے مخالفین کے غیر مخلصانہ رویے، ہوس شہرت کا شکار فیشن پرستوں اور گروپ بندی کو نئی شاعری کے حق میں تین بڑے خطرے قرار دیا ہے ان حالات میں وہ چاہتے ہیں کہ ادب کا ہر مخلص طالب علم (۱) جدید شاعری کا فنی و جمالیاتی معیار قائم کرنے کی کوشش کرے (۲) ناکام روایتی شاعری اور جدید شاعری کے فرق کو محسوس کرے اور (۳) ابہام اور اہمال کے درمیان حد فاصل قائم کرے انہوں نے نئی شاعری کے لیے فنی و جمالیاتی معیار کی ضرورت پر جو زور دیا ہے، اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو ان کا کہنا بالکل صحیح ہے کہ مجرد لفظ بذات خود کم از کم شاعری میں اہم نہیں ہوتا۔ اس کا محل استعمال سے مناسب یا غیر مناسب یا حسین اور بد صورت بنادیتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے موقف کی تائید میں نشر نواز عام نوش کا شکار ہوتے ہوئے کریہہ بصورت (کریہہ صورت) اور عرف عام میں غیر شاعرانہ الفاظ کی ذہن میں ایک فہرست تیار کر لیتے ہیں اور مثالیں دے دے کر بتاتے ہیں کہ دیکھئے کس طرح یہ کذحب لفظ فلاں شاعر کے کلام میں سڈول بن گیا پھر جب وہ اپنے نقطۂ نظر سے ایک کمزور شعر[1] کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہی پرانے حربے استعمال کرتے ہیں جو قدیم اور روایتی نقاد کرتا چلا آرہا ہے یعنی کمبخت کا تعلق زمانے سے نہیں ہوا ہے لیکن مصرعے کی ساخت نے اسے زمانے سے متعلق کردیا (پرانا نقاد کہتا اس میں تنقید ہے) وہ کہتے ہیں جائے اسے یا اس کو کا محل استعمال تھا (حالانکہ قواعد کی رو سے یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہوا وہ "ہی لے گئی" اتنا ہی صحیح ہے جتنا "ہوا اس کو بھی لے گئی"۔ یہاں Dative "کو" کا استعمال

اختیاری ہے جیسے میں نے بمبئی دیکھی۔ بمبئی کو دیکھا۔ اسی طرح ذیل کے شعر پر ان کا اعتراض بھی رنگ قدیم میں ہے :

اسی بستی کے کھاؤنگا فریب اور		اسی بستی پہ ہے کچھ کچھ یقین بھی

لکھتے ہیں، پہلے مصرعے کا "فریب اور" قابل غور ہے۔ اگر ہم اس شعر کو واقعی پڑھنا چاہیں تو ہمیں "فریب ار" پڑھنا ہوگا۔ قطع نظر اس کے یہ اعتراض قدیم رنگ میں ہے، پرانا نقاد اس کے جواب میں کہیگا اردو عروض میں "اور" بروزن فاع ابھی مستعمل ہے اور بروزن فع بھی۔ لیکن مذکورۂ بالا مصرعے میں چونکہ "اور" کا الف ہمزۃ الوصل ہے اس لیے "فریب اور" کو "فریبور" پڑھنا جائز ہے، اس طرح مذکورۂ بالا مصرعے میں "اور" کا تلفظ بروزن فاع بھی ہے " بے شک شعر وہ بھی کمبخت .. الخ کمزور شعر ہے لیکن ان اسباب کی بنا پر نہیں جن کا ذکر مصنف نے کیا ہے اس جزوی اختلاف سے قطع نظر مضمون مجموعی حیثیت سے پایے کی چیز ہے اور مصنف کے اس دعوے کو ہر کوئی تسلیم کریگا کہ " پوری کی پوری جدید شاعری شوق فضول کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اکثر صورتوں میں وہ ناگزیر ہے البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں بھی کمزور نمونے اور ناکام تجربے ملتے ہیں۔"

اپنے تیسرے مضمون "عمل تنقید اور نظم جدید" میں مصنف نے نئی شاعری سے متعلق عمل تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں لیکن بعض مقامات پر جن نظموں کا انتخاب اس مقصد کے لیے کیا گیا ہے ان کے بارے میں شک ہوتا ہے کہ وہ واقعی اچھی نظمیں ہیں مثلاً عمیق حنفی کی نظم "چلتا چلتا مداہ چلتا" اور کمار پاشی کی نظم "آئینہ خانے میں" وضاحتی نوعیت کی کمزور اور بیانیہ نظمیں ہیں انہوں نے بعض نظموں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے وزیر آغا کی نہایت عمدہ نظم "سات" کا مقابلہ قاضی سلیم کی اتنی ہی عمدہ نظم "واٹرس" سے کرتے ہوئے مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وزیر آغا غیر مرئی کو بھی مرئی شکل میں دیکھتے ہیں جبکہ قاضی سلیم کا ذہنی سفر مرئی سے غیر مرئی کی طرف ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر آغا کی نظم تمثیلی نوعیت کی ہے اس کے برعکس قاضی سلیم کی نظم زیادہ Complex ہے لیکن قاضی سلیم نے بھی اس نظم میں جابجا حسی پیکروں سے کام لیا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ مصرعے :

زباں پہ یہ کسیلا پن کہاں سے آگیا
ہمارے خواب ٹوٹ ٹوٹ کر لہو میں بہہ گئے

رگوں میں جیسے بددعائیں ٹوٹی ہوں پھانس کی طرح
ہم ہوا کی فوج موج سے
درد کھینچتے ہیں چھوڑتے ہیں سانس کی طرح
دیو علم کے چراغ کا دھواں دھواں بکھر گیا

ان چراغوں میں غیر مرئی اذیت اور دردناکی کو حسی پیکروں کے زریعے بھرپور انداز میں ابھارنے کی کوشش کی گو ہے مصنف کا اپنے دعوے کے جواز میں صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ « شاعر کے نزدیک (وائرس) اہم نہیں بلکہ اس سے پیدا شدہ اثرات ہی سب کچھ ہوں ۔ »

چوتھے آخری مضمون میں « نئی غزل » کا جائزہ لیا گیا ہے بشر نواز اردو غزل کی توانا روایات سے اچھی طرح واقف ہیں اور عصری آگہی کے اظہار میں ان کو غزلوں میں ان روایات کا احترام بھی پایا جاتا ہے ۔ ایک نقاد کی حیثیت سے ان کی نظر کلاسیکی غزل پر بھی ہے اور اس کے اسلوبیاتی ارتقاء پر بھی ۔ اس مضمون میں انہوں نے پاکستانی غزل کا تجزیہ بھی شامل کیا ہے پاکستانی غزل میں کیے جانے والے مختلف اسلوبیاتی تجربوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ « پاکستان میں ذہنی روایت الگ بنانے کی کوشش نے افتخار جالب ، جیلانی کامران ، ظفر اقبال وغیرہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے موجودہ طرز اظہار کو اپنائیں » بحیثیت مجموعی نئی غزل کا جائزہ بڑی حد تک کامیاب ہے ۔

مختصر یہ کہ « نئے ادب نئے مسائل » کا مطالعہ نئی شاعری کے ہر طالب علم کے لیے ناگزیر ہے ۔ ان کی تحریر بھی اتنی سلجھی ہوئی ہے جتنی ان کی فکر ۔ ان کی تحریروں میں کہیں بھی وہ ژولیدہ بیانی نہیں ہے جو فکر پر ڈھیلی گرفت سے پیدا ہوتی ہے اور نہ انہوں نے کہیں ادبی مسائل کو اصطلاح بازی کے چکر میں الجھاوے دینے کی کوشش کی ہے ۔ انہوں نے معاصر شاعری کی تحسین شناسی میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے اپنے ہم عصر شعرا کے کلام سے حوالے دیے ہیں اور کہیں بھی اپنی ذات کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اس کتاب کے مطالعے سے نئی شاعری کے موجودہ اور آنے والے نقاد بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں

● ● ●

نیا ادب نئے مسائل از بشر نواز
امیج پبلیکیشنز ، اورنگ آباد
قیمت : [illegible]

ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی

چشم حیراں

مزاح فطرت انسانی کا خاصہ ہے ہر انسان میں بقدر پیمانہ تخیل حس مزاح کا ہونا لازمی ہے۔ مزاح کی مختلف ڈگریاں ہوتی ہیں مثلاً کثیف و لطیف وغیرہ۔ بہتر مزاح کو جنس لطیف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مزاح نگار کی خوبی یہی ہے کہ وہ ذاتی تنقید سے بالاتر ہوکر سماج، معاشرہ، سیاست و ماحول کو اپنا موضوع بنائے اس سطح پر پہنچ کر مزاح طنز میں تبدیل ہوجاتا ہے اور مزاح نگار وکالت سے گریز کرتے ہوئے انسانی ماحول کا بہترین نقاد بن جاتا ہے بقول رشید احمد صدیقی طنز کا مقصد تلقین حقیقت ہوتا ہے حقیقت بلاشبہ ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ اس تلخی کو ایسے الفاظ میں بیان کرنا کہ اس شخص اور سماج کو تو کم نقصان پہنچے لیکن غیر شعوری طور پر اس کی اصلاح ہوجائے کہ جس پر وار کیا گیا ہے۔ حقیقی طنز ہے۔

احمد جمال پاشاہ کے مضامین قول مندرجہ بالا پر پورے اترتے ہیں۔ ان کا نام ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ایک معتبر نام رہا ہے۔ وہ ایک پختہ نگار ادیب، منجھے ہوئے صحافی اچھے کالم نویس، ایک مستند پروفیسر اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان ہیں۔ وہ ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں "رستم میدان امتحان میں" ہائے کی پیاری مارشل لاء، کتے کا خط پطرس کے نام جیسے مضامین سے دنیائے طنز و مزاح میں ایک دھوم مچا چکے ہیں ادھر ایک عرصے سے غالباً "عروس روزگار کی تلاش" کے سبب وہ کچھ خاموش سے تھے اس سے اردو ادب کے شائقین میں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ تاریخ ادب اردو میں اپنے نام کے اندراج کے بعد غالباً وہ اپنی دکان بڑھا گئے لیکن "چشم حیراں" کی آمد سے یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

"چشم حیراں" احمد جمال پاشاہ صاحب کے چوبیس طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے یہی عنوان ان کی کتاب کا دیباچہ بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں، بقول تین بندروں کے نہ دیکھو برا، نہ سنو برا، نہ کہو برا یعنی آنکھیں، کان، منھ سب بند

لک لک دیدم، دم نہ کشیدم

یقین جانیے دور وہ آنکھوں سے کام لوں تو سلائی پھر جائے، سننے پہ آؤں تو سماعت زائل ہوجائے، منہ کھولوں تو بند ہوجاؤں پھر بھی

عکتہ دیدنی ، گفتنی ہے گر کچھ سمجھ یا سمجھا سکتا ہوں تو یہ کہ برے کو دیکھوں یا اچھے کو ، حیرانی نہیں جاتی کہ سب دھان بائیس پیری کے ۔ کیا امیر کیا غریب ، کیا پارسا کیا کیا شیطان ، عالم ہوں یا اسمگلر تا قد ہوں یا ڈنڈی مار ، دانشور ہوں یا رجعت پرست ، سیاست داں ہوں یا جرائم پیشہ ، امتیاز ناممکن کردار ، قول و فعل عمل ، مثل اعمال ندارد ، جس سال کے تاجر وہی مال ندارد ، سب خلق کے لئے باعث پریشانی ،

احمد جمال پاشاہ کے یہ مضامین جو قاری کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں توان کا تنوع و رنگا رنگی ہے کچھ مضامین کے عنوانات ملاحظہ ہوں ۔

کرسی ، سڑک کے گڑھوں سے انٹرویو ، زہر کے سوداگر ، جوتا کانفرنس حالات قابو میں ہیں ، ہم نے ریسرچ کی ، بھوندو میاں ، مسٹر گومو ٹومو سے انٹرویو وزیر قحط اور ڈھل مل بھائی وغیرہ (افسوس کے طوالت کے خوف سے ان کے اقتباسات نہیں دئیے جاسکتے ہیں)

کتاب کا نام سمبالک ہے بقول پاشا «حیرانی وجہ پریشانی ، حس کا اظہار کہیں طنز و مزاح کے پردے میں ۔ کہیں تحریف ، خاکے یا خیال آرائی کے پیرائے میں کیا گیا ہے ۔ گاہے ڈھکے چھپے ، گاہے کھلم کھلا »

کتاب میں کرداروں کے نام کا انتخاب مثلاً کھوٹومل ، بھوندومل ، ڈھل مل بھائی مسٹر گومو ٹومو ، مسٹر ہاں ہاں وغیرہ بھی ایسے ہیں جن سے سرمایہ داری ، اسمگلنگ ، بلیک مارکیٹنگ ، یس مین ، زمانہ سازی و معاشی استحصال کی بو آتی ہے ۔

اچھے طنز و مزاح نگار کی پہچان یہی ہے کہ وہ حساس دل کا مالک ہو آزاد قلم رکھتا ہو اور اسکی چشم ظاہر و باطن دونوں واہوں اس کا مشاہدہ وسیع ہو اور وسعت کونین اس پر محیط ہو ۔ خوشی کی بات ہے کہ پاشا کا طنز اپنے زمانہ کی زندگی کا آئینہ دار ہے اور یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی تاثیر آنے والے کل تک قائم رہیگی ۔

آخر میں بے خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ « چشم حیراں » اسم بامسمیٰ ہے اور اردو کے طربیہ و مزاحیہ ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے ۔

● ● ●

چشم حیراں از احمد جمال پاشا

نئی آواز ۔۔ جامعہ نگر ، نئی دہلی

قیمت : سات روپئے پچاس پیسے

ڈاکٹر حامداللہ ندوی

چک بست اور باقیات چک بست

ہندوستان کی تحریک آزادی نے انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں اردو زبان کو جو حساس ذہین، اور فعال ادیب و شاعر عطا کئے ان میں پنڈت برج نرائن چک بست کا نام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چوالیس سال کے ایک مختصر سے عرصۂ حیات میں انہوں نے علمی، ادبی اور سماجی محاذوں پر جو کارنامے انجام دیے وہ بہت کم کسی اور کے حصے میں آئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ ایک مدت تک ان کی نظموں کا مجموعہ صبح وطن اور ان کے مضامین کا مجموعہ مضامین چک بست تھا اور خود چک بست پر نسیونگ دہلی کے چک بست نمبر کے علاوہ شاید کچھ اور شائع نہیں ہوا۔ جب سنہ ۱۹۷۵ع میں ڈاکٹر افضال احمد کی کتاب "چک بست۔ حیات اور ادبی خدمات" منظر عام پر آئی اور سنہ ۱۹۷۷ع فروغ اردو لکھنؤ نے چک بست نمبر شائع کیا تو پھر کسی حد تک اس کمی کی تلافی ہو گئی

لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ادیب اور محقق اپنی ساری تلاش و جستجو کے بعد اپنا جو کچھ حاصل مطالعہ پیش کرتا ہے وہ حرف آخر نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں کوئی نہ کوئی کسر باقی رہ ہی جاتی ہے اسی لئے تحقیق کے میدان میں ہمیشہ ایک مستقل اور مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب کہیں جاکر کسی تحقیق کا حق ادا ہو پاتا ہے۔ اور اپنا مطلوبہ موضوع ہر طرح روشن اور واضح ہوکر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر افضال احمد اور فروغ اردو کے بعد اب اردو کے جانے پہچانے ادیب اور محقق کالیداس گپتا رضا نے چک بست کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس سے پہلے ہی ان کی پہلی کتاب "چک بست اور باقیات چک بست" چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔ اپنے پیش لفظ میں انہوں نے لکھا ہے۔

« سنہ ۱۹۷۳ء میں جب کہ چکبست کے انتقال کو سینتالیس برس ہورہے تھے میں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ان پر کچھ ایسا کام کیا جائے جو اس بلند و بالا شخصیت کے ہر پہلو پر حاوی ہو ۔

مگر میں ابھی حیات چکبست سب ہی کے بکھرے تار و پود سمیٹ رہا تھا کہ سنہ ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر افضال احمد کی کتاب « چکبست ۔ حیات اور ادبی خدمات » شائع ہوگئی ۔ چنانچہ مجھے اپنے پلان پر نظر ثانی کرنی پڑی اس مناسبت سے کہ زیر نظر کتاب میں حیات چکبست کے چند ایسے گوشے شامل ہیں جو یا تو « چکبست ۔ حیات اور ادبی خدمات » میں ہیں ہی نہیں یا کم روشن ہیں اور اس سبب سے کہ چکبست کے باقیات نظم و نثر وافر تعداد میں لئے گئے ہیں میں نے پہلی کتاب حیات چکبست کو « چکبست اور باقیات چکبست » کا نام دیدیا ہے ۔ چکبست کے نظم و نثر کی لوہ ہنوز جاری ہے ۔

چکبست کے سلسلے میں اپنی پہلی کتاب « چکبست اور باقیات چکبست » کو فاضل مولف نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ، پہلا حصہ ذکر چکبست پر مشتمل ہے اور اس میں ان کے حالات زندگی کے علاوہ ان کی ادبی خدمات پر بزرگوں کی رائیں ، خود چکبست کے ان کے اپنے منعقدکردہ مشاعروں کی تفصیلات اور گلزار نسیم کے بارے میں چکبست و شرر کے معرکوں کا تذکرہ ہے ۔ دوسرا حصہ باقیات چکبست پر مشتمل ہے اوراس میں چکبست کی نظم و نثر کا وہ سرمایہ ہے جو انہوں نے اودھ پنچ ، اردوئے معلی ، صبح امید لکھنؤ ، مرقع لکھنؤ زمانہ کانپور اور بعض دوسرے نایاب پرچوں سے جمع کیا ہے ۔ تیسرا حصہ کتابیات اور اشاریہ پرمشتمل ہے ۔

نام اجنبی نہیں رہا بلکہ سب کے لئے جانا پہچانا ہے ۔ امید ہے کہ رضا کی « چکبست اور باقیات چکبست » کی اردو دنیا میں اچھی پذیرائی ہوگی ۔

• • •

چکبست اور باقیات چکبست مرتبہ کالیداس گپتا رضا

وِمل پبلی کیشنز ، بمبئی ۲۰

قیمت ۔ چالیس روپیے
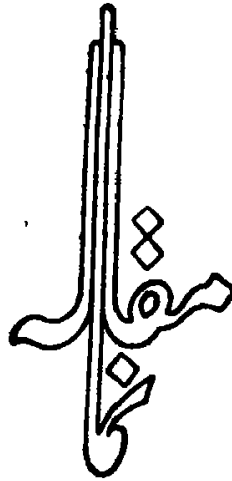
معاونین

ڈاکٹر خورشید الحق نعمانی ردولوی

جمال خیرگل

ندیم نعمانی

مذہبیات

مولانا نظام الدین اسیر
عقیدہ توحید اور اس کے عملی تقاضے
البلاغ، بمبئی، جنوری ۷۹ع، ص ۱۴ تا ۲۰ قسط ۲
فروری ۷۹ع، ص ۲۱ تا ۲۹ قسط ۳
مسئلہ توحید و عقید کے تعلق سے بحث ہے۔

محمد اشرف
اسلامی فنون لطیفہ، ولید بن عبدالملک کے عہد میں
البلاغ، بمبئی، جنوری ۷۹ع ص ۲۱ تا ۳۱
مسجد نبوی، جامع ولید، قصر عمرہ، قصر خربہ خال، قصر خزانہ، حمام الفرح اور قصر طوبیٰ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن اعظمی
فہرست مخطوطات عربیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور
معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۷۹ع
ص ۲۹۹ تا ۳۱۷
«باب التقریظ والانتقاد» کے عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار نے فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی کا جائزہ لیا ہے اور چند باتیں جو ان کے ذہن میں آئی ہیں اس کے مرتب کو
کی
مذمت میں پیش کئے ہیں۔

محمد افتخار الدین
اسلامی نظام معیشت
برہان، دہلی، مارچ ۷۹ع ص ۱۳۴ تا ۱۴۱
اسلامی نظام معیشت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اس میں مشترکہ سرمایہ کمپنیوں اور شراکتوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

مولوی نور الحسن راشد
حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے کچھ غیر مطبوعہ فتاویٰ اور ایک دستاویز
معارف، اعظم گڑھ، جون ۷۹ع
ص ۴۳۴ تا ۴۳۶
اس مضمون میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے دو غیر مطبوعہ فتاویٰ اور شاہ صاحب کی مہر اور تحریر سے مزین ایک دستاویز کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمن
امیر خسرو اور افضل الفوائد
معارف، اعظم گڑھ،
اپریل ۷۹ع، ص ۲۴۵ تا ۲۶۰
مئی ۷۹ع، ص ۳۴۶ تا ۳۶۲
امیر خسرو نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا رح کے کچھ ملفوظات افضل الفوائد کے نام سے جمع کئے تھے مگر بعض محققین نے اس حقیقت سے انکار کر کے اس بات کو تقویت دی کہ خسرو نے اسے خود ہی مرتب کیا ہے بلکہ ان کے نام سے اسے موسوم کر دیا گیا ہے اس مضمون میں مضمون نگار نے یہ بات ثابت کی ہے کہ امیر خسرو ہی اس کتاب کے اصل مصنف ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی
اقبال اور نئی دنیا
معارف، اعظم گڑھ، فروری ۷۹ع

ص ۱۱۸ تا ۱۳۶

اس مضمون میں اقبال کی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال اپنی دنیا میں ختم رسالت کو انسانی فکر کی آزادی کا سب سے بڑا پروانہ سمجھتے ہیں جو قدرت کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انسان کامل کا سب سے بڑا نمونہ ہیں نئی دنیا پیغامبر اور قائد قرار دیتے ہیں۔

سید جلال الدین عمری
اسلام اور سامان تعیش
برہان ، دہلی
فروری ۷۹ع ، ص ۶۹ تا ۸۱ قسط ۴
مئی ۷۹ع ، ص ۲۸۵ تا ۲۹۱ قسط ۵

اس مسلسل مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام نے تعیشات پر قانونی بندش تونہیں لگائی گئیں ان کا زیادہ استعمال ناپسندیدہ ضرور ہے۔

محمد ابرار حسین فاروقی
المسجد الاقصیٰ (بیت المقدس)
البلاغ ، بمبئی ، جنوری ۷۹ع ، ص ۳۲ تا ۴۲
مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی تفصیل درج ہے۔

محمد معین فاروقی ڈاکٹر
نئی دینی تعلیم
معارف ، اعظم گڑھ ، جنوری ۷۹ع
ص ۲۴ تا ۳۵

اس مضمون میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہیں
(۱) نئے طریقے سے اسلام کے لئے جدوجہد کی جائے اور ایک ایسا ادب پیدا کیا جائے جو علمی ذہن کو مطمئن کردے۔
(۲) اسلام پر پھر سے ایمان لایا جائے

مولانا تقی سیاح الدین صاحب کاکاخیل
اسلامی قانون کی تدوین جدید کے اصول اور طریقہ
الفرقان ، لکھنؤ ، مئی ۷۹ع ، ص ۱۹ تا ۳۴

اس مضمون میں اسلامی قانون کی تدوین جدید کے اصول بیان کئے گئے ہیں اور طریقے بتائے گئے ہیں جو کہ اختیار کئے جائیں۔

شیخ حبیب اللہ
کلام اقبال کی تشریحات گمراہ کن
ماہنامہ فروغ اردو ، لکھنؤ ، جلد ۲۶
شمارہ ۱ ، مئی ۷۹ع ، ص ۵ تا ۱۰

کلام اقبال ساری دنیا کے لئے ہے مگر لوگ انہیں اسلامی شاعر ثابت کرنے پر مصر ہیں اقبال پر جتنی بھی کتابیں لکھی جاتی ہیں ملایانہ طرز کی ہوتی ہیں ۔ علامہ نے عربی فارسی اصطلاحات برائے ابلاغ مضمون استعمال کی تھیں انہیں تفسیر معنی پہنانا ان پر ظلم صریح ہے۔

رفیع احمد بستوی
کیا علماء انگریزی کے مخالف تھے؟
برہان ، دہلی ، اپریل ۷۹ع ، ص ۲۱۲ تا ۲۲۸
مئی ۷۹ع ، ص ۲۶۵ تا ۲۸۲

یہ ثابت کیا ہے کہ علماء انگریزی کے مخالف نہ تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم ان کے لئے مفید ہے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی
خاندان نبوی پر زکوٰۃ کی حرمت
الفرقان، لکھنؤ، مئی ۷۹ء، ص ۳۷ تا ۴۳
جون ۷۹ء، ص ۴۰ تا ۴۴

یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضرت زکوٰۃ کے سلسلے میں اپنے خاندان کے افراد کے لئے راہ عزیمت پسند کی اور احتیاج و فقر کی حالت پر بھی ان کو "اوساخ الناس" سے منع کیا اور دوسری مصلحت یہ تھی کہ مخالفین کو اعتراض کا موقع ملتا اگر آنحضرت ان صدقات کو اپنے خاندان کے افراد کے لئے جائز قرار دیتے

سید احتشام الدین ندوی
الفخری کا تنقیدی مطالعہ
برہان، دہلی، فروری ۷۹ء
ص ۱۱۰ تا ۱۱۹

الفخری کا شمار اسلام کی مستند تاریخوں میں ہے۔ مضمون نگار نے الفخری کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے اس کے مصنف محمد نبی بن علی بن طاطبا کے بارے میں بھی اپنی رائے دی ہے۔

سید سلیمان ندوی
امت مسلمہ کی بعثت
معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۷۹ء
ص ۵ تا ۲۳

اس حقیقت کا ذکر کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امت محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی۔

محمد منصور نعمانی ندوی
گجرات کے ایک نامور محدث و مورخ
معارف، اعظم گڑھ، جون ۷۹ء
ص ۴۳۷ تا ۴۵۰

اس مضمون میں نامور محدث و مورخ جناب عبدالقادر، ابوبکر کنیت اور محی الدین لقب سے جانے جاتے ہیں کا ذکر کیا گیا ہو۔ وہ مسلک کے اعتبار سے شافعی اور سلسلہ تصوف کے لحاظ سے عید روسی تھے۔

محمد منظور نعمانی
بابا رتن الہندی
الفرقان، لکھنؤ
جنوری ۷۹ء، ص ۳۹ تا ۴۸
فروری ۷۹ء، ص ۴۰ تا ۴۸

یہ مضمون الفرقان کے ماہ نومبر ۷۸ء کے شمارے میں بابا رتن الہندی سے متعلق مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار نے اس بات کی تردید کی ہے کہ بابا رتن صحابی رسول تھے اور تین مرتبہ ملک حجاز جاکر آنحضور سے ملاقات کی تھی اور مشرف بہ اسلام ہوئے تھے

مولانا عبدالسلام قدوائی
فقیہ ابوالعماد شبلی
معارف، اعظم گڑھ، مارچ ۷۹ء
ص ۲۱۲ تا ۲۳۸

فقیہ ابوالعماد شبلی کی علمی صلاحیت، مروجہ علوم پر دسترس اور فقہ و اصول میں ان کی متبحر نظر کا ذکر کرتے ہوئے

یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو وہ شہرت حاصل نہو سکی جس کے وہ مستحق تھے، ان کے حالات زندگی اور علمی وادبی خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

شخصیات

محمد ارشاد اعظمی
"یار اہل چشت"
شیخ عبدالعزیز جونپوری رح
برہان، دہلی، جون ۷۹ع، ص ۲۵۰ تا ۲۶۹
شیخ عبدالعزیز جونپوری کے خاندانی حالات، ولادت وطفولیت، تعلیم وتربیت وکمالات وغیرہ کا جائزہ لیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
سیرت ابراہیم بن ادہم اور ان کے مدفن کی تحقیق
الفرقان، لکھنؤ، اپریل ۷۹ع، ص ۱۶ تا ۲۴
حضرت ابراہیم بن ادہم کی سیرت اور ان کے مدفن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شہر خیلہ میں ہے۔

افتخار امام صدیقی
تین افسانہ نگاروں سے ایک ملاقات
شاعر، بمبئی، اپریل ۷۹ع
ص ۱۴ تا ۱۸ و ص ۶۷ تا ۷۴
سلام بن رزاق، انور خان اور انور قمر کی ایک گفتگو جن سے تینوں کے حالات زندگی اور فن کے متعلق معلومات بہم ہوتی ہیں، اس کی ترتیب افتخار امام صدیقی نے کی ہے۔

سید محمد فاروق بخاری
حالات حضرت شیخ نجم الدین رح کبری
برہان، دہلی، مئی ۷۹، ص ۲۹۲ تا ۳۰۵
جون ۷۹ع، ص ۳۳۶ تا ۳۴۹
حضرت شیخ نجم الدین کبری کے حالات زندگی بیان کئے ہیں اور تصنیفات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی
ایک عہد آفرین شخصیت مولانا سید جعفر علی بستوی
برہان، دہلی، جون ۷۹ع، ص ۳۲۵ تا ۳۳۵
مولانا سید جعفر علی بستوی کے خاندانی حالات، ولادت و تعلیم و تربیت وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

شیخ نذیر حسین
مولانا عبدالعزیز میمن ـ چند یادیں
معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۷۹ع ص ۴۷
۵۷ "وفیات" کے عنوان کے تحت مولانا عبدالعزیز میمن کے حالات زندگی اور تصانیف کا جائزہ لیا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین
معارف، اعظم گڑھ، ماہ اپریل ۷۹ ع ص ۲۸۳ تا ۲۹۸ "وفیات" کے عنوان کے تحت ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم کی زندگی کے حالات و علمی و ادبی و ملی خدمات کا ذکر ذکر کیا ہے۔

ظفر الہدیٰ ترجمہ سلطان احمد جمالی
لودی اور مغل دور کا شاعر
معارف، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۷۹ ع ۹۳ تا
مارچ ۷۹ ع ۱۸۹ تا ۲۰۴

اپریل ۷۹ء ۲۶۱ تا ۲۷۳

اس میں حاصل مضمون میں مشہور فارسی شاعر حامد بن فضل اللہ جمالی کے حالات زندگی کا ذکر۔ اس کے شاعرانہ کارناموں کا جائزہ اور تصانیف کا بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر

شیخ عبدالرحمٰن چشتی

برہان۔ دہلی، مارچ ۷۹ء ص ۱۵۷ تا ۱۷۲

اپریل ۷۹ء ص ۱۹۷ تا ۲۱۱

مئی ۷۹ء ص ۲۶۱ تا ۲۷۴

شیخ عبدالرحمن چشتی کے حالات زندگی مسلک تصوف و روحانی فیضان کا ذکر کیا ہے۔

شبیر احمد خاں غوری

قاضی زادہ رومی مصنف شرح چغمنی

احوال و آثار

معارف، اعظم گڑھ،

مئی ۷۹ء ص ۳۲۵ تا ۳۳۵

جون ۷۹ء ص ۴۰۵ تا ۴۲۳

قاضی زادہ کا نام موسی اور لقب صلاح الدین تھا۔ اس مضمون میں "شرح چغمنی" اور اس کے فاضل مصنف کا ایک مختصر تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

خورشید احمد فاروق

سید مرتضی بلگرامی مولف تاج العروس

برہان، دہلی فروری ۷۹ء ص ۸۲ تا ۱۰۹

سید مرتضی بلگرامی کے حالات زندگی اور ان کی تالیف تاج العروس کا جائزہ لیا ہے۔

اطہر ریحان فلاحی

ابن جزار قیروانی

معارف، اعظم گڑھ،

جنوری ۱۹۷۹ء ص ۳۶ تا ۴۶

اس مضمون میں مستور مسلم طبیب ابن جزار قیروانی کے حالات زندگی اور اسکی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔

عبدالسلام قدوائی

ڈاکٹر سید عابد حسین

معارف، اعظم گڑھ،

جنوری ۷۹ء ص ۵۸ تا ۷۱

"وفیات" کے عنوان کے تحت ڈاکٹر سید عابد حسین کے حالات زندگی کا ذکر تصانیف علمی و ادبی مشاغل اور قومی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

عبدالسلام قدوائی

مولانا فضل اللہ مرحوم

معارف، اعظم گڑھ،

جون ۷۹ء ص ۴۷۰ تا ۴۷۴

مولانا فضل اللہ رحمانی کے حالات زندگی اور انکے علم و فضل، تقوی و طہارت کا مجمل ذکر کیا ہے۔

محمد حسن

اسلوب اور شخصیات

آجکل دہلی،

فروری ۷۹ء ص ۲۳ تا ۲۵

مضمون نگار کا خیال ہے کہ ہم کسی فنکار کے اسلوب سے اسکی شخصیت کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں اور اسکی انفرادی

شخصیت کا سراغ لگا سکتے ہیں ۔

ادب ، تنقید و لسانیات

ڈاکٹر سلیم اختر

ن م راشد کی تنقید کا نفسیاتی مزاج

شاعر بمبئی ۔ مئی ۷۹ ص ۸ تا ۱۰

اس مضمون میں ن م راشد کا بحیثیت نفسیاتی نقاد جائزہ لیا گیا ہے اور مضمون نگار کا خیال ہے کہ راشد کو بلاشبہ قدیم ترین نفسیاتی ناقدین میں شمار کیا جاسکتا ہے ۔

معین اعجاز

بنگالی زبان کا ایک البیلا شاعر ۔ جیوتا نند داس

ماہنامہ تحریک ، نئی دہلی

جلد ۲۶ ، شمارہ ۱۰ ۔ جنوری ۷۹ء ص ۲۶ ۔ ۲۹

جیوتا نند داس کی ذات میں ہمیں ایک باشعور شاعر ملتا ہے جو نہ صرف بنگال کی دیہی فضا سے واقف ہے بلکہ شہری زندگی اور روح عصر کی نبض کو بھی محسوس پہچانتا ہے وہ عظیم انسانی اور آفاقی قدروں کے مزاج داں تھے جذباتی شاعری میں بھی گہرے فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں ۔ علامتی شاعری اور امیجری میں بھی بنگال کی سوندھی مٹی اور دھان کے کھیتوں کی مہک ملتی ہے ۔ ٹیگور کے بعد وہ اس دور کے سب سے ممتاز شاعر تھے ۔ ۱۹ ع پیدا ہوئے اور ۱۹۵۴ ع میں کلکتہ میں ایک ٹرام کے نیچے کچل کر ہلاک ہوئے ۔

ڈاکٹر شبیب اعظمی

مخطوطات کے اختتامیے اور ان کے کاتب

برہان ۔ دہلی ، اپریل ۷۹ ع ص ۲۲۹ تا ۲۲۹

اس مضمون میں عہد جدید لکھی جانے والی کتابوں کے انداز ، مصنفوں اور کاتبوں کے نام اور دن کے دعائیہ کلمات کا ذکر ہے ان سے اس دور کی طرز تحریر اور رواجی اختتامیہ کا اندازہ ہوتا ہے ۔

اشفاق انجم

منشی عبدالکریم عطاء اور ان کا ایک مراٹھی مرثیہ

پندرہ روزہ قومی راج بمبئی

دسمبر ۷۸ع و جنوری ۷۹ع

جلد ۵ و ٦ ، شمارہ نمبر ۲۴ و ۱

علی الترتیب ، ص ۱۱ تا ۱۳

منشی عبدالکریم عطاء نے تمام عمر مرثیہ کے علاوہ کسی اور صنف سخن کی طرف توجہ نہیں کی مضمون نگار کے پاس ان کا قلمی نسخہ موجود ہے جس میں کل ۲۴ مرثیے شامل ہیں انہوں نے مراٹھی میں بھی صرف مرثیہ ہی لکھا جو اسی نسخے میں شامل ہے قلمی نسخے میں رسم الخط تو اردو ہے پر زبان مراٹھی مذکورہ مرثیہ کا تحریری عکس بھی دیا گیا ہے ۔

مرزا اکبر علی بیگ

عزیز مرزا ۔ حیات شخصیت اور کارنامے

آج کل ، دہلی ، مئی ۷۹ع ، ص ۳۲ تا ۳۵

عزیز مرزا کی سوانح نگاری ، انشا پردازی معلم قوم کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے ۔

مہدی جعفر

نئی افسانوی تقلیب

جواز ، مالیگاؤں ، جلد ۳ ، شمارہ ۸

جنوری، فروری، مارچ ۷۹ء، ص ۹ تا ۶۴
قسط ہذا میں غیاث احمدگدی ۔ اقبال متین
جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، اقبال مجید،
کلام حیدری، شرون کمار، رتن سنگھ،
قاضی عبدالستار، احمد یوسف، سریندر
پرکاش، بلراج مین را، محمد عمرمیمن،
عوض سعید، ظفراوگانوی، اکرام باگ،
شوکت حیات، قمراحسن، حمید سہروردی
مشفق انورخاں، سلام بن رزاق، حسین الحق
اور انور رشیدکے افسانوں کا تجزیہ کرتے
ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ افسانہ اپنی
قلب ماہیت کےلئے زمین دوز ہو کرداخلیت
اور انفرادیت کی بازیافت میں مہمک
رہا ہے۔ آج کی صورت حال سے اندازہ
ہوتا ہے کہ قلب ماہیت اپنے اختتامی دور
میں داخل ہوچکی ہے داخلیت کے طریق
کارکو مجموعی حیثیت سے دیکھے پر یہ
اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل کا افسانہ نامیاتی
حیثیت کی تشکیل میں مختلف سطحوں کا
حامل ہوگا۔

جوشی آر بی
دلت ادب
قومی راج، پندرہ روزہ
دسمبر ۷۸ء، جنوری ۷۹ء
جلد ۵ و ۶، شمارہ ۲۴ و ۱ علی الترتیب
ص ۹ تا ۱۰
دلت ادب مراٹھی میں بنیادی طور پر ایک
انقلابی اور احتجاجی ادب ہے ہندو سماج
کے روایتی معاشرت کے خلاف احتجاج
کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ ادب منفی
اقدار کا حامل نظرآتا ہے دراصل نقطہ نظر
کے لحاظ سے یہ ادب مثبت پہلو کو اجاگر
کرتا ہے اس ادب کا نصب العین ایسے
نظام کا قیام ہے جو انصاف، آزادی،
اخوت اور مساوات پرمبنی ہو

گیان چند جین
آغاز زبان کے نظریے
ششماہی نوائے ادب، بمبئی جلد ۲۸، شمارہ ۲
اکتوبر ۷۸ء، ص ۱ تا ۲۴
ڈاکٹر جین اپنے اس مضمون میں زبان کے
آغازکے بارے میں مختلف نظریات کا جائزہ
لیا ہے اور آخر میں (۱) ہسنزل سویٹ
(۲) ریویز (۳) تاراپور والا (۴) استرے
وانٹ اور (۵) سنی تی کمار چٹرجی کے
نظریوں کو فکر انگریز بتایا ہے۔

مرزا سید المظفر چغتائی
اقبال کی معنویت آج
معارف، اعظم گڑھ
جون ۷۹ء، ص ۴۵۱ تا ۴۶۱
اقبال کا کلام عالم انسانیت کے لئے ابدی
پیام کا حامل ہے ہمیں اس حدیث کو
سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔

ابوالنصر محمد خالدی ڈاکٹر
قصیدہ "بردہ"
برہان، دہلی، مارچ ۷۹ء
ص ۱۴۲ تا ۱۵۶
کعب بن زہیر کے لامیہ قصیدہ "بردہ"
کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

محمد نعمان خاں

مکاتیب رشید احمد صدیقی
بنام تخلص بھوپالی
شاعر، بمبئی، مارچ ۷۹ء، ص ۶۰ تا ۶۹
ان خطوط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رشید احمد ایک بلند پایہ انشا پرداز ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب مکالہ نگار بھی تھے۔

رؤف خیر
حسرت۔ آنکھ اور ادراک کے آئینے میں
شاعر، بمبئی، مئی ۷۹ء، ص ۱۲ تا ۱۶ و ۱۶
حسرت موہانی کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تارا چرن رستوگی
"برگ و بار" پر نظر سے خوش گذرے
شاعر، بمبئی، مارچ ۷۹ء ص ۸ تا ۱۰
ڈاکٹر سلام سندیلوی کے مجموعہ کلام "برگ و بار" پر تبصرہ ہے مضمون نگار کا خیال ہے کہ برگ و بار میں مطالعہ فطرت کی ہے اور فلسفیانہ، نفسیاتی، اخلاقی مسائل کا تجزیہ ہے۔

غلام دستگیر رشید
نعتیہ شاعری کی معنوی اہمیت اور ادبی قدر و قیمت
معارف، اعظم گڑھ، مارچ ۷۹ء
ص ۲۰۵ تا ۲۱۱
اس مضمون میں نعتیہ شاعری کی معنوی اہمیت اور ادبی قدر و قیمت کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

غلام دستگیر رشید
نعت گوئی
معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۷۹ء
ص ۲۷۳ تا ۲۸۲
اس مضمون میں مشہور فارسی نعت گو شاعر حکیم سنائی کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سید فضل امام رضوی
رباعیات سلام سندیلوی میں منظر نگاری
شاعر، بمبئی، مارچ ۷۹ء، ص ۱۸ تا ۲۰
رباعیات سلام میں منظر نگاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں اس نوعیت کی رباعیاں نہیں کہی گئی ہیں ان رباعیات میں سلام کے ایک جدید ادبی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس
تین کہانیاں، تین آوازیں،
شاعر۔ بمبئی اپریل ۷۹ء ص ۲۹ تا ۳۰
انور خاں، انور قمر اور سلام بن رزاق کے افسانوں پر مختصر تنقید ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر
غالب اور اردو
شاعر۔ بمبئی، مارچ ۷۹ء ص ۴۲ تا ۴۶
اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب کو بعض وجود سے اردو کے مقابلے میں اپنی فارسی، ادبی کاوشوں پر ناز تھا لیکن اردو نظم و نثر کو بھی وہ اپنا سرمایہ افتخار سمجھتے تھے جس کی بہت سی مثالیں ان کے خطوط اور کلام سے مل جاتی ہیں

رفعت سروش
مشاعرے، جب اور اب
آجکل، دہلی، مارچ ۷۹ء ص ۱۵ تا ۱۸

اس مضمون میں قدیم وجدید مشاعروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے ۔

خورشید سمیع
فن اور تنقید
تحریک ، نئی دہلی ، جلد ۲۷ ، شمارہ ۲
مئی ۷۹ع ، ص ۱۱ تا ۱۳
فن اور تنقید کے سلسلے میں مضمون نگار نے مغربی ناقدین کی آراء بتلائی ہیں جن میں فرانسیسی ناقد بیوا ورلسین ، ایلیٹ ، کروچے اور ٹالسٹائی کے نقطہ نگاہ کو واضح کیا گیا ہے ۔

صابر سنبھلی
ادیب یک نام پروفیسر آل احمد صاحب سرور
فروغ اردو ، لکھنؤ ، جلد ۲۵ ، شمارہ ۹
جنوری ۷۹ع ، ص ۱۲ تا ۳۲
مضمون نگار نے ان کی صحیح تاریخ پیدائش بتلاتے ہوئے ان کی تنقیدوں کی طرف خصوصی توجہ دی ہے ۔

سلام سندیلوی
مولانا حسرت موہانی کی شاعری میں غیر شعوری لازمانیت
شاعر ، بمبئی ، مارچ ۷۹ع ، ص ۳۳ تا ۳۶
یہ بتایا ہے کہ حسرت کی غیر شعوری لازمانیت کو سمجھنے کے لیے ان کی عشقیہ شاعری پر غور کرنے کی ضرورت پر خصوصاً ان کی عاشقانہ شاعری کا تجزیہ ان کے جذباتی انجماد کو سمجھنے میں مدد دے گا ۔

محمد مشتاق شارق
منشی جنگ بہادر جنگ میرٹھی
تحریک ، نئی دہلی ، جلد ۲۶ ، شمارہ ۱۲
مارچ ۷۹ع ، ص ۱۵ تا ۱۸
پیدائش جون ۱۸۵۷ع ، وفات اپریل ۱۹۰۷ع
جنگ میرٹھی نے ناسخ کی روش میں غزلیں کہیں بعد میں انہوں نے طرز لکھنؤ چھوڑ کر طرز دہلی کو اپنایا ۔ اور بناوٹ کی بجائے سادگی و سلاست کو اختیار کیا ان کا بہت سا کلام دیمک کی نظر ہو گیا جو کچھ بچا اسے ان کے صاحبزادگان للتاپرشاد شاد اور تریبنی پرشاد ماتھر رنگ میرٹھی نے مرتب کر کے یکم اکتوبر ۱۹۵۳ع میں « معرکۂ جنگ » کے نام سے شائع کیا جو اب نایاب ہے ۔

ڈاکٹر عابد پشاوری
نسخۂ خوش خط و بسیار غلط
ششماہی نوائے ادب بمبئی جلد ۲۸ ۔ شمارہ ۲
اکتوبر ۱۹۷۸ع ص ۲۵ تا ۶۵
ششماہی نوائے ادب ، بمبئی ، جلد ۲۹ شمارہ ۱
اپریل ۱۹۷۸ع
ڈاکٹر عابد پشاوری نے ڈاکٹر عبدالحق کے مرتبہ دیوان انتخاب حاتم دیوان قدیم کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ۔ اور بڑی جانفشانی اور محنت سے اس مقالے کو تیار کیا ہے ۔

ڈاکٹر عبدالودود
کھڑی بولی تحریک (ہندی) کا آغاز
فروغ اردو لکھنؤ جلد ۲۶ ۔ شمارہ ۱

مئی ۱۹۷۹ء ص ۲۰ تا ۲۳
کھڑی بولی (ھندی) میں نثر نگاری کا آغاز تو فورٹ ولیم میں ہوچکا تھا لیکن شاعری کا آغاز بھارتند ہریشچندر کے عہد میں ہوا۔ اس زمانے میں برج کی بڑی اہمیت تھی بھارتند نے کھڑی بولی میں تجربے کئے تھے لیکن انکی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔

ابوذر عثمانی

جدید شاعری میں اظہار و بیان کا پہلو، چند خیالات

تحریک نئی دہلی، جلد ۲۷، شمارہ ۳ و ۴ جون و جولائی ۷۹ء، ص ۲۳ تا ۲۶
جدید شاعری کا بنیادی رجحان علامت نگاری کی طرف ہے جدید شاعر الفاظ و اشیا کے درمیان کسی تمیز کا قائل نہیں وہ حقیقت کو موجود فی الخارج تصور کرنے کی بجائے اس کے باطنی ادراک کوہی اصل حقیقت مانتا ہے۔ اس قسم کی شاعری میں ابہام کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ جدید شاعری میں کچھ عرصے تک سے ہیئتی کا میلان بھی غالب رہا مگر اب بالعموم آزاد نظم ہی کو جدید شاعری کے فارم کے طور پر اختیار کرلیا گیا ہے۔ طویل و مختصر نظموں کو بھی اپنایا گیا ہے۔ دیومالائی اور مذہبی قصص کو فنی اظہار کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنے اور ان میں فنی معنویت پیدا کرنے کا رجحان بھی نمایاں ہے۔ کلاسیکل شعرا کے لہجے اور اسالیب کی بازآفرینی بھی کی گئی ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو شاعری کو اظہار خیال کے پیرائے میں وسعت اور کشادگی ملی ہے۔

اسلام عشرت

غالب کی نثر نگاری

شاعر، بمبئی، مارچ ۷۹ء، ص ۵۱ تا ۵۵
غالب کی نثری ادب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی نثر آفتاب تارہ کے مانند ہے جس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑسکتی

عقیل احمد

مشرقی تنقید کی روایت

شاعر، بمبئی، جنوری و فروری ۷۹ء ص ۳۸ تا ۴۰ و ۵۸
یہ بتایا ہے کہ مشرقی تنقید میں بنیادی اہمیت ہیئت کو دی جاتی تھی، شاعر یا فنکار کے شخصی تجربات کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں تھی۔

تنویر احمد علوی

بارہ ماسہ وحشت

ششماہی نوائے ادب، بمبئی، جلد ۲۹، شمارہ ۱، اپریل ۷۹ء، ص ۵۳ تا ۸۴
یہ بارہ ماسہ اردو کا دوسرا قدیم تر بارہ ماسہ ہے اس کا فکری منصوبہ نہ صرف یہ کہ افضل سے مختلف ہے بلکہ عام بارہ ماسوں سے بھی اس کا انداز بہت کچھ الگ ہے۔ بارہ ماسہ ہونے ہوئے بھی ساقی نامہ معلوم ہوتا ہے۔

محمد ثناء اللہ عمری
شیخ عبدالقادر بحیثیت انشاپرداز
آج کل، دہلی، فروری ۷۹ع، ص ۴۱ تا ۴۳
بیسویں صدی کے آغاز میں شیخ عبدالقادر ہندوستان کی ایک جامع حیثیات شخصیت تھے۔ ان کا شمار اردو ادب کے محسنوں میں شمار ہوتا ہے۔

عتیق صدیقی
اقبال کا ترانہ ہندی اوراس کی شان نزول
آج کل، دہلی، فروری ۷۹ع ص ۱۷ تا ۱۸،۲۵
مضمون نگار نے اقبال کی مجلس کے ایک حاضر ناشر محمد عمر انور الہی مصنف تالک ساگر، کے حوالے سے سعید ظفر ہاشمی کی زبانی بیانی کی ہے شان نزول تفصیل طلب پر اس نے ملاحظہ ہو مضمون نگار کی تحریر

ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
مثنوی مجنوں لیلیٰ اور نل و من پر ایک طائرانہ نظم
معارف، اعظم گڑھ، فروری ۷۹ ع
ص ۱۳۷ تا ۱۴۶
خسرو کی مثنوی مجنوں لیلیٰ و فیضی کی مثنوی مل و کن کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے خسرو و فیضی کے شاعرانہ کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

سعادت علی صدیقی
شرر بحیثیت ناول نگار
ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ، جلد ۲۵ ـ شمارہ۹
جنوری ۷۹ع ص ۹ ـ ۱۱

عبدالحکیم شرر کوتاریخ اسلام سے خصوصی دلچسپی تھی اسکاٹ کے ناولوں سے متاثر ہوکر انہوں نے اسلامی تاریخ کو ناول میں بیان کر کے اسلاف کی عظمت و بہادری کے ذکر سے جوش و ولولہ پیدا کرنا چاہا۔ فردوس بریں ان کے تمام ناولوں میں بہتر ہے۔

شرر کے کردار مردہ اور کردار نگاری سے جان ہے۔ ان کے نام تو عربی ہوتے ہیں مزاج ہندوستانی فطرت نگاری بھی شرر کے بس کی بات نہیں اسلوب میں کوئی ادبی دلکشی نہیں ان خامیوں کے باوجود ایک خاص حسن ترتیب پائی جاتی ہے جو انہیں معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔

ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی
حیات محمد علی جوہر ایک نظر میں
ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ، جلد ۲۵ ـ شمارہ۹
جنوری ۷۹ع ص ۲۳ ـ ۲۶
محمد علی جوہر کی زندگی کا تقویمی خاکہ دیا ہے جوان کی حیات سے موت پر محیط ہے۔

ڈاکٹر ندیم صدیقی
طویل نظموں کا تحلیقی مزاج
شاعر، بمبئی، جنوری و فروری ۷۹ع ص ۲۹ تا ۳۱
اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ نظم طویل انسانی زندگی اور اس کی صالح قدروں کا عصری تقاضوں سے رشتہ ہموار کرنے نیز فلاحی قدروں کی تخلیق نو کی سنجیدہ اور متن فکری و شعوری شعری کاوش ہے۔

ڈاکٹر زہرہ عرشی

ایلخانی عہد کا تاریخی ادب

برہان، دہلی، فروری ۷۹ع ص ۱۲۰ تا ۱۲۷

ایلخانی عہد میں تاریخ وصاف تاریخ گزیدہ، طبقات ناصری اور تاریخ جہاں جیسی مستند تاریخیں لکھی گئیں ان سب کا ذکر کیا گیا ہے۔

اطہر علی فاروقی

«اردو شاعری میں منظر نگاری»

پر ایک نظر

شاعر، بمبئی، مارچ ۷۹ع، ص ۲۱ تا ۲۶

سلام کی تحقیقی تصنیف پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور علمی و ادبی حیثیت سے اس کی اہمیت بیان کی ہے۔

محمد عظیم فیروز آبادی

نازک الہ آبادی

صبح امید، بمبئی، جلد ۴۴، شمارہ ۴ و ۵

اپریل و مئی ۷۹ع، ص ۱۶ تا ۱۸

نازک الہ آبادی کا اصلی نام گنگا پرشاد ہے کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سب انسپکٹر پولس کی حیثیت سے ان کا تقرر ناگپور میں ہوا۔ نازک صاحب فطرتاً شاعر ہیں انہوں نے مختلف اصناف سخن - غزل، نظم، تضمین قطعات، رباعیات اور مثنویات پر طبع آزمائی کی ہے۔

کرامت علی کرامت

سلام سندیلوی اور اردو شاعری میں

نرگسیت

شاعر، بمبئی، مارچ ۷۹ع، ص ۱۱ تا ۱۶

«اردو شاعری میں نرگسیت» مولفہ سلام سندیلوی پر تبصرہ ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں علوم جدیدہ کی روشنی میں اردو کی کلاسیکی اور جدید شاعری کو سمجھنے کی ایک منفرد کوشش ہے۔

پروفیسر کلکرنی - وی - ڈی

آزادی کے بعد مراٹھی ادب

قومی راج پندرہ روزہ

دسمبر ۷۸ع، جنوری ۷۹ع

جلد ۵ و ۶، شمارہ ۲۴ و ۱

علی الترتیب، ص ۵ تا ۸

آزادی کے بعد مراٹھی ادب کا ایک واضح جائزہ لینے کی یہ ایک حقیر کوشش ہے۔ مضمون نگار کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ کس طرح مراٹھی ادب چند قدیم اور جدید رجحانات کے ساتھ فروغ پا رہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے شاعری، تنقید، مختصر کہانی، ناول اور ناٹک میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا سرسری نقشہ کھینچا ہے۔

محمد علی

علامت پسندی کا ماضی حال اور مستقبل

شاعر، بمبئی، جلد ۵۰، شمارہ ۱-۲ ۷۹ع

ص ۵۵ تا ۵۸

علامت پسندی کا باقاعدہ آغاز جین مورس سے ہوا ابتداء میں علامت صرف شعر و ادب اور موسیقی کی اصلاح تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ فلسفہ، مذہب، علم الانسان علم معنی، علم النفس [illegible] اور [illegible] میں [illegible] شعور کی [illegible]

علامت نگاری زبان و ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کراتی ہے ۔ آج اس کی افادیت یکسر انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ وزیر آغا، شمس الرحمن فاروقی، احمد عظیم آبادی بلراج کومل، راج نرائن راز، علیم اللہ حالی کمارپاشی، عادل منصوری، پرکاش فکری بانی، بدر بشیر، شہریار، عمیق حنفی، صادق وہاب دانش، ندا فاضل، ظفر حنفی اختر یوسف حامدی کاشمیری کی ذہانت اور شعوری کوششوں سے علامت نگاری اردو میں استحکام حاصل کرچکی ہے اورمستقبل اس سے بھی زیادہ تابناک ثابت ہوگا۔

محمد علی

علامت پسندی کا ماضی، حال اور مستقبل
شاعر، بمبئی، جنوری و فروری ۷۹ع
ص ۵۵ تا ۵۸

اس مضمون میں علامت نگاری کی تعریف اور اردو کے علامت نگار شعرا کا مختصر ذکر ہے ۔ مضمون نگار کے خیال پر علامت نگاری اردو شعرا کی ذہانت اور شعوری کوششوں سے استحکام حاصل کرچکی ہے امید ہے کہ علامت نگاری کا مستقبل حال سے بھی زیادہ تابناک ہوگا۔

اقبال مسعود

غالب اور جے پور
آجکل، دہلی، فروری ۷۹ع ص ۲۹ تا ۳۰، ۴۲
اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ غالب کے احباب اور تلامذہ کے اثر سے جے پور کی علمی و ادبی فضا کی ابتدائی تشکیل ہوئی اور اہل جے پور نے علم و ادب اور شعرا زبان کے سلسلے میں غالب سے کسب فیض کیا۔

ابومحفوظ الکریم معصومی

غالب اور منشی محمدی خادم بردوانی
برہان، دہلی، مارچ ۷۹ع، ص ۱۷۳ تا ۱۸۹
منشی محمدی خادم بردوانی فارسی زبان کے کہنہ مشق شاعراور بلند پایہ ادیب و نثرنگار تھے ۔ اس مضمون میں غالب سے ان کے تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے ۔

ڈاکٹر نظام الدین گوریکر

ادبیات فارسی میں میر کا درجہ
برہان، دہلی، اپریل ۷۹ع، ص ۲۴۰ تا ۲۵۴
میر خدائے سخن تھے اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے علاوہ میر کے متعلق فارسی میں کن آراء کا اظہار کیا ہے اور کس طرح ان کو سراہا گیا ہے۔

ڈاکٹر نظام الدین گوریکر

اردو گرامر پرتگالی زبان میں
ششماہی نوائے ادب، بمبئی، جلد ۲۹ شمارہ ۱ اپریل ۷۹ع ص ۸۵ تا ۸۸
اردو زبان اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں کس قدر مقبول تھی ساتھ ہی ساتھ مختصر تعارف اردو گرامر کا کیا گیا ہے جو پرتگالی زبان میں لکھی گئی ہے

جمال آرا نظامی

اردو گرامر پرتگالی زبان میں
فروغ اردو، لکھنؤ، جلد ۲۵، شمارہ ۱۰ فروری ۷۹ع، ص ۱۲ ۔ ۱۴
اردو میں جتنی بھی داستانیں لکھی گئی ہیں ان میں قصہ عرب، ختن، چین وغیرہ ممالک

سے تعلق رکھتا ہے یا فرضی شہروں سے
مناسبت رکھتا ہے لیکن تقریباً ان میں ہر جگہ
ہندوستانی تہذیب کا عکس ولادت شادی وبیاہ
کی رسومات ، اعتقادات افراد قصہ کے
حرکات و سکنات اور انکے مکالمات جزئیات
وتفصیلات زبان و بیان سب میں نظر آتا ہے ۔

متفرقات

حیات اقبال
جدید افسانے ۔ ایک نفسیاتی تجزیہ
شاعر ، بمبئی ، اپریل ۷۹ ع ص ۳۵ تا ۳۸
جدید افسانے کے موضوعات اور جدید
لکھنے والوں کا ذکر کیا ہے ۔

طاہر تونسوی
پاکستان کا جدید اردو افسانہ
شاعر ، بمبئی ، اپریل ۷۹ع ، ص ۳۹ تا ۴۰
اس مضمون میں پاکستان میں ۷۸ع کے
اردو افسانے سے متعلق گفتگو کی گئی ہے ۔
مضمون نگار نے اس سال کو افسانہ نگاری
کے لئے بنجر کہا ہے لیکن اس کے باوجود
چند افسانوں کا ذکر کیا ہے ۔

رشید عبدالسمیع جلیل
اظہر افسر سے ایک ملاقات
شاعر ، بمبئی ، جنوری و فروری ۷۹ع
ص ۱۹ تا ۲۳
اس مضمون میں اظہر افسر کی شخصیت ،
حیات اور ڈرامے کے فن سے متعلق
معلومات حاصل ہوئی ہیں ۔

سردار [illegible]
اردو کا نیا املا
شاعر ، بمبئی ، مئی ۷۹ع ، ص ۳۱ تا ۳۲ و ۳۵
اردو کا نیا املا پر بحث کرتے ہوئے ان
کوششوں کو سراہا گیا ہے اور سفارش کی
گئی ہے کہ اسے جلد از جلد اپنایا جائے ۔

شوکت علی خاں
صولت پبلک لائبریری رام پور کا
ماضی حال و مستقبل
تحریک ، نئی دہلی ، جلد ۲۶ ، شمارہ ۱۱
فروری ۷۹ع ، ص ۹ تا ۱۷
اس لائبریری کی ابتداء تقریباً سات ہزار
کتابوں سے ہوئی ۔ ۴۱ع تک نو ہزار تک
جاپہنچی ۔ آج اس لائبریری میں سرسری
اندازے کے مطابق ہر علم و فن پر اردو ،
فارسی ، انگریزی اور ہندی زبانوں میں
تقریباً تیس ہزار کتابیں اکثر ضروری کتابیں
یہاں دستیاب ہیں ۔ بڑا حصہ مطبوعہ
کتابوں کا ہے ۔

ہری کرشن دیوسرے
بچوں کا عالمی ادب
آج کل ، دہلی ، جنوری ۷۹ع ، ص ۲۶ تا ۲۸
اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ بچوں
سے متعلق دنیا کے دوسرے ادب میں
کس قدر لکھا گیا ہے ۔ مضمون نگار کا خیال
ہے کہ بچوں کے عالمی ادب کو سب سے
زیادہ ہندوستانی کہانیوں نے متاثر کیا ہے ۔

اندو پرکاش سنگھ
روز مرہ کی زندگی اور گیتا
آج کل ، دہلی ، فروری ۷۹ع ، ص ۸ تا ۱۴
گیتا کی تعلیم کا روز مرہ کی زندگی پر
کیا اثر ہوسکتا ہے اور انسان اس پر

عمل کرکے خود کو کس طرح مستفید
کرسکتا ہے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی مولانا
عمرخیام اور خاقانی کا رشتہ
تحریک، نئی دہلی، جلد ۲۷، شمارہ ۱
اپریل ۷۹ء، ص ۷ تا ۱۰
فاضل مقالہ نگار نے "تحفۃ العراقین"
مطبوعہ ۱۸۵۵ء کے ایڈیشن سے پھیلنے
والی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی سعی کی
ہے اور بتلایا ہے کہ عمرخیام اور خاقانی
کے درمیان چچا بھتیجہ کا رشتہ نہیں تھا
جیسا کہ کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری
میری طالب علمی
قاعدہ بغداد سے صحیح بخار تک
البلاغ، بمبئی، فروری ۷۹ء، ص ۲۷ تا ۳۵
مارچ ۷۹ء، ص ۲۳ تا ۳۱
اپریل ۷۹ء، ص ۳۳ تا ۴۲
مئی ۷۹ء، ص ۳۳ تا ۴۰
مضمون نگار نے ان تصانیف اور مصنفین کا
ذکر کیا ہے جن سے وہ اپنے بچپن میں
متاثر ہوئے مطبوعات کی خریداری اور
مطبوعات کی فراہمی مضمون نگاری اور
تصنیف و تالیف کا ذکر ہے۔

ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر
اردو تحقیق کی رفتار جامعہ بمبئی میں
ششماہی نوائے ادب، بمبئی جلد ۲۸، شمارہ ۲
اکتوبر ۷۸ء، ص ۶۶ تا ۷۰
صاحب موصوف نے اپنے اس مضمون میں
جامعہ بمبئی میں اردو کی تعلیم اور تحقیق کے
سلسلے میں پوری معلومات بہم پہنچائی ہے۔

سید سلمان ندوی
قوت عاملہ یا قوت آمرہ
معارف، اعظم گڑھ، فروری ۷۹ء
ص ۸۵ تا ۹۲
اس مضمون میں اس بات کی نشاندہی کی
گئی ہے کہ کسی جماعت کو منظم بناتے
اور اس کی حفاظت کے کسی قانون کو
چلانے اور پھیلانے کے لئے ایک قوت
عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت
انسانی کا تقاضا ہے۔

شکیب ایازی
علم الرمل
آجکل، دہلی، مئی ۷۹ء ص ۴۴ تا ۴۶
علم رمل، جیوتش اور دست شناسی سے
سے ہیئت کے لحاظ سے نہیں بلکہ قدامت
کے لحاظ سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتا
ہے اور ان دیگر علوم پر فوقیت رکھتا ہے۔

شفیع الدین نیر
اردو میں بچوں کا ادب
آجکل، دہلی جنوری ۷۹ء ص ۲۹ تا ۳۲
اردو میں بچوں کے ادب کا مجمل جائزہ لیا ہے۔

Edited by Dr. Niaamuddin S. Gorekar
Director, Anjuman - i - Islam Urdu Research Institute, Bombay 400 001
Published by Shri Abdul Majeed Patka
General Secretary Anjman - i - Islam, Bombay 400 001 &
Printed by him from Adabi Printing Press
Saboo Siddik Polytechnic, 8, Shepherd Road, Bombay 400 008

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

مطبوعات و تالیفات

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

- لغات گجری (مرتبہ)
- رقعات عالمگیر (مرتبہ)
- مقدمۂ رقعات عالمگیر (مولفہ)
- تاریخ ادب عربی (ترجمہ)
- برطانوی ہند کا نظام سیاسی (ترجمہ)
- سوراج (ترجمہ)
- رہنمائے صحت (ترجمہ)
- ترک موالات دوسرے ممالک میں (ترجمہ)

ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی

- ولی گجراتی (مولفہ)
- نورالمعرفت (مرتبہ)
- غزل ولی تک (مولفہ)
- اردو ابسیر (مرتبہ)

پروفیسر نظام الدین گوریکر

- اردو مراٹھی شبد کوش (مرتبہ)
- نوائے وقت (مولفہ)
- گلمپسیز آف اردو لٹریچر (مولفہ)
- طوطیان ہند (مرتبہ)
- انڈو ایران ریلیشنز: کلچرل اسپیکٹس (مولفہ)

عبدالرزاق قریشی

- نوائے آزادی (مرتبہ)
- مرزا مظہر جان جاناں (مولفہ)
- مکاتیب مرزا مظہر (مرتبہ)
- مبادیات تحقیق (مولفہ)
- راگ مالا (مولفہ)

مخطوطات جامع مسجد بمبئی (مرتبہ) ڈاکٹر حامداللہ ندوی

مقالہ نما (مرتبہ) رقیہ انعامدار

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

نوائے ادب ، بمبئی

Registration No. 32009/50

رجسٹریشن نمبر ۵۰-۳۲۰۰۹

مقام اشاعت : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نوعیت اشاعت : ششماہی

نام پرنٹر : جناب عبدالمجید پالکا ، بی، کام (آنرز)

قومیت : ہندوستانی

پتــہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پبلشر
قومیت } ایضاً
پتــہ

نام ایڈیٹر : ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر
ایم اے، پی ایچ ڈی ، ڈی لٹ

قومیت : ہندوستانی

پتــہ : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

نام پتہ مالک رسالہ : ایضاً

میں عبدالمجید پالکا تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

عبدالمجید پالکا

● ● ●

All remittances & correspondence be made to
Dr. N. S. Gorekar, M. A., Ph. D., D. Litt
Director
Anjuman - i - Islam Urdu Research Institute
92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001

●

Annual Subscription

Inland : Rs. 10.00 ● Foreign : Shillings 20

NAWA-E-ADAB

BIANNUAL

ANJUMAN-I-ISLAM
URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Dadabhoy Nawroji Road, Bombay 400 001